

۱۹۷۰ء کے منتخب افسانے

مرتب
ناصر زیدی

ناشر: مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۲

حق اشاعت دائمی بحق مکتبہ مسیحیہ لائبریری محفوظ

ناشر: بشیر احمد چودھری ڈائریکٹر مکتبہ مسیحیہ لائبریری لاہور

طابع: پاکستان ٹائٹلز پریس لاہور

بار اول: ۱۹۷۲ء

ترتیب

۷	ناصر دہی	سید حسبات	-
۹	عصمت چغتائی	اللہ کا فضل	- ۱
۲۲	احمد ندیم قاسمی	لاریس آف تنلیبیا	- ۲
۱۴۲	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	منہکار	- ۳
۵۵	انتظار حسین	وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے	- ۴
۳۹	جیلانی بانو	بہار کا آخری گلاب	- ۵
۱۵۸	نصیر احمد	سواد	- ۶
۱۶۸	مسعود مفتی	واپسی	- ۷
۶۵	الطاف فاطمہ	نیون سائنسز	- ۸
۱۹۱	حکیم غریب	حکمتی	- ۹
۷۷	مسعود اشعر	آنکھوں پر دھندل ہاتھ	- ۱۰
۲۲۴	رفیعہ فصیح احمد	بڑیاں	- ۱۱

۹۲	خدیجہ پنجم	دریپ	- ۱۲
۲۴۲	پروین سرور	سراب	- ۱۳
۲۹۲	سی۔ ایل۔ کادش	اُس بازار سے	- ۱۴
۲۶۶	لطیف کاشمیری	رسل جُ	- ۱۵
۱۱۵	نگہت مرزا	ما تم یک شہر آند	- ۱۶
۱۳۱	مشرف احمد	رشتہ	- ۱۷
۲۷۷	نگہت لغاری	مس عاصمہ حبیب	- ۱۸

سیدھی بات!

لیجئے ۱۹۵۷ء کے منتخب افسانوں کے ساتھ پھر حاضر ہوں۔ سال پچاس افسانوں کے انتخاب کی روایت کسی بہت بڑی ادبی افادیت کی حامل ہو یا نہ ہو، میرے لئے ایک گونا گویا نکتہ بحث ضرور ہے۔

جب میں ادب کے خوش ذوق قارئین کے لئے اردو کی نثری ستھری اور نثری ہوتی کہانیاں چنتا ہوں تو میری باطنی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے میں کھائی بہت اہم خدمت انجام دی ہے۔

جی ہاں! انسانے کا انتخاب میرے نزدیک بڑی اہم خدمت ہے۔ میں نے قاری کی رہنمائی کی اور اپنی جگہ مطمئن ہو گیا ہوں۔ اب اگر وسائل کی دشواریوں کی بنا پر میں نے اپنے اس انتخاب کا حلقہ محدود رکھا ہے تو قصور میرا نہیں ہے۔ اگر آپ کو میرے ذوقی انتخاب پر اعتراض ہے تو یہ ایک طرف الزام ہے اور ظاہر ہے کہ ہر قاری

کو یہ الزام عائد کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ میں اُن سے یہ حق چھیننے والا کون ؟ رہا
 انسانے کے ارتقائی مراحل اور اس کی مابین خامیوں کا مسئلہ تو اس کا ذمہ دار
 انسانہ نگار ہے۔ تاہم ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قیام پاکستان کے
 بعد اس ربع صدی سے کچھ کم عرصہ میں اردو کے انسانی ادب نے جتنا سفر طے
 کیا ہے وہ کوئی نصف صدی کا قسط ہے۔ اس دور میں ہم نے نئے لکھنے والوں کی
 ایک فوجی ظفر صبح کو قلم ہاتھ میں لئے انسانے کے مورچے پر نیر و آواز مارا ہے اور
 یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر لکھنے والے نے حسب استطاعت بڑا تیر مارا ہے، لیکن میں
 نے انسانی 'غیر جانبداری' سے آپ کے سامنے یہ مجموعہ پیش کیا ہے اور نئے پراؤں کی
 جاندار تخلیقات کو حتی الوسع نظر انداز نہیں کیا۔ عدل کی میزان آپ کے ہاتھ میں ہے
 نامشک کے اور میرے حق میں کلمہ خیر کہئے یا میری بے ذوقی کا اور ناروئے ع
 بہر پہلو سوسو تسلیم تم ہے

ناصر زیدی

دیر ماہنامہ ادب لطیف۔

۱۵- سرکلر روڈ - لاہور

صفحہ ۵۲۰۹

اللہ کا فضل

”میں خدا کا واسطہ بتائیے کیا کروں؟“ سکینہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔
”بھئی میری تو یہی رائے ہے کہ فرحت کو طلاق دلوادیں۔“

”ہے ہے طلاق؟“ وہ لرز اٹھیں؛ آج تک خاندان میں طلاق نہیں ہوئی۔
پھر دوسری بیٹی رضیہ چغتائی پریشانی ہوئی ہے۔ تاک کٹ جائے گی۔ پھر اسے کون
پرچھے گا۔ ایسی پیاری بیٹیاں ہیں، لیکن برہنیں مچھڑتے۔ ”بر کے معنی صرف ننگ
قبول صورت فوجوان ہی نہیں؛ بر کے لئے لازمی ہے کہ وہ بھاری تنخواہ پانا
ہو اور اچھے کھاتے پیتے خاندان کا ہو۔ کچھ آگے پیچھے کام آئے۔ دیکھ مرو
ذات کی کمی نہیں۔“ بڑی بیٹی کے لئے کنوئیں میں بانس ڈالنے تب کہیں چاک
لڑکا مچرا۔ لڑکا ماشاء اللہ سے ساٹھ سینٹ کا ہے، ایک بیوی اور چار
لڑکیاں ہیں پریشا نہیں۔ بیٹے کے لئے فرحت سے شادی کی تھی سو اس
کے نصیب پر ہنسنے لگے۔ چھ سال چل رہا ہے۔ بیٹا چھوڑ بیٹی ہی نصیبوں جلی ہو جاتی۔

پہل تو لگنا، لیکن وہاں بھولے کو دن بھی نہ چڑھے۔ کتے تعویذ گنڈے کئے، اجیری خواجہ نے بھی سیکند کھیا کی نہ سنی۔

”اے بھتی تعویذ گنڈوں کے پھیر میں نہ پڑیے۔ اچھے ڈاکٹر کو دکھائیے۔“
 ”ڈاکٹر سے ڈاکٹر دکھائے۔ سب موتے ہی کتنے ہیں لڑکی میں عیب نہیں۔
 بس بہن اللہ کا فضل ہے۔ ہوا ہوا نہ ہوا تو اس میں کسی کا کیا دخل؟“
 شاید امداد مہاں ہی میں کچھ عیب ہو گیا ہو۔

”نہیں بہن مردقات میں کہاں عیب ہوتا ہے۔ لوگ اکسار ہے ہیں کہ تیسری شادی کر دے۔ انہیں کیا کمی ہے لڑکیوں کی۔۔۔ اچھے اچھے لوگ بیٹیاں تھال میں سجا کے دینے کو تیار ہیں۔“

فرحت بھے ایک دن سینا میں ملی تھی۔ اچھی چکنی چٹری رس ملائی رکھی ہوئی ہے۔ گودا چٹارنگ، بہنتی ہوئی صورت، بھرا بھرا جسم، اماں کو بائیں کا گھر گھڑنے کا غم کھائے جاتا ہے۔ لیکن خود فرحت کے دل پر کچھ اثر نہیں، مشکل سے بائیں تئیس کا سن ہو گا۔ ابھی تھوڑے ہی دن سے ان لوگوں سے میل جول بڑھ گیا تھا، بس روڈ پران کہ چار کمروں کا فلیٹ ہے۔ بڑی آن بان سے سجا ہوا۔ پہلی جوی کھار میں اپنے اماں باوا کے ساتھ رہتی ہیں۔ یہ فلیٹ خاص طور پر فرحت کے لئے لیا ہے لیکن اس کے نام نہیں کرتے۔

”غارت کیجئے امداد مہاں کو۔۔۔ فرحت کو ہزاروں لڑکے مل جائیں گے۔“
 بچے اندر کا خیال آیا، ان دنوں بھرے ساتھ ہی رہتا تھا۔۔۔ ”سامے پارچ سو لٹے ہیں۔ ترقی ہو جائے گی۔“ اس دن سینا میں فرحت کی نظرس بار بار انور پر پڑھتی

رہی تھیں۔ سکینے بہن بھی بڑی مہربان نظر آرہی تھیں۔ میں نے ان سے ذکر کیا تو کھل گئیں۔

”اے ہے ایسا ہو جائے تو کیا کہنے ہیں! ماشاء اللہ کیا چاند سورج کی جوڑی رہے گی۔“

”آپ طلاق دلا دیجئے بس آگے میرا ذمہ“ میں نے وعدہ کیا۔
مگر انور بدک گیا۔

”بھئی میں اس پکڑ میں نہ پڑوں گا!“
”کیوں بے وقوف اتنی اچھی لڑکی ہے!“
”لڑکی کہاں؟ کسی کی بیوی ہے!“
”طلاق کے بعد....“

”مگر بڑھیا بڑی کاٹیاں ہے۔“

”ارے بے چاری بہت سیدھی ہیں۔“

”بڑی چلتی پرزہ ہے۔ مجھے تو اس میں سے بارود کی بُڑا آتی ہے!“
مگر انور بے چارے کی ایک نہ چلی۔ اُدھر سے سکینے بہن اُدھر سے میں نے دے بانکا والا کہ بد تو اس کر دیا۔ گھیر گھیر کے ہم دونوں انھیں ایک دوسرے سے ٹکراتے۔
بڑی بڑی ٹکڑیاں چل کے انھیں اکیلا چھوڑ کے مرک جاتے۔ سکینے بیگم آنکھوں میں آنسو بھرتیں اور شکریہ ادا کرتیں۔

یا تو انور میٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیتا تھا۔ یا اب یہ حالت ہو گئی جیسے جوت سوار ہو گیا ہو۔ سر پر کا ہوش نہ رہا۔ سرفرحت نے شادی کی تھی محبت نہیں کی تھی۔

انور کی محبت نے اسے ایک نئی زندگی بخش دی۔ انور کو سکینہ کی صحبت سے نفرت تھی۔ مگر پھر تو وہ ان کا بھی گمراہ ہو گیا۔ وہ بھی اس پر صدقے داری جاتی۔ اس کے بغیر ان کے حلق سے نوالہ نہ اُترتا۔ میری اہمیت بالکل ختم ہو گئی۔ شادی سے پہلے ہی انور سسرال کا ہو رہا۔ رات کے دو دو بجے تک وہیں گھسا رہتا یا فرحت آجاتی اور دونوں کمرے میں بند ٹھنڈول کیا کرتے۔ میں اپنے کام کے سلسلے میں کچھ دن کے لئے پونا چلی گئی۔ وہاں سے کوئی تو معلوم ہوا — میرے پیچھے فرحت مستقل طور پر گھر میں رہی کبھی کبھار اپنے گھر چلی جاتی۔ اب تو شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ دونوں کی محبت عروج کی پہنچ چکی ہے۔

”آپ کچھ کہہ رہی ہیں؟“ میں نے سکینہ سے پوچھا — پہلے تو ثالثی رہیں پھر رولیں۔

”ہاں! احمد آباد کے ایک سوامی جی نے ایک بوٹی دی ہے۔“
 ”ارے ہٹاؤ سوامی جی کو — یہ لوگ پاکھنڈی ہوتے ہیں۔ طلاق کے بارے میں کیا کر رہی ہیں۔؟“

”اس شخص طلاق کے نام سے مجھے ہول آتا ہے؟“

”لیکن آخر ہو گا کیا؟“

”اللہ اپنا فضل کرے گا۔“

آدھہ — اللہ خاک اپنا فضل نہ کرے گا — سر پکڑے روئیں گی آپ!

ایک جوان لڑکا اور لڑکی کا یوں دن رات بلنا....

”کیوں؟ کیا ہوا؟ کیا تم سے فرحت نے کچھ کہا؟ وہ چونک پڑیں۔“

”نہیں فرحت نے کچھ نہیں کہا، مگر میرے کیا آنکلیں نہیں ہیں؟ میں بہت دینک انہیں اُتر چنچ سجاتی رہی۔ وہ بہت ڈکھی مر جھکائے نہ جانے کیا سوچتی رہیں۔“

”سوامی جی نے سات پڑیاں دی ہیں۔ ہر منگل وار کو ایک پڑیا پان یا گرم دودھ کے ساتھ۔“

”فرحت کو دی ہیں؟“

”نہیں ادا میاں کو؟“

”ادا میاں کو —؟“ میں جل کے رہ گئی۔ ”سات پڑیاں کیا۔ انہیں سات

ایٹیم بم بھی نکلا دیتے جائیں تو کچھ نہ ہوگا، کیا ادا میاں آتے ہیں؟“
 ”ہاں ہر منگل وار کو آتے ہیں۔ نہادھو کر دو رکعت شکرانہ پڑھ کے گرم دودھ کے ساتھ اور....“

”اد بھی؟ یعنی حد ہو گئی — یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟“

”اے بہن تو وہ اس کا شوہر۔۔۔“

”مگر.... انور ادا ادا میاں.... یعنی.... یہ کیا ہو رہا ہے؟ میری

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بتاؤں۔ کیا یہ کم بخت اندھی ہے؟ مگر میری بہت نہ پڑی۔“

”اگلے منگل وار کو جو تھی پڑیا ہو جائے گی۔“ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

”سوامی جی کہتے ہیں اللہ نے پانچویں پڑیا....“

”سکینہ بہن اللہ کے واسطے یہ مذاق اچھا نہیں۔ اب فرحت کی طلاق کے

لئے کچھ کیجئے۔ اور کم بخت ادا دمیایں سے ہر دھوا لیجئے۔ میں نے سوچا، انورا۔
فرحت الگ ٹیلیٹ لے کر زندگی بڑے مزے سے شروع کر سکیں گے۔

”ہر۔۔؟“ سکینہ بن جھونکی رہ گئیں

”کتنا ہے ہر؟“

”خاک بھی نہیں۔ اب آپ سے کیا چھپانا، پچپن ہزار ہر تھا تو دس ہزار
سرفراز میاں نے کے ولایت چلے گئے۔ ایسے سدھارے ہیں کہ پٹنے کا نام ہی
نہیں لیتے۔ وہیں موسم سے شادی کر لی، ایک بچی بھی ہو گئی۔“

سرفراز میاں سکینہ کے بڑے بیٹے کے ایک دوست کی معرفت فرحت کا رشتہ
ہوا تھا۔ عمر زیادہ تھی ادا دمیایں کی۔ مگر بیٹے کے مستقبل کا سوال تھا۔ ”کسی
قابل ہو کر آگئے تو خاندان کی گری ہوئی حالت منجھل جائے گی۔ سو وہ پٹنے
ہی نہیں، اٹنے چھ ہزار اور مٹنے لائے کرائے کے نام سے۔ ادا دمیایں کچھ بیٹے
نکے سب ہر کے حساب میں لکھوا لیا۔“

”مگر یہ تو ہوسے سولہ ہزار۔۔۔ باقی....؟“

”دری پٹلیٹ ہے۔۔۔۔۔ وہ رضیہ کے نام ہے۔ میں نے کس کچھ تو جو

نیک بخت کے لئے۔ آج کل کے لڑکے منہ پھاڑ کے دوڑتے ہیں۔“

مجھے فرحت پر بے طرح ترس آنے لگا۔ بجائی کے مستقبل اور بہن کی شادی
کے لئے اس کی زندگی مٹی میں ملا دی۔ ایسی ماں اور نانیکہ میں کیا فرق ہے؟
اور اسی لئے سکینہ بیگم طلاق سے بوکھلائی جاتی ہیں۔“

”بہن اگر ادا دے اور شادی کر لی تو ہم لوگ کہیں کے نہ رہیں گے۔“

کیسے کیسے میں نے چلتے کیونپے ہیں، دلیخے پڑے ہیں، غیش مانی میں، جیسی تو شادی نہیں کی۔ ورنہ لوگ تو انہیں خوب ہنسا رہے ہیں۔

مجھے وحشت ہونے لگی، کتنی بے وقوف ہے یہ عورت! کچھ سمجھتی ہی نہیں مگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کیا ہو گا؟

”دیکھئے آپ انکار نہ کیجئے، آپ انور اور فرحت کے ساتھ رہیں گی۔ رضیہ کی بغیر فلیٹ کے بھی اچھی جگہ شادی ہو جائے گی۔ آپ طلاق کی فکر کیجئے۔“
انہوں نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔

اور وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ دو چاروں سے انور کچھ بولے، سب سے پھر رہے تھے۔ فرحت بھی کچھ دیر ان سے نظر آ رہی تھی۔ میں نے ہوجھا: ”کیا کچھ جھگڑا ہو گیا تو دونوں گھبرا گئے۔“

رات کو کچھ عجب دھماکا ہو کر ہی سی انور کے کمرے میں بھی ہوئی تھی۔ اندر سے فرحت کے رونے کی آواز آ رہی تھی، میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

”اندر آئیے! وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر لے گیا۔“ اس بے وقوف کو سمجھائیے؟
”کیا ہوا۔۔۔؟“

”آئی۔۔۔؟“ وہ میرے پیروں سے لپٹ گئی۔

”یکھڑکی سے کود کر۔۔۔“ انور ہنسی طرح لرز رہا تھا۔

”پانگل ہوئی ہو؟“ میں نے اس کا آنسوؤں سے ترسیرا اوپر اٹھا دیا: سب

ٹھیک ہو جائے گا۔ یوں رو رو کر دکھان ہونے سے فائدہ ہے طلاق کے بعد۔۔۔؟“

”ہائے آئی ہی! امی طلاق کے نام پر منہ پیٹے لیتی ہیں۔۔۔ کتنی ہیں

نکسایا کمالوں کی؟

”اتنی کم بخت کا تو بھیج پگھل گیا ہے، تم خود بالغ ہو، طلاق لے سکتی ہو۔
اور پھر اب ایسے حالات میں تو۔۔۔ وہ راضی ہو جائیں گی؟“

”نہیں آنٹی جی، وہ۔۔۔ وہ نہیں مانیں گی۔ ہائے میں مرجاؤں؟“

”مر جاؤ گی مگر اپنے حق کے لئے فدا اپنی امتی سے مقابلہ نہیں کر سکتیں۔“

”ان کا مدنا نہیں دیکھا جاتا، کل انھیں جسے زور کا دورہ پڑا۔ دانت بچھ گئے۔ بس اتنی سی بات ہوئی تھی کہ میں نے کہا انھیں منع کرو۔ شکل و شکل کو
خائیں، میں ان کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔“ مجھے گھین آتی ہے۔ ہائے آنٹی
آپ کو کیا بتاؤں؟ تو آدمی نہیں کتا ہے۔ منہ ڈھک کے رہ پھر سکیں لینے گی۔
”تم نے اپنی ماں کو بتایا؟“

”نہیں جب انھیں اصلیت کا پتہ چلے گا۔ وہ مجھے کاٹ کے پھینک دیں گی۔“
”نہیں جب انھیں اصلیت کا پتہ چلے گا تو داغ درست ہو جائے گا۔ اس کے سوا
چارہ ہی کیا ہے؟ میں صبح جا کر ان سے سب کچھ کہہ دوں گی اور ساتھ دن کے فدا
طلاق۔۔۔“

”طلاق تو وہ مر کے بھی نہ لینے دیں گی۔ ویسے ہی ہر وقت کہتی ہیں تو تو خاندان
کا نام اچھا لے گی۔ خیر کیا ہے اور سزا ختم کر، پھر تیسرا کر؟“

میں نے اسے سمجھایا، یقین دلایا، اس کی ڈھارس بندھ گئی اور تھوڑی سی دیر
میں سکوانے لگی۔ روٹی روٹی شکل پر جنس کچھ ایسی پیاری لگ رہی تھی کہ فدا کی
نئی نئی آنکھیں اس کے چہرے پر ٹپک گئیں۔

میں ان دونوں کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ سونے کی کوشش کی مگر نیند آگئی۔ اگر امداد میاں کو پتہ چل گیا تو غضب ہو جائے گا۔ اور مٹری میں ہے۔ کم بخت کا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔ امداد کی پہلی بیوی تو اُدھار کھائے بیٹھی ہیں۔ سکیئنہ بیگم اور فرحت کی دھجیاں اڑا دیں گی۔ ڈرتی ڈرتی میں صبح ان کے پاس پہنچی۔ حسبِ عادت وہ نلکو مندرسی بیٹھ گئیں۔ میں نے بڑی رسائیت سے فرحت کی پتا سائی۔ تمہیں کھا کر بھینس دلا یا کہ اندر دغا خانہ ہے گا۔ وہ تو اس پر جان چھوکتا ہے!۔ میں چورسی گم ٹم رہ گئی۔ سکیئنہ بیگم کے کیلے پر جیسے مٹھیں گن کی باڈو چل گئی۔ پانگوں کی طرح ہنسیں ادا بیچوں کی طرح مدے لگیں، بچہ پتے کی طرح ان کا جسم کانپا اور وہ دبیں ڈھیر ہو گئیں۔ میرے ہاتھ پر پھول گئے۔ رضیہ بالی جلد ہلکی تھی، فرحت اپنے کمرے میں بیٹھی کانپ رہی تھی، انہوں نے کسی کو گوسا نہ پیشا نہ میرے منہ پر تھوکا کہ میرے بھائی نے ان کا نصیب چھوڑ دیا۔

”آپ اسی وقت وکیل کے پاس چلیے اور فرحت کو میں اپنی بہن کے پاس دہلی بھیج دوں گی۔ امداد پر ہر طرح کا رباؤ ڈالا جائے گا۔ آپ نلکو نہ کیجئے۔“ ان کے چہرے پر جوائیاں اُڑ رہی تھیں سر جھکائے بیٹھی رہیں۔

”وکیل؟ انہوں نے احمقوں کی طرح کہا: ہاں۔ مگر اس وقت۔۔۔“

میں پھر آپ کو فونی کدوں کی۔ اشد آپ کو خوش رکھے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لی۔ واپس آکر میں فون کے انتظار میں بدحواس رہی۔ کہیں مددوں ماں بیٹی دسپہ کھا کر دسور رہیں۔ ساری عمر کی تھمت چڑھ جائے گی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ حالات یوں پٹا کھائیں گے۔

انور کا عجیب حال تھا۔ کہتے ہیں مرد سب دفنا ہوتے ہیں عورت کو مصیبت میں پھنسا کر فوج پکڑ جاتے ہیں مگر انور کی تو جان بکلی جا رہی تھی۔ شام تک انتظار کیا مگر فون نہ آیا۔ جھک مار کر میں نے فون کیا تو جواب نہ ملا۔ جب بہت ہی بے چین ہو گیا تو میں نے انور کو بھیجا۔

انور ڈٹا تو صورت دیکھ کے میاؤں مچ گئی۔

”کیا کہا؟“

”گھر میں کوئی نہیں، نالہ پڑا ہے۔ گورکھ سے پوچھا۔ معلوم ہوا سب گئے!“

”کہاں گئے؟“

”کچھ پتہ نہیں!“

سات انگاروں پر گئی۔ انور پاگلوں کی طرح دنیا بھر کو فون کرتا رہا۔ اداکاروں کی سسرال کو فون کیا۔ پتہ چلا کہاں گئے ہیں، کچھ معلوم نہیں۔ شاید دہلی کے فلیٹ میں ہوں گے۔

انور دیوانوں کی طرح در سودا بھاگا۔ میں نے بہت روکا لیکن اس پر تو بصورت سوار تھا۔

دہلی میں ایک ڈاکٹر تھا۔ اس نے کہا، کھار گئے ہوں گے یا چرچ گئی۔ ایک آٹا پیسٹ روڈ پر بھی تھا۔ وہاں بھی نہ ملے۔ تین چار دن گزر گئے تب معلوم ہوا کہیں باہر گئے ہیں۔ آفس کو پتہ ہو گا جنھوں نے تین چار آفس تھے کہیں نہ معلوم ہو گا کہ کہاں مر گئے۔

پچھلے سات برس دن ایک لفاظی ملا۔ میلا کھلا ہوا لکھا تھا۔

”خدا کا واسطہ مجھے بچاؤ۔ اس جہنم سے نکالو۔ میری جان پر ایسا سپرہ ہے کہ سانس لینا مشکل ہے۔ اللہ میری جان پر دم کر دے!“

”فرحت“

خط پڑھ کر تو اور سولی سوار ہو گئی۔ مٹی مٹی صرے پتہ چلا خط نیگم بیٹے سے ملک میں ڈالا گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ حیدر آباد گئی ہوں گی۔

کون بچائے کیسے بچائے! انور دیوانوں کی طرح حیدر آباد بھاگا۔ ادھر ادھر سرکار کے لوٹ آیا، کچھ پتہ نہ چلا۔

کیا دل پر وحشت تھی۔ اب بھی سوچتی ہوں تو پھر ریاں آنے لگتی ہیں۔ انور کو کن مصیبتوں سے منبھالا ہے کہ بس میں ہی جانتی ہوں۔ اس گناہ میں میری مدد بھی شامل تھی۔ میرے دامن پر بھی بے گناہ خون کے دھبے تھے۔ اسی سال انور کا تبادلہ دہلی کی طرف ہو گیا۔ میری جان چھوٹی! اس واقعہ کو کتنے ہی سال بیت گئے۔ انور کو صبر آ گیا۔ چاند سی دھن اور بچوں نے سب کچھ بھلا دیا۔

میں مارک اینڈ اسپنسر سے نکل رہی تھی اور وہ داخل ہو رہی تھیں۔ منکر ہوتے ہوئے بچی! منگھوڑی دیر ہم انھوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

”ہن آپ! وہ سمور کا کوٹ پہنے فمہ سے لیٹ گئیں۔ اللہ کتنے سال چمکے!“

”سکینہ ہن!“ بیل ملتی خشک ہو گیا۔

”سرفراز میاں کے اس شہری ہوئی ہوں۔ انھوں نے تو پٹے کا نام نہیں لیا۔ میں نے کہا چلو میں ہی ناگ نیچی کر کے بل آؤں۔ اس بہانے ولایت کی سیر بھی ہو جائے گی۔ اللہ اللہ کیا ہشت بھریں بنایا ہے ان فرنگیوں نے! وہ اٹلی، فرانس

اور سوشل ریسرچ کے قصبے بیان کرنے لگیں۔

ان کی صورت پر ایک دم اطمینان اور جوانی ٹوٹ پڑی تھی پہلے سے بھاری بھرکم بھی معلوم ہو رہی تھیں۔ کسی اچھے ہیر سیلون سے بال بنوائے تھے۔ وہ حیران پریشان سکیٹ سوکھی ڈال سے ایک دم سلیمان پھن بن گئی تھیں۔
”فرحت کیسی ہے؟ میں نے ذرا تکلف محسوس کیا۔

”اٹھ کے فضل سے بہت خوش و خرم ہیں میاں بیوی۔ نادرمیاں بھی خیر سے اسکول جاتے ہیں۔ ناظم آباد میں کیا حق و ذوق کوٹھی ہے۔ ٹی وی ہے۔ کیرپرائی صورت ہے نادری۔ بتا بنایا باپ ہے؟

”باپ!“ میں الجھن میں پڑ گئی۔
”جی ہاں، وہی چٹا رنگ اور نیلی آنکھیں!“
”اما میاں کی نیلی آنکھیں؟“

”اے ہے، آپ تو ایسی بن رہی ہیں جیسے....“ وہ ڈھٹائی کے کھلنے لگا
اور جلدی جلدی سامان شرابی میں رکھنے لگیں۔
”اور وہ سات پڑیاں؟“ میں نے گریدا۔

”اٹھ قسم آپ کو ایک ایک بات یاد رہتی ہے۔ پہلے چار ہزار روپے تھے سوائے
”پڑیوں کے یا ترکیب کے؟“
”وہ ٹکڑا تو کچھ اول فزل کے تھا؟“

”یعنی اپنی خدمات پیش کر رہا تھا؟“

”جی اور دس ہزار لاکھ رہا تھا، مگر نیک بخت کی صورت دیکھ بھانج پڑے

تھا: وہ بڑبڑائیں۔

”ادامیاں کوشک تو نہیں ہوا؟“

”اے بٹائیے بھی — دنیا جہاں کے مردے سے جو اپنی اولاد پر شک شبہ کرنے لگیں تو.... بس اب جانے بھی دیجئے۔ اتنی غفل اپنی گریہ میں جوتی تو میری معصوم بچی پہ لازم نہ تھوپتے اپنے بوڑھے گریبان میں بھی ایک بار جھانک کر دیکھتے۔ اے مٹی ڈالنے ان باتوں پر دم ٹوٹتا ہے میرا۔“

”انور بے چارہ بہت تڑپا، آپ لوگوں نے صورت بھی نہ دکھائی بیٹے کی۔ میں نے مچکی لی۔“

”بس جانے دیجئے! یہ جو گلی گلی بچے پکاتے پھرتے ہیں تب کیجھ نہیں چھٹتا۔“

”بیتا رہے اشد اسے درجنوں بچے دے۔“ وہ انور کو دعا میں دینے لگیں۔

میں نے ان کے بیش قیمت سمور کو دیکھا اور چائنا سلک کے اسکارف کو۔

پھر قنصل میں ناظم آباد میں پھیلی ہوئی حق و دوق کو خلی کا رقبہ ناپا۔ شمسے میں سے چھلکے نوٹ، ہرے ہرے پونڈوں کی گڈی دیکھی اور بچے بے طرح کوفت ہونے لگی۔

میں کیوں جو رہی بیٹھی تھی فرحت کی گود بھرنے میں میری ہمدردیاں بھی تو شامل تھیں۔ ادا انور کتنا بد صورت تھا۔ برسوں منیر کی ملامتیں سننا رہا۔ جسے وہ اپنی نادانی میں گناہ عظیم سمجھے بیٹھا تھا وہ تو زمین ثواب تھا۔

”میسریں صدی دہلی“

لارنس آف تھلیبیا

پنگ اتنا چوڑا تھا کہ اس پر جو کہیں بچھا تھا وہ چار کھیسوں کے برابر تھا۔ اس کے وسط میں نیش کے ایک گاؤں کیلئے کے سہارے بڑے ملک صاحب کے جسم کا ڈھیر بڑا تھا۔ ان کی انگلیوں، انگوٹھوں، پنڈلیوں، رانوں، گڑبیدہ کندھوں اور سر کو بہت سے میراثی، مائی، جیور، دھوبی، موچی، گھبراہ اور کسان و بارہے تھے۔ میں ذرا دور بیٹھا تھا اس لئے وہاں سے مجھے یہ منظر یوں دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے ایک بڑے سے عمارت کو جو امیں اڑ جانے سے روکنے کے لئے اس کے ساتھ بہت سے بچے چپٹ کر رہ گئے ہوں۔ پھر خدا بخش نے چوپال میں قدم رکھا۔ بڑے ملک صاحب بولے: ”آج چھوٹا ملک بہت خوش ہے آج اس کا باد آیا ہوا ہے لاہور سے“ انھوں نے ایک لمبی کانگہ کے ساتھ پلٹ کر میری طرف دیکھنے کی اور شاید مسکراتے کی بھی کوشش کی مگر یہ مسکراہٹ مجھ تک نہ پہنچ سکی۔ ان کے سوچے ہوئے گالوں اور گھنے گل جھوں سے ٹکریں مار کر وہی کہیں لگتی۔

میں دد اس نے بیٹھا تھا کہ میرے لئے چائے آنے والی تھی۔ جھکو چپال کے باندے کے آخری سرے پر دو کرسیاں اور ایک تپائی رکھ کر اور مجھے ایک کرسی پر بیٹھا کر خدا بخش کو بلانے اور چائے لانے چلا گیا۔ جھکو خدا بخش کا بہت چہیتا تو کرتا تھا۔ نام تو اس کا بھی خدا بخش تھا، مگر خدا بخش اسے جھکو کہتا تھا۔ چنانچہ یہی اس کا نام پڑ گیا۔

خدا بخش کی امی کو نزلے اور بخار کی شکایت تھی اس لئے وہ بار بار اندر چلی کاچکر لگا آتا تھا۔ اب کے وہ واپس آیا تو میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بتایا کہ اس کی امی کا بخار اب ہلکا ہے اور وہ آرام کر رہی ہیں۔ ان کا بخار تیز رہتا تو آج میں تمہیں باز کے شکار کا تھاشہ نہ دکھا سکتا۔ وہ بولا: لارنس آف عربیا کی طرف نہیں نے اپنے باز کا نام لارنس آف تحلیلیا رکھ لیا ہے۔ جنس کو تحلیلیا میں بدلنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" وہ ہنسا۔ ابھی چائے کے بعد تم اور میں اور جھکو گاؤں سے باہر نکل جائیں گے۔ جھکو میرے باز کا سائیس ہے۔ وہ پھر ہنسا۔ یوں سمجھ لو کہ وہ لارنس آف تحلیلیا کا اردلی ہے۔ وہ باز کو اپنی منہلی پر بیٹھائے گا اور —"

دھم دھم کی آواز سے ہم چپکے دیکھا تو دو آدمیوں نے ایک اور آدمی کو پکڑ کے بڑے ملک صاحب کے سامنے جھکا رکھا تھا اور ملک صاحب اس کی پیٹھ پر مکتوں کا مینہ برسا رہے تھے اور ساتھ ہی ایسی گالیاں بھی دیتے جاتے تھے جو صرف بڑے ملک ہی کسی کو دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ہانپ ہانپ کر کہتے جاتے تھے: "بھری مجلس میں کہتا ہوں، ملک جی تہ بند منہ!"

ننگے ہو رہے ہو۔۔۔ اس حرامزادے سے کوئی پوچھے کہ تمہیں کیا تکلیف تھی۔
میں ہی ننگا ہو رہا تھا تمہاری ماں تو ننگی نہیں ہو رہی تھی؟

خدا بخش نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا: ”آگنی شامت ہے چارے
کی۔ اب جب تک یہ ہاتھ پیر پڑھ لے نہیں چھوڑ دیتا۔ ابا اسے کوٹتے ہی رہیں گے۔“
خدا بخش کے لیے میں برقی کا غرور تھا۔ میں نے کہا: ”خدا بخش تمہیں ٹمرا
نہیں آتی؟“ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو؟

خدا بخش نے معذرتی انداز میں کہا: ”کیا کریں یار۔۔۔ ان لوگوں سے یہی
سلوک کیا جائے تو سیدھے رہتے ہیں؟“

اتنے میں ہنگو چائے لے آیا طشت کو تپانی پر رکھتے ہوئے اس نے جھک
کر خدا بخش کے کان میں کہا: ”مسکین ایسا ٹمرا لوگا تو نہیں چھوڑے ملک۔ پھر اسے
مار کیوں پڑ رہی ہے؟“

”اچھا تو یہ مسکین ہے؟“ خدا بخش نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ اس کے تومر
میں زبان بھی نہیں۔۔۔ پانچ وقت کا نمازی ہے اذان ایسی دیتا ہے کرچڑیاں
مسجد کے میناروں پر اتر آتی ہیں۔ اس نے یہ کیا بکا دیا آتا ہے!

بڑے ملک صاحب کے دھمو کوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ مسکین ان آدمیوں
کے ہاتھوں میں ٹھک گیا تھا جنہوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ملک صاحب
کی آسانی کے لئے ان کے سامنے جھکا رکھا تھا۔

اب چھوڑ دو اس کیسے کو؟ ملک صاحب کر کے اور مسکین منہ کے بل ہنتر
کی طرح گر پڑا۔ ”اُمٹا لے جاؤ اپنی اپنی باتوں کے اس یار کو۔ ملک صاحب

پھر گرے۔ اور ایک، جوم کا جوم سکین کو اٹھانے یوں بے تابی سے بڑھا جیسے سب لوگ سکین کو اٹھانے کے بہانے ملک صاحب کو ہنگ پر سے اٹھا کر پھینکنے چلے ہیں۔ پھر جو لوگ سب سے پہلے بے حس و حرکت سکین کے پاس پہنچے تھے اسے اٹھانے کے لئے جھکے تو لچکنے والوں میں سے ایک سیدھا ہو گیا اور بڑی تشویش سے بولا: "سکین تو اذان پڑھ رہا ہے!"

پھر سکین غدی ہی اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ پھر جیسے ملک صاحب سے جانے کی اجازت لینے کے لئے بولا: "سورج تو بہت ڈھل گیا پیش کی نماز تو ہو چکی ہو گی؟ سبھی کو خاموش پا کر وہ اٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ چھوٹ کا ایک وحید جوان تھا اور جب وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا، چوہاں کے چوتھے کی سیڑھیاں اتر کر گلی میں جانے لگا تو مجھے ایسا لگا جیسے گلی میں ایک مینا چل رہا ہے۔"

آج اتے ہیں ماں کے یاز چوہاں پر گپ لڑانے کے لئے؟ "بڑے ملک صاحب کہہ رہے تھے: "چوہاں پر بیٹھنے کی ایک تمیز ہوتی ہے۔ کہنے لگا ملک بھی ننگے ہو رہے۔۔۔ ہو بھی میں ننگا ہو رہا ہوں تو تم دھیان نہ دو۔ افسانہ دوپہر کے وقت بھی نکلیں بند کر کے تو اس کے لئے سورج ڈوب جاتا ہے۔ پھر تم آنکھیں پھاڑے میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟" ذرا سا رنگ کراخوں نے پٹنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا: "کیوں چھوٹے ملک؟ چائے پلا دی اپنے یار کو؟" جواب کا انتظار کئے بغیر فوراً ہی انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا لیا اور بولے: "لو مہنی اسے دبا دو۔ دیکھنے لگا ہے حرام زادے کی ہڈیاں کوٹ کوٹ کر!"

"یہ حرام زادہ کون تھا؟" میں نے آہستہ سے خدا بخش سے پوچھا۔

”اس کا نام سکیں ہے؟“ خدا بخش بولا: ”ذات کا جو نام ہے۔ یہ کہیں جو آبا کے پنگ پر بچھا ہے اس نے بنا ہے، بڑا کارگر آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی مگر بہت بھولا ہے۔ نہ جانے آبا کو ٹوکنے کا کومل کیسے ہوا اس بد نصیب کو! یہ تو بڑا ہی مسکین آدمی ہے، بشکو فوراً بولا: ”اس کا اصلی نام مسکین ہے جی۔ محمد مسکین۔ سکیں سکیں تو لوگ اسے ویسے ہی کہتے ہیں، جیسے مجھے بشکو، جسکو کہتے ہیں۔“

”میں نے کہا۔“ یہاں اگر معلوم ہوا کہ مسکین جیسے لفظ میں بھی جگڑنے کی گنجائش موجود ہے۔“

”آہستہ بولو یار! خدا بخش نے ڈر کر بے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر بولا: ”عمقوں نے سن لیا تو شاید تمہیں تو کچھ نہ کہیں، میری آفت آجائے گی۔“

”نہیں۔۔۔ اب کیا آفت اٹھے گی۔ اب تو ان کا ہاتھ دکھ رہا ہے۔“

خدا بخش کو میرا سمجھا اچھا نہ لگا اس نے جیسے علامت بھیجتے ہوئے مجھے دیکھا اور جسکو سے کہا: ”اصل میں جا کر دیکھو، پیگے نے گھوڑے تیار کر لئے ہیں یا نہیں۔ زمینیں کس لی ہوں تو ختم جا کر لارنس کو اٹھا لاؤ۔ صبح کا سمجھو کا ہے؟“ بشکو چلا گیا تو خدا بخش میری طرف مڑا: ”دیکھو میاں یہاں کچ تمہارا سپلاؤن ہے اور تمہارا ہی طنز کرنے لگے ہو میرے آبا پر۔“ اس ملائے کا ایک منقولہ ہے کہ سر قنارہ نے بتایا ہے۔ ”دو سرکار قبلا آنا ہی پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ آبا کو یہ پٹائیاں مجبوراً کرنی پڑتی ہیں۔“

— ”ذکر میں تو زمیندارہ کیسے چلے۔“ وہ رگ گیا، پھر بولا۔ ”میں کیا سوچ رہے ہو؟“

میں نے کہا: ”میں سوچ رہا ہوں کہ جس لمبے چوڑے پنگ پر ملک صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اس کے پائے کتنے بڑے بڑے ہیں میں نے انہیں خود سے

دیکھا تو وہ لکڑی کے ٹکڑے :

حیران ہو کر خدا بخش نے پوچھا: "لکڑی کے نہ ہوتے تو اور کس کے ہوتے؟
تم نے پہلے کیا سمجھا تھا؟"

میں نے کہا: میں سمجھا یہ پائے نہیں بلکہ پلنگ کے ہرکونے کے نیچے ایک
ایک مسکین کھڑا ہے۔"

"گھاؤں کی کھلی خفا کا تم پرانا اثر ہوا ہے" خدا بخش بولا: "تم چکرا گئے ہو۔
میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ اور خدا بخش۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر
پہ چاروں مسکین پلنگ کے چاروں گوشوں کے نیچے سے نکل جائیں تو پلنگ
زمین بھرا ہے۔"

"گھوڑے تیار میں چھوٹے ملک: شکوہ ہمارے سروں پر بولا۔

شکوہ کے بائیں ہاتھ کی بندش پر چڑے کا دستا نہ چڑھا ہوا تھا جس پر لائس
آن تیلیا بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے میں باریک سی ایک زنجیر تھی جس کا آخری برا
دستا نے میں ٹکا ہوا تھا۔ باز کی آنکھوں پر چڑے کے کھوپڑے چڑھے ہوئے تھے۔
خدا بخش نے سراٹھا کر یہ کھوپڑے ہٹائے تو میں نے دیکھا کہ باز کی آنکھوں میں
ہلاکی وحشت تھی۔

"کیوں کیا ہے میل باز؟" خدا بخش نے پوچھا۔

اور میں نے اس کے کان میں کہا: بازوں کا بڑا ملک معلوم ہوتا ہے!
خدا بخش ہنس پڑا۔ مگر یوں ہنسا جیسے نہ ہنستا تو اور کیا کرتا۔ اس نے باز کی
آنکھوں پر پھر سے کھوپڑے چڑھائے اور ہم لوگ اہل کی طرف چلے۔

خدا بخش نے قسمیں کھا کھا کر مجھے یقین دلایا کہ اس نے جو گھوڑا مجھے سوار کے لئے دیا تھا وہ ملک صاحب کے اصطبل کا مسکین ترین گھوڑا تھا۔ آٹا مٹا تازہ گھوڑا مسکین تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے شب ظاہر کیا۔ مگر اس نے مجھے بتایا۔ ”اس کے اندر کا گھوڑا پناہ دیا گیا ہے اب یہ طبیعت کا بہت غریب گھوڑا ہے اسے مٹا تازہ رکھنا بہت ضروری ہے ضلع کے افسر لوگ جو اس طرف سے پرتے ہیں اچھے سوار نہیں ہوتے، ہوتے بھی ہیں تو کاروں میں پھیل پھیل کر بیٹھنے کی عادت پڑی ہوتی ہے۔ اور گھوڑے کی پیٹھ پر چوکس ہو کر بیٹھا پڑتا ہے۔ سو اتنا اس کام کے لئے یہ گھوڑا چنا کس پر افسر سوار ہو تو اس کی افسری کی شان بھی قائم رہے اندریوں بھی نہ ہو کہ لگام کو ذرا سا بھی ڈھیلا پکڑو افسر کو اپنی پیٹھ پر سے ریٹائر کر دے۔ چنانچہ اس گھوڑے پر یا تو ڈپٹی کمشنر بیٹھے ہیں یا آفیسر بیٹھے ہیں نے کہا: تو جیسی اس وقت تم مجھے پٹواری لگ رہے ہو؟

خدا بخش کا گھوڑا بہت منہ زور تھا۔ کنوئیاں اٹھا کر اور نشتے پھلا کر وہ جیسے لگام کو جاکر اڑ جانا چاہتا تھا۔ مگر خدا بخش اچھا سوار تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو میرے گھوڑے سے آگے نہ بڑھنے دیا جس کی کنوئیاں تو اٹھی مہوئی تھیں مگر چل یوں رہا تھا جیسے سسرال کے صحن میں پہلی بار داخل ہونے ہوئے دامین چلتی ہیں۔ بشکو باز کو ہاتھ پر بٹھائے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ بھاگ بھی نہیں رہا تھا اور چل بھی نہیں رہا تھا۔ بس بین بین کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔

کیکروں کے گنہان ذخیرے کا موڑ کاٹتے ہی حد نظر تک پھیلا ہوا ایک چشیل دیر اندھا تھا۔ جس میں کہیں کہیں بہت فاصلے پر کیکر اُگے ہوئے تھے اگر

یہ کیکو ہمارے گھلتے تھے۔ ان کے تہ بہت چھوٹے اور شاخیں بہت ٹھیکڑی اور
 نگی تھیں۔ لالیاں شام سے پہلے انہی اکاؤ کا کیکوں پر آکر بیٹھتی ہیں۔
 خدا بخش نے مجھے بتایا: اور لالی باز کا سن بھانا کھا جا ہے۔ میرا لارنس لالی کو
 دیکھتا ہے تو پاگل ہو جاتا ہے۔ لالی کا گوشت میرے لارنس آن تھیبیا کی دیک ہے!
 میں نے کہا: خدا بخش لالی تو بڑا ہی معصوم پرندہ ہے۔ یہ تو چڑیا ہے بھی
 زیادہ معصوم ہوتا ہے۔ اس کی پید پل پل کتنی پتیاں باجھیں اس پر کیا پھینکا سا طاری
 کئے رکھتی ہیں۔ پھر یہ پرندوں میں شاید سب سے زیادہ بے ضرر ہے۔ یہ تو نہایت
 مسکین مخلوق ہے۔ آخر تم لوگوں کو مسکینوں کا خون پینے کا اتنا شوق کیوں ہے؟
 خدا بخش بولا: اگر تمہیں تقریر کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو راستے میں بھی
 کوئی ٹیڈ آئے گا، تم اس پر چڑھ جانا اور اپنی تقریر جھاڑنا، میں اور بشکومت
 بستہ نہیں گئے۔ مگر ابھی دھاڑک جاؤ۔ میرے لارنس کو دیکھو، جھکو کی سٹی پر کیے
 بار بار پھڑپھڑا جاتا ہے۔ اس نے دیرانے کی بڑا سونگھ لی ہے۔
 لالی! جھکو سانپ کی طرح پھنکارا اور خدا بخش نے گھوڑا بڑک لیا۔ میرا
 گھوڑا تو اس کی دیکھا دیکھی چل رہا تھا۔ چنانچہ وہ بھی ٹرک گیا۔
 خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارنے سے پہلے مجھے خود سے
 تماشہ دیکھنے کی تلقین کی۔ یہ تمہاری زندگی کا ایک کبھی نہ بھولنے والا تجربہ ہوگا۔
 اس نے کہا: مزہ آجائے گا جب باز لالی پر پھٹے گا تو ایسی آواز پیدا ہوگی
 جیسے ہوا کو تلوار کاٹ رہی ہے۔ دیکھو۔
 خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارے اور اس کا رخ دُور

ایک ٹیرے میسرے کیکر کی طرف کر دیا جس پر تقدیر نے ایک لالی کو لایا تھا۔ ایک دم باز پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس نے دیکھ لیا لالی کو۔ خدا بخش نے خوش ہو کر مجھے بتایا اور شکو نے باز کے پنجے کو اپنے دستانے سے آزاد کر دیا۔ موت کی تلوار سوا کاٹتی ہوئی چلی گئی اور لالی اُڑ گئی۔ مگر باز نے اُن کی آن میں اس کو جالیا۔ لالی کی ایک چیخ نے اس دیر لے کو ذرا سا چونکا دیا، اور پھر باز لالی کو اپنے پنجوں میں دبائے واپس شکو کی مسمیٰ پر آ بیٹھا تب اس نے لالی کی چیر بھاڑ شروع کر دی۔ اس کی مٹری ہوئی چونچ لالی کے خون میں رنگ گئی، پھر اس نے لالی کی بوٹیاں نوچنا شروع کر دیں اور خدا بخش مسلسل بولتا رہا۔

”اس کے کھانے کا قرینہ دیکھو — ہڈی پر سے گوشت کیسے اُتارتا ہے، افسانہ کو بھی ایسا سلیقہ نصیب نہیں اور پھر یہ تو کچا گوشت ہے تازہ اور دھامن سے بھر پور!“

”لغت!“ میں نے کہا۔ ”تمہاری ذہانت تو آدم خوروں کی سی ہے۔“

مگر خدا بخش ہنستا رہا اور میری طرف یوں دیکھتا رہا جیسے میں بیمار ہوں اور وہ میری دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔

باز جب لالی کو چبا چکا تو جیسے اسے شہ ہو گیا، اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا بخش بولا: ”لارنس آف تعلیلیا آؤٹ ہو گیا۔“ پھر مہنت ہوا وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ باگ موڑی مگر پھر رگ گیا۔ کچھ سوچ کر بولا: ”کیوں بشکو سیاں نکس پہنچ گئے ہیں تو بابا یارو کو کیوں نہ دیکھتے چلیں۔“

بشکو بولا: ”بابا یارو کی آنکھ بھی باز کی طرح تیز ہے۔ ہاں سکتا ہے اس نے

ہیں دیکھ ہی لیا ہو، ہم واپس چلے گئے تو وہ منورنگہ کرے گا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ خدا بخش میری طرف اشارہ۔ چلو تمہیں غسل کی جائے پلائیے۔ یہاں قریب ہی ہمارے بڑے مزار ہے، بابا یارو کا ڈیرا ہے، وہاں چلتے ہیں۔ ہم اس سے بل کر خوش ہو گئے۔

باز نے جس وحشت سے لالی کو کھایا تھا، اس سے میری طبیعت بالکل ٹھس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا: ”جہاں چاہو چلے چلو۔“

دھنائی تین میل کا فاصلہ کر کے ہم ٹرنی ہائل مٹی سے بے ہوئے ایک گھونڈے کے پاس پہنچے۔ خدا بخش نے چپکے سے اترنے اور آہستہ آہستہ قریب جانے کی تجویز پیش کی۔ وہ بولا: ”بڑا لطف آئے گا۔ ایک بار میں اور شکریہ دینی چپکے سے آئے اور بابا یارو کے پاس ایک چار پائی پہنچ گئے۔ بابا یارو اپنی رسیاں بٹنے میں مگن رہا، مانی بیگیاں چولے میں پھونکیں، مارتی رہیں اور رنگی ٹوکے سے چادر کترتی رہی کسی کو سہ ہی نہ چلا۔ پھر جب انھیں پتہ چلا تو بابا یارو اتنا غرمندہ ہوا کہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ منہ سے بس پھپھ کر کے رہ گیا۔ مانی بیگیاں اپنے بڑے پنے کو گالیاں دیتی رہیں۔ اور رنگی تو اتنا ہنسی کہ جب بابا کی پشکار پر بھی اس کی ہنسی رکنے میں نہ آئی تو وہ اندر کوٹھے میں بھاگ گئی۔“

گھونڈے کے پھپھوڑے گھونڈوں بہت اتر کر جم آہستہ آہستہ آگے بڑھے صحن میں لیکر کے بڑے بڑے درخت تھے، نیچے ایک گائے اور چند بکریاں شاید عادتاً بیٹھی تھیں۔ کیونکہ درختوں کے سائے اپنے تئوں کے سائے سے بہت دُور چپکے تھے۔ ان بکریوں کے پاس کھٹولے پر بابا یارو بیٹھا اُون بٹ رہا تھا۔

دیوار کے ساتھ لگے ہوئے چولے میں آگ بھل رہی تھی اور مائی بیگیاں ہانڈی میں
بچہ چلا رہی تھی جیسے پتھر اُبال رہی ہے۔ دونوں اپنے اپنے کام میں ایسے
مغور تھے کہ انہیں ہمارے آنے کا پتہ نہ چلا۔ پھر اچانک مائی بیگیاں بولی: "ہائے
مجھے تو بہت چننا لگ رہی رنگی کو اب تک تو آ جانا ہی چاہیے تھا۔"

"آجائے گی۔" بابا یارو بولا: "کہاں گئی ہے؟ اپنے ملکوں کے ہاں گئی ہے
نا؟ تو پھر اپنے ہی گھر گئی ہے جانتی نہیں ہو ملک کی بیٹی اس کی کتنی بچی سیلی ہے؟
وہ پشیدہ ہے جو اس نے پھپھی گرمیوں میں رنگی کو دیا تھا؟ آتا بڑھیا رشم تھا
کہ رنگی اسے تہ کرتی گئی اور آخروہ آتا ذرا سا رہ گیا کہ تمہارے چمٹے کے پھلے
میں آگیا۔ سو روپے کا جو گویہ دوپٹہ۔ وہ اپنی اتنی سیاری سیلی کے پاس گئی ہے
تو فکر کی کون سی بات ہے۔ رات بھی رہ لے تو کھو فرشتوں کے گھر جان ہے۔"

خدا بخش نے آہستہ سے کہا: "میرے خیال میں واپس چلنا چاہیے۔ ان
بے چاروں نے ہمیں دیکھا تو خاطر مدارات میں لگ جائیں گے۔"

بشکو بولا: "اور پھر چائے پکانا تو مائی کو آتا ہی نہیں جو شائد گھومتی ہے۔
رنگی جوتی تو پی لیتے۔ ایسی چائے پکاتی ہے کہ نشہ ہو جاتا ہے۔"

خدا بخش بے اختیار ہنس پڑا تو مائی اور بابا نے چونک کر دیکھا اور ان
کے ہاتھ پر ہول گئے۔ وہ خدا بخش سے رُکنے بیٹھنے اور چائے پینے کی یوں التجا نہیں
کرنے لگے جیسے اگر خدا بخش نے ان کی بات مان لی تو ان کا گھر ذرا سونے
چاندی کے محل میں بدل جائے گا اور ان کی بکریاں گھوڑیاں بن جائیں گی۔
خدا بخش نے انہیں سمجھایا کہ: "سو بیچ ڈرو بے کو ہے اور ہم دشمنوں والے

لوگ ہیں۔ شام کے بعد تو ہماری حویلی کی فیصل چرواٹھوں والوں کا سپرہ ہوتا ہے۔
 تم تو جانتے ہو بابا یارو! میں شام سے پہلے گھر نہ پہنچا تو بڑے ملک قیامت مچا
 دیں گے، ہمارا باز لالی کا شکار کرنے آیا تھا، سوچا تمہیں دیکھنے چلیں، ٹھیک
 ہونا، کوئی تکلیف تو نہیں۔ اچھا اب تم بیوقوف ہم چلے، رکاب میں پاؤں رکھنے
 ہوئے خدا بخش بولا۔ رنگی کی فکر نہ کرو، اگر سے دیر ہو گئی تو میری بہن اسے
 روک لے گی۔ ادا اب تو دیر ہو ہی چکی ہے۔“

بابا یارو بولا۔ آج صبح اسے ایک بھاڑی کی جڑ میں اگی ہوئی بہت سی چوٹیں
 ملیں۔ اس کی سیسی کو چوٹیں بہت پسند ہیں اس لئے زٹ لگا دی کہ وہ ملکوں کی
 حویلی میں جائے گی۔ کپڑے دھوئے، کھانا کھانے اور پیرہنے کو چوٹوں کی پوٹلی
 باندھ کر چلی گئی۔ ویسے تو وہ سیانی ہے پر سوچتا ہوں، اگر سے راستے میں شا
 پڑ گئی تو — تو دیر مان ہے، ڈر لگتا ہے۔“

خدا بخش نے اسے تسلی دی: ہماری زمینوں پر ایک چڑیا تک کو خطرہ نہیں
 تو رنگی کو کیا ڈر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ رنگی بابا یارو کی بیٹی ہے اور سب جانتے
 ہیں کہ بابا یارو کس کا آدمی ہے — تم فکر نہ کرو، لو ہم چلے۔“

واپسی پر خدا بخش نے بازوؤں اور شکموں کے سلسلے میں بے حساب سلوٹ
 سے مجھے لاد ڈالا، میرے ذوق کی رعایت سے اس نے خوش حال خان خٹک
 اور غلامہ اتہال کے شاہینوں کا بھی ذکر کیا اور بعض پرانے سکوت، تلواروں
 کے قبضوں اور لبادوں کے جھنڈوں پر بازوؤں کی تصویروں کے بارے میں بتا کر
 ثابت کیا کہ باز ایک شاہی پرندہ ہے، آخر میں اس نے پرمسکت دلیل دی۔

”تم نے آج تک کبھی نہیں سنا ہو گا کہ کسی غریب آدمی نے باز پالا ہو۔“
 ”غریب آدمی تو لایا ہوا پالتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

خدا بخش میرے طنز کا کچھ جواب دینے ہی لگا تھا کہ اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ کیکڑوں کے ذخیرے کے موڑ پر ایک ایک ایک نو جوان لڑکی ہمارے ساتھ آگئی تھی۔ وہ رنگی تھی۔ نہ جانے اس کا اصل نام کیا تھا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ رنگوں کا ایک دبیر ہے۔ سات رنگوں میں سے کوئی بھی رنگ ایسا نہ تھا جس سے اس کا وجود محروم ہو۔ اس کی آنکھوں، بالوں، چہرے اور ہاتھوں سے جو رنگ پتھر رہے تھے وہ اس کی تہ بند کرتے اور اڈھنی میں جذب ہو گئے تھے۔ اس وقت سورج سپاٹ میدان کے پرے کنارے پر ٹھوڑی ٹیکہ جیسے زمین کا آخری نظارہ کر رہا تھا۔ آسمان کے وسط میں بادل کے چند ٹکڑے ابھی سے گلابی ہو گئے تھے اور یہ گلاب کیکڑوں کے ذخیرے کے اس موڑ پر برس رہا تھا۔ اگر ایک بے رنگ جہلی میں سے نکلے ہوئے رنگی کے پاؤں کے ناخن ٹٹے ہوتے نہ ہوتے تو اسے زمینی مخلوق قرار دینے کے لئے مجھے اپنے آپ سے خاص طور پر جگ لڑنی پڑتی مجھے ایسا لگا کہ کٹرے کٹر لہو کو بھی رنگی کی ایک جھلک دکھا کر اسے ایک ایسے خدا کا قائل کیا جاسکتا ہے جو اس اتنا کا حسن کا رہے۔

یہ سب کچھ میں نے ایک لمحے میں سوچا جس میں بس اتنا ہوا کہ خدا بخش نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ رنگی ٹھٹھاک کر کٹری ہو گئی اور بشکریچے سے بھاگتا ہوا آیا اور ہوائ دیکھا چھوٹے ملک؟ رنگی کتنی بے وقوف ہے۔ اسی یہ بھی کوئی وقت ہے اتنے لمبے سفر کا؟ خجہ ملکائی نے رد کیا نہیں۔“

”چل واپس۔“ خدا بخش نے بڑی اہمیت سے حکم دیا: جو ہمارے دشمن ہیں وہ ہمارے مزارعوں کے بھی دشمن ہیں، اور ہمارے دشمن بے شمار ہیں۔ سو رہا ڈوب رہا ہے، چاند کی رات بھی نہیں ہے، آتنا لمبا ویران راستہ ہے اور چل کھڑی ہوتی ہے اس وقت چل واپس۔ میں جا کر اپنی بہن کی خبر لیتا ہوں کہ ایسا سلو کیا جاتا ہے اپنی سیبل سے غریب سہی پر کیا انسان نہیں ہے رنگی اپل رنگی۔“

رنگی صرف دو لفظ بولی مگر انھوں نے بھی اس کے حُسن میں جیسے ایک جہنا کو سا پیدا کر دیا۔ یا بابا بے چارہ۔“

”ہم سمجھا آئے ہیں بابا کو۔“ خدا بخش فوراً بولا: ہم نے کہہ دیا تھا کہ اگر رنگی ہمیں گھاؤں کے پاس مل گئی تو ہم اسے واپس حویلی میں لے جائیں گے۔ ایسے وقت دیرانوں میں نہیں نکلتے نادان۔ زمانہ بڑا خراب ہے چل۔“

رنگی ہمارے ساتھ چل پڑی۔ گھاؤں میں پہنچ کر وہ جنگلوں کے ساتھ حویلی کی طرف چلی گئی اور ہم چو پل پڑ گئے۔ رات کے کھانے کے بعد بڑے ملک صاحب نے مجھ سے باز کے شکار کا پوچھا اور پھر کافی دیر تک بازوں، شکروں، کتوں اور گھوڑوں کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے خدا بخش سے سرگوشی کی۔ کیا تمہارے ہاں شکروں اور کتوں ہی کی باتیں ہوتی ہیں؟ انسانوں کی نہیں ہوتیں۔؟

”ارے چپکے رہو۔ اس نے آہستہ سے کہا: ورنہ آبا پکڑ کر سکین بنوا لیں گے۔“

بڑے ملک اُٹھ کر چپے گئے تو چھوٹے ملک کی گپیوں کی بادی آئی۔ وہ بیشتر وقت اپنے لارنس آف تھیلیبیا کی تعریف کرتا رہا۔ اور ایک بار جنگو نے آکر اس سے کوئی بات کی۔ اور وہ مڑکا سٹھنے والوں کو داد دیکھیں کا موقع ملا: بابا بخش

کہتا ہے کہ وہ ایک صدی کا ہو رہا ہے مگر آج تک اس نے اس بلا کا باز نہیں دیکھا، وہ کہتا ہے چھوٹے ملک کا باز، بازوں کا شیر ہر ہے؟

جب خدا بخش بھی حویلی میں چلا گیا۔ اور شکوہ بھی میرا بستر جا کر اور تنہائی پر پانی کا ایک جگ رکھ کر روانہ ہو گیا تو میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ آسمان آنا صاف تھا کہ سیاہ ہو رہا تھا۔ نار سے اتنے بے شمار تھے کہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے سر جھکا جاتا تھا۔ گاؤں پر مکھن سٹاٹا تھا۔ رات کا آغاز تھا اس لئے کہتے تک سو گئے تھے، صرف جھینگر جاگ رہے تھے مگر جھینگروں کی آواز بھی تو سٹاٹے کا ایک حصہ ہی ہوتی ہے۔

تب رنگی کو بیکر میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس تناؤ اور اعتماد کے ساتھ جیسے وہ کہہ رہی ہے کہ کوئی نقص ڈھونڈ سکتے ہو تو ڈھونڈو۔! میں نے رنگی کے اس پیکر کو جسے میں نے شام کے ایک گلابی لٹھے میں اپنڈھن کے اندر محفوظ کر لیا تھا ہر زاویہ سے جانچا اور تب میں نے کہا۔ ہاں رنگی تم میں ایک نقص تو موجود ہے اور وہ نقص یہ ہے کہ تم انسان ہو اور انسان بڑی کمزور مخلوق ہے؟

جہاں کے زیریں آگن میں کیکر پر چڑیوں نے داویلا مچایا، میری آنکھ کھل۔

قریب ہی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی جانے والی تھی اور کوئی اونچی آواز میں تکبیر پڑھ رہا تھا، قد قامت الصلوٰۃ، قد قامت الصلوٰۃ! صبح کے ہلکے ہلکے آواز میں مسجد کے مینار آسمان کے پس منظر میں متحرک معلوم ہو رہے تھے۔ پھر ایک مینار کے کلس پر ایک چیل اُتری اور اُسے اپنا توازن قائم رکھنے کے لئے دیر تک پڑوں کو بار بار پھیلانا پڑا۔ اس پر بھی جب تک کرنہ بیٹھ سکی تو اڑ گئی، منہ اندھیرے

یہ جیل کہاں سے آگئی؟ میں نے سوچا۔ پھر میں نے خود کو جواب دیا: ”جہاں سے
یہ جڑیاں آئی ہیں۔“

سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ جب بشکو میرے لئے ملائی سے اُٹا ہوا دودھ کا
ایک گلاس لایا۔ غسل خانے میں منہ پر پانی کا ایک چھینٹا مار کر میں باہر آیا تو
خدا بخش چو پال کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ چلو ذرا ذخیرے تک گھوم آئیں۔ اس
نے کہا: ”وعدہ کہ آج میں تم کے افسانوں کی باتیں کروں گا۔“

”چلو۔“ میں نے کہا، ”پھر میں سیڑھیوں پر رُک گیا۔“ سنو کیا رنگی چلی گئی؟
دفعۃً خدا بخش کو اس زرد کی مہنسی چھوٹی کہ وہ بہت بہت میرے ہنگ پر
جاگڑا۔ آخر کار پتھر میں بھی جو تک لگی تو۔۔۔ قہقہوں کے دوران میں اپنی رانوں کو
پیٹ کر کھتا رہا۔ ”برف کی تہہ بہت موٹی تھی مگر آخر تو ٹوٹی تو۔ پھر مجھ سے
پٹ گیا۔“ یار، مجھے تم پر ایک دم بہت سہاوا لگ گیا ہے۔ میں سمجھا تھا تم اُٹو کے
اُٹو ہی ہو۔ ”بڑی مشکل سے سانسوں پر قابو پانے کے بعد بولا: ”وہ رنگی وہی ہے
جاسکتی ہے؟“ ”سستی پیٹے گی، پراٹھا کھائے گی، اس کی سبلی اسے یوں آسانی سے
تھوڑی جانے دے گی۔“ اماں بیمار نہ ہوتی تو رنگی کو میری بہن اپنے کمرے میں ملائی۔
ابھی تو وہ اٹھی بھی نہ ہوگی۔“ پھر ذرا سا رُک کر بولا: ”جانے لگی تو تمہیں دکھائی
گئے بلکہ آج شام کی چائے وہیں بابا یارو کے پاس کیوں نہ بیٹیں؟“
”چھوٹے ملک،“ بشکو چلا یا۔ اور اتنی تیزی سے بھاگتا ہوا آبا کو کیکر پرے
سب جڑیاں ایک ساتھ اڑ گئیں۔

”کیا ہے؟“ اماں تو ٹھیک ہیں؟ ”خدا بخش نے گھبرا کر پوچھا۔

”جی وہ تو شک ہے۔۔۔ پر۔۔۔“ بشکو کی آنکھیں پٹی پٹی تھیں، نکتے پھول رہے تھے اور منہ مسلسل کھلا تھا۔

”پر کیا۔۔۔“ کچھ بکھرے خدا بخش نے اسے ڈانسا۔

اور بشکو نے جیسے کائنات کے سب سے بڑے حادثے کی اطلاع دی کیسی نے آپ کے لارنس کی گردن مروڑ کر پینک دی ہے۔ لارنس کرا پڑا ہے۔ خدا بخش کو جیسے سکنت ہو گیا۔ ایک خاصے وقفے کے بعد بولا: ”رنگی کو یہاں لے آؤ۔“

بشکو واپس بھاگا تو میں نے خدا بخش سے پوچھا: ”رنگی کو بلانے کا کیا مطلب ہے؟“

”ہے ایک مطلب۔“ خدا بخش بولا۔

حادثہ شدید تھا اس لئے میں خاموش رہا فوراً بعد بشکو واپس آیا۔ رنگی تو منہ اندھیرے ہی چلی گئی چھوٹے ملک؟

اور خدا بخش اپنی لہولہا آنکھیں مجھ پر گاڑ کر بولا: ”دیکھا میں نہ کہتا تھا۔۔۔ میرے بازو کو اسی کمینے نے مارا ہے رات وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ وہ مجھ پر ڈالے گی۔ میں نے کہا ’لاہیاں بازوؤں کو نہیں مار سکتیں ناوان۔‘ اسی نے مارا ہے میرے لارنس کو‘ میں جانتا ہوں یہ قتل اسی بد ذات، کنگلی تلاش لوکی نے کیا ہے۔ میں اس کی کھال اُدھیڑ دوں گا۔ میں اس کی.....“

”انکار کراچی“

مبارک کا آخری گلاب

”تم بھی تو شاید شاعری کرتی تھیں؟“

آج انہوں نے چولہے کے پاس روٹی کھاتے کھاتے = بات پوچھی۔ اور دل کی ہانڈی میرے ہاتھ سے گرنے لگتی تھی۔ میں نے روٹی کے بغیر خالی ہاتھ جھلنے تو سے بڑکا دیا۔ اور پھر چلے ہوئے ہاتھ کو بھونکنے کے بہانے اپنی نظریں جھکا لیں مگر وہ دم اچانک نہ جانے کدھر دوڑنے لگا میرے سامنے ایک خلی کی سڑی جیسے دھوئیں میں اُبھرنے لگیں۔

”....تم شاعری کرتی تھو۔ ایسی شاعری جو میری رُوح میں اتر جاتی ہے۔ اور میں جھنجھلا کے اپنی کہانیوں کی گلابی پھینک دیتا ہوں۔ اتنی میں ہوئی شاعری۔ اتنی سر بلند شاعری! تم شاعری کرتی ہو تب میں تمہیں دُنیا کی چھین عورت سے زیادہ خوبصورت دیکھتا ہوں۔ آئندہ مجھے اپنی صورت کی تفصیل نہ بتانا۔ صرف یہ کہو کہ آج ختم نے کیا لکھا۔؟“

تباہ میں بھی شاعری کتنی تھی؟

کسی اندے کو یہ بتانا کہ تو اندھا ہے، کیسی دل خراش بات ہے۔ پھر وہ مجھے بار بار شاعری کا طعنہ کیوں دیتے ہیں۔ میں تو خود اپنے اس جرم کا افسار کر چکی ہوں۔ اور ہر بار سچ مچ توبہ کی ہے کہ آئندہ یہ تصور کسی نہ ہوگا۔

انہوں نے میرا گھونگٹ اٹھا کے سب سے پہلے یہی کہا تھا۔ ”بھئی سنا ہے تم شاعری کرتی ہو۔“ یہ بات ہمیں پسند نہیں ہے۔

میرے دل پر ایک پتھر اُڑا تھا۔ مگر میں نے پھر اپنا لولہ ان دل تمام کر کھا تھا۔ اچھا میں شعر کہتا چھوڑ دوں گی۔

پھر میں نے ان کا ہاتھ تمام کر سوجھا۔ اب میں وہی کروں گی جو تم چاہ گے۔ کیونکہ میں ماضی اور مستقبل میں بٹتے وقت لچکتا نہیں چاہتی۔ میں اس شگ سے ٹوٹ کر الگ ہونا چاہتی ہوں۔ جہاں سے میرے بندھن نکل چکے ہیں آج سے میں صرف تمنا ہی ہوں۔ تمنا ہی۔ تم جو کسی لمحہ سے مسکرا کے بات نہیں کرو گے۔ ہمیشہ شک و شبہ کی نہریں لگا ہوں سے مجھے دیکھو گے۔ اور میں اپنا یہ خود دار اور خدی سر تمنا سے قدموں میں جھکائے رکھوں گی۔

پھر میں نے اپنی آنسوؤں بھری آنکھیں کھولیں تو میں سچ مچ اُن کے قدموں میں جھکی ہوئی تھی۔ اور وہ بڑے تعجب سے بڑی پریشانی سے میرے چہرے کو گھور رہے تھے۔ شاید وہ گھبرا گئے ہوں گے کہ میں پتہ نہیں کس قصد کے اعتراف میں سر جھکائے ہوئے ہوں! مرد ذات۔ سوچ رہے ہوں گے نہ جانے کتنے گناہ آج پہلی بار بخشنا چاہتی ہے۔

اس رات دوشک کے دیا میں ڈوب ڈوب جاتے تھے۔ جیسے میں کوئی ایسا گھر ہوں جہاں چوروں نے ہر چیز کا صفایا کر ڈالا ہو۔ اب وہ ان لیٹروں کے قدموں کے نشان جگہ جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔

صبح کو انہوں نے جب خالی بوتل کی طرح مجھے ایک طرف رکھنا چاہا تو میں پیران کے شانے سے لگ گئی۔

”میرے محبوب۔۔۔ میں نے کہاں کہاں تنہا رہا انتظار نہ کیا تمہارے لئے کیا کیا سوچا۔ لے بیٹھی تھی۔ آج میں نے اپنی جھولی کے سارے پھول تم پر پھینکا کر دیئے ہیں۔ اب تم میری خالی جھولی میں کوئی کھلی کوئی ستارہ کوئی پیارا مہر ابل بھی نہ ڈالو گے؟ میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ بات ان سے کہہ دوں! مسگر انہوں نے اپنی بات شروع کر دی۔ اماں کو خوش کرنے کا گڑبہ ہے کہ دن رات ان کے ساتھ چولہے کے پاس بیٹھی رہا کرو۔ وہ تمہیں چند دن میں سب کام سکھا دیں گی۔“

”نا بھئی! میں اپنی دلہن کو شاعری دلاؤں گی نہ کرنے دوں گی۔ یہ موا ادا رہ جس گھر میں گھسا، لاکھ کا گھر خاک کیا۔“ باہر میری ساس اپنی کسی ٹیڈی کو اگاہ کر رہی تھیں۔

اپنی ساس کی اس بات پر میں جی جان سے قربان ہو چو گئی۔ ہائے کتنی اچھی بات کسی انہوں نے! سچ بچہ یہ شاعری لاکھ کے گھر خاک کرتی ہے جس وقت میں نے اپنی نظیں ایک ایک کر کے جلائی تھیں تو کیا یہ لاکھوں کی دولت نہ تھی؟ کوئی میرا ایسا سنی ہو تو لے جو اپنی کمائی گواپنے ہاتھوں آگ لگا دے۔

”جہیں سبزیاں بہت پسند ہیں۔ چاول بالکل نہیں کھاتے۔۔۔ اب رطل
 اچار۔۔۔ تو بھی اچھا اچار بنانا تو تمہیں سب سے پہلے سیکھنا پڑے گا۔“
 وہ پتہ نہیں کیا کیا کہے جا رہے تھے لیکن میرے سامنے تو اپنی نظموں کا
 دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا۔ مجھے ایک آدمی جلتے خط کی سطریں یاد آ رہی تھیں۔
 ”... جہیں کشمیر پسند ہے نا؟ اس لئے ہم کشمیر کی سیر کر رہے ہیں اور تمہاری
 آنکھوں میں چھپی ہوئی جھیل ڈل میں ڈوبے جا رہے ہیں اور تمہارے کانوں سے
 کشمیری گیت سن رہے ہیں۔ تمہارے شاداب چہرے جیسے باغوں میں گھوم
 رہے ہیں اور تمہارے دل کی طرح وسیع میدانوں میں مٹر گشت کر رہے ہیں
 — مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آج ہم ضرور کوئی دلربا سی نظم لکھ رہی ہوگی۔“
 میلا دل۔۔۔! میں نے اپنے دل پر ایک نظم بھی لکھی تھی۔ یہ دیوانہ مجھے جاننے
 کون کون سے کنویں جھنکوائے گا۔ یہ دل جو اٹنی مانتے نہ سیدھی۔ دن نکلے
 تو رات کے غم میں روئے۔ رات ہو تو دن کی عجبائی میں ٹر پے۔

اپنی اس نظم کو پڑھ کر میں خود ہی رو پڑی تھی۔ جانے کیسے سحرانہ دیوانی تھی
 میں کہ اپنی نظموں سے خود ہی پیدا کرتی۔۔۔ جتنی تھی اور روتی تھی۔ یہ نظمیں میری
 راز دار تھیں جو بات دل میں آتی وہ خود خود کاغذ پر پھسل جاتی تھی۔ اب میں کیسے
 کیسے ختم کرتی۔ کاغذ کے ان پردوں کو چھپانے کے یگیوں کے نام۔۔۔ صندوقوں
 کی تھوں میں۔ اور اس کی کتابوں میں۔ بچہ بھی نہ تو چڑیل دیکھ ہی لیتی تھی۔ پڑھتی جاتی
 اور روتی جاتی کیسی عجیب سی بات تھی کہ ہم دونوں بہنوں کا ڈکھا ایک تھا۔ معمولی
 سی صورت شکل۔ گھر پر بچائی ہوئی مجلس اور نظر سے ٹھکرائے جانے کا دکھ۔ ابا کا

سیاہ رنگ اور اماں کا بے ڈھنگا نقشہ ہم دونوں بہنوں میں تقسیم ہوا تھا۔
 بہت دنوں کی بات ہے جب میں شاید ساتویں یا آٹھویں کلاس میں ٹیبل
 ہوا کرتی تھی "ایک دن اپنے پڑوسن میں ہم ایک دلہن دیکھنے گئے۔ ہائے کیسی
 خوبصورت دلہن تھی سچ پچ چاند کا ٹکڑا۔

"دیکھا بھیا" ایسی ہوتی ہیں دلہنیں۔ گوری گوری۔ "نموتے رنگ ہری
 نظروں سے دیکھا اور پھر اس لمبے میں بولی "بھیا اب اپنا بیاہ تو نہیں ہوگا۔
 کیونکہ سب دو لہا گوری دلہن چاہتے ہیں؟

"چپ بے شرم" میں نے اسے دھکا دے کر کہا۔ گردل میں نمونہ کی بات
 نے چاقو چھو کر چھوڑ دیا۔ واقعہ میں نے بھی کالی دلہن کبھی نہیں دیکھی تھی۔
 اور پھر میں نے بڑے دھکے کے ساتھ سوچا تھا کہ میرا وہ لہا کبھی نہیں آئے گا۔
 مجھے کوئی بچہ اسی کہہ کر نہیں پکارے گا۔

بس اسی رات میری شاعری کا آغاز ہوا تھا۔ میں نے پہلی نظم لکھی تھی۔
 ایک ایسی لڑکی پر جسے انڈیا میں ہر چیز دینا معمول گئے تھے۔ دولت، صورت
 محبت، بے فکری — کوئی نعمت اسے نہیں ملی تھی —

اور پھر تو یہ شاعری کا رنگ جیسے میری جان کو لگ گیا تھا۔
 ادھر اماں ہمارے بڑھتے ہوئے قد کو دیکھ کر بابا کو کھائے ڈالنے تھیں کہ
 ان لڑکیوں کے لئے کچھ تو جمع کرو۔ گھر کی اس بے سرو سامانی کو دیکھ کر میرا دل
 ڈوبا جاتا تھا کہ یہاں کوئی گھریا لینے آئے گا؟

انہیں دنوں ایک بار میں زہرہ خاں کے ساتھ ان کے کالج کے ایک

فلکشن میں گئی تھی۔ رہاں کوئی نام نہ پوچھا نہ گانا۔ صرف ایک کالی، موٹی بھٹی چارہ کی صورت عورت آئی تھی اپنی کہانی سنانے، مگر اٹھ جانے اس میں کیا بات تھی کہ خلقت خدا کی اسے دیکھنے کو ڈیڑھ پڑتی تھی۔ کالج کی لڑکیاں اس کے آٹو گراف لینے کو مری جا رہی تھیں۔ اور وہ تھی کہ خوشی کے مارے کھلی جا رہی تھی۔ ایک ایک سے جھبک جھبک کر مل رہی تھی۔ جب میں نے ایک لڑکی سے پوچھا کہ یہ کون ہیں تو سب کو میری جہالت پر بڑا ترس آیا۔ اے ہے جاہل بے چاری چاندی کو نہیں پہچانتی۔ اتنی مشہور افسانہ نگار کو؟

اس دن میں گھر لوٹی ہوں تو چاند سورج میرے ساتھ ساتھ آئے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں بھی چاندنی بنوں گی۔ لوگوں کی حقارت بھری نظروں کو لات مار کے شہر کے آسمان پر رہا بیٹھوں گی۔ دیکھوں تو پھر دنیا مجھ سے کیسے مزہ پھیرے گی؟

رات ہوئی تو میں نے نمونہ کو چاندنی کا قصہ سنایا۔ اسے بھی کسی طرح یقین نہ آیا کہ ایسی بد صورت عورت کی اتنی عزت ہو سکتی ہے۔

دوسرے دن ہم دونوں برقعوں میں کتابیں دبا کر اسکول کی طرف دوڑ رہے تھے۔

پھر دوڑتے ہی چلے گئے۔ اتنے تیز کہ نہ تو مجھے چھوڑ کر آگے بھاگ گئی۔ اس نے ایم۔ اے کیا اور ایک کالج میں لیکچرار ہو گئی۔

لیکن میں شاعری کے کائناتوں میں الجھ کر مرف بی۔ اے کر سکی۔ بقول اماں کے شاعری نے مجھے بہاد کر ڈالا تھا۔ کورس کی کتابوں کو بھول کر

مجھ سے نہ دیکھتی۔ سارے دن انگلیش کی دوسری اُلا جلاکتا میں بڑھے جاتی۔ ان کتابوں کو پڑھ کر میرا دماغ اور بھی خراب ہو رہا تھا۔ رات بھر ٹھٹھل چل کر نہیں لکھی جاتیں اور دن بھر بلینگ پر اوندھی لیٹی ایڈیٹروں کے تعریفی خطوط پڑھے جاتی تھیں۔ اماں کہتی تھیں کہ میری صورت پر ٹھیکرے برسے لگے ہیں۔ سر پر کا ہوش نہیں رہا۔ یہ شہرت جانے کب اور کہاں سے نکل کر میرے ساتھ چلنے لگی تھی میں چونکی تو ہر سالے کا ایڈیٹر کہہ رہا تھا کہ آپ کی نظم نہیں آئے گی تو ہمارا سالہ مکمل نہ ہو گا۔

ڈاکٹر آنا تھا تو اپنے جھولے کے آدھے خط ہماری کمر کی میں پھینک جاتا تھا۔ پھر اماں بڑی کاہلی سے اُٹھتیں اور سوپ میں خط بتور کے میرے ہانگ پر اٹھیل دیتیں۔ ”لو بتو، تمہاری ڈاک آگئی۔ بیکار خط سوپ میں ڈال دیا مجھے پوچھا جلاتا ہے۔“

تب مجھے خیال آتا کہ تمہاری کمائی سے ہنڈیا چولے پر رکھی جاتی ہے اور میری کمائی سے چولہا سلگتا ہے۔

آپا ہمارے دو لہا کا انتظار کرتے کرتے قبر میں جا سوتے تھے۔ اماں بھی ہمارے بوجھ سے تھکی جا رہی تھیں۔ انہیں دل دھڑکنے کی بیماری ہو گئی تھی۔ اب گھر کی کیسوں بار تھو تھیں۔ اور نمونہ آنکھوں میں کیسی چمک تھی! اس کی چال میں کتنی خود اعتمادی تھی! اس کے سیاہ رنگ میں سُرخ جھلکتی اور وہ ہر وقت چنے جاتی تھی۔ بعض اوقات میں جھنجھلا کے سو رہتی کہ کون سا تار دن کا خزانہ ہنڈی لگ گیا ہے اس لڑکی کو؟

پھر آماں نے ایک دن پچہنٹو کے ہاتھ تاروں کا خزانہ لگ جانے کی خوشخبری سنائی۔ اس کا پیغام آیا تھا۔ لڑکا نمٹو کے کالج میں لیکچرار تھا اور نمٹو کو بہت چاہتا تھا۔ یہ سن کر میں بھی بہت ہنسی — میری پیاری بہن آخر تجھے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی نا! آج مجھے بھی تاروں کا خزانہ مل گیا تھا۔ گھر آماں ہمیشہ کی جگہ میرے قہقروں کو روک کر سنا نا شروع کر دیا۔ ”نمٹو شادی سے انکار کر رہی ہے۔ کتنی ہے میں تم دونوں کو کس مسارے چھوڑوں!“

شام کو نمٹو کالج سے آئی تو کہنے لگی: ”بھیا، آپ کا پتنگ کتنا جھلکا گا ہر گیارہ ذرا اٹھنے میں نواؤ کس دوں؟“

میں نے خود کیا — نمٹو ٹھیک کہتی ہے۔ میں نے لیٹے لیٹے اس گھر کے پتنگ توڑ ڈالے ہیں — پھر میں نے آماں سے کہا۔

”اس لیکچرار کا پیغام نہیں روکیا جائے گا۔ نمٹو کوئی خدا ہے کہ ہمیں پالے گی! میں کسی اسکول میں ملازمت کروں گی۔ اس پر نمٹو بہت روئی چلائی۔ وہ کہتی تھی: ”بھیا آپ نوکری نہیں کر سکتیں۔ آپ کی شاعری کا موڈ آف ہو جائے گا اور آپ شاعری نہ کریں گی تو مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ لوگ کیا کہیں گے....؟“

لوگ — لوگ — ! ان لوگوں کے لئے ہم نے کیا کیا نہ کیا۔ پھر بھی ہم ان کے خوف سے مرے جاتے تھے۔ یہ لوگوں کا خوف ہی تو تھا جو اتنی شہرت نے مجھے پاگل نہ ہونے دیا۔ مالا لگے مجھے ہرکانے والوں کی کمی نہ تھی۔ اپنے بوس میں تو ایک عورت کا نام ہی لکھنے والے مریدوں کو رومانی بنا دیتا ہے اور اگر اس نام کے آس پاس شہرت کی چمک دکھ ہو تو ہزاروں دیوانے مر جھٹنے کا

تہیہ کر ڈلتے ہیں۔ اب مجھے اپنی ڈاک دیکھ کر چاندی یاد آتی تھیں۔ اب انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا، اور تیسرے شوہر سے بھی طلاق لے کر شنا ہے، پنجاب کے کسی گاؤں میں گننامی کی زندگی گزار رہی تھیں۔

میرے آگے بھی دنیا بہت بڑی تھی۔ ادب بھی پھیل جاتی اگر کل برہنہ سے میرا راستہ نہ بند کر دیتا۔

اُن دنوں میں بڑی میلکی اور اعتماد کے ساتھ دوسرے شہروں کے مشاعروں میں جاتی تھی، نشے میں چوڑا ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے شہروں کے ساتھ راتوں کو سڑکوں پر چلتے وقت مجھے ڈراؤ نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ ہر جگہ دھچکی دھچکی لگاؤں میں میری نگرانی کرتی تھیں۔ ہر وقت ایک سایہ میرے پیچھے پیچھے چلتا تھا جیسے میں کسی کی بناء میں ہوں۔ میرے راستے کے سوائے خنجر کوئی آگے سے بٹانا جاتا تھا۔ میرے یوں آزاد گھومنے پر اتان کو سخت اعتراض تھا۔ تو بھی اظہارِ ناپسندیدگی کے طور پر دروازہ کھولنے کے بعد یہ جنانا نہ بھولتی کہ اب رات کے دو بجے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے میری فیکوں پر بات کرنا چھوڑ دی۔ میری ڈاک سے اسے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ جن رسالوں میں میری نظمیں چھپتی تھیں انہیں اپنی میز سے اٹھا کر میرے پتنگ پر ڈال دیتی تھی، البتہ اس کا خلوص کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

”بجیا، آج آپ کے لئے ایک ہینڈلوم ساڑھی لائی ہوں۔“

”بجیا کے لئے ایک گھڑی خریدتا ہے۔“

کھانے کے وقت بھی وہ خوب شور مچاتی۔

”بھیا اتنا دماغی کام کرتی ہیں، ااں، آپ انہیں روزِ گوشت کا سبب پوچھنے میرے لئے وال کافی ہے۔“

”تب میں سوچتی، نمونہ کیسی ڈیپو میٹ ہے، وہ کتنی کمزری کھڑی ٹٹا کر فوڈ سے درخواست کر رہی ہے کہ میں اس گھر سے پہلے جاؤں۔“

میں اپنی شاعری کے پتنگہ لگا کر آسمانوں پر اڑتی رہی۔ اور نمونہ نے کتنی مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم دھرتی پر جما لئے تھے۔ ہم دونوں نے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کیا تھا۔ مگر میں کتنی غلط راہ پر چل پڑی۔ کانٹوں اور پتھروں نے میرے سارے ارادے لہو لہان کر دیئے تھے۔

بعض وقت نمونہ، ہنس کر کہتی ”بھیا، آپ بغیر سوچے سمجھے جانے کیسے ہر کام شروع کر دیتی ہیں۔“

نمونہ کی یہ بات میرے دل میں اُتر جاتی۔ واقعی میں جانے کیسے ہر بات سوچے سمجھے بغیر کر بیٹھتی ہوں۔ اب اسی بات کو لے لے۔

کسی طرح یاد نہیں آتا کہ مکمل سے میں نے اپنا جُلنا کب اور کیوں شروع کیا تھا۔ حالانکہ وہ ہندی کا بہت مشہور افسانہ نگار تھا اور ہندی والوں سے ہم اردو کے شاعروں کی ویسے بھی کب بنتی ہے؟ پھر مکمل تو یوں بھی بڑا کا جھگڑا ہوتا تھا، ویسے اور کوئی خوبی بھی نہ تھی اس میں۔ پانچ بچوں کا باپ، بیمار اور چڑچڑی بیوی کا تابع وار خدو بہر۔ سو کھٹا چرخ۔ کسی اخبار کے آفس میں ہزار ڈیڑھ ہزار کا ملازم تھا۔ مگر جانے یہ کیسے ہونے لگا کہ میں جس مشاعرے سے واپس آتی وہ میرے ساتھ ہوتا۔ مٹرک پر چلتے چلتے مجھے جب بھی اس کا

خیال آتا وہ میرے سامنے کھڑا ہوتا۔ میں ڈائس پر جاتی تو وہ سب کے سامنے بیٹھا مجھے دیکھنے جاتا تھا۔ میں اتر کے نیچے آئی تو وہ آگے بڑھتا۔

آؤہ آج تو آپ نے ہمیں ہلا ڈالا۔ ذرا اپنے گلے کی رفتار روکئے تھرمزورڈ اس شر کے سارے شاعر اپنا منہ کالا کر کے فرار ہو جائیں گے۔

پھر اس نے مجھے ایک خط لکھا بہت ہی صندب سا۔ یہی کہ میری نظموں نے اسے بہت متاثر کیا ہے۔

یہ خط مجھے بڑا بے ضرر سا لگا۔ اس کی کچھ طلب کرتی ہوئی چاروں طرف راستہ گھیرتی ہوئی آنکھوں سے زیادہ سکون بخش۔

دیے بھی مجھے اطمینان رہتا تھا کہ کبھی کوئی ایسا آدمی میری طرف نہیں بڑھ سکے گا۔ جس نے مجھے قریب سے دیکھا ہو جو میری فضول سی صورت بے ڈھنگیوں اور سطحی قسم کی باتوں سے واقف ہو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ منجھاس ادبی حلقوں میں کبھی میری بہت افزائی نہیں ہوئی۔

کمل کے خط پڑھتے گئے چند دن بعد تو یہ نامکمل سا ہو گیا کہ اس کا روز ایک خط نہ آجائے۔ مجھے اپنی ہر نظم اسی طرح یاد ہے کہ کمل نے اس کے بارے میں کیا لکھا تھا۔ وہ جہاں ہوتا۔ جس موڑ میں ہوتا مجھے روز ایک خط لکھا کرتا تھا۔ چاہے آفس کے کسی کام سے کشمیر جائے بچے کے ساتھ ہسپتال میں جو بیوی کے میکے میں جو یا کسی ادبی محفل میں۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خط لکھ جاتا تھا۔ کوئی شہنا تو کبھی یقین نہ کرتا کہ میں نے ان محبت اور شہنشاہی سے سب پریشوں کا ایک بار بھی جواب نہیں دیا۔ ہم دونوں میں ایک خاموشی سا سمجھوتہ ہو چکا

تھا کہ وہ جو جی میں آئے مجھے لکھے جائے گا۔ اور میں صرف ثنا کروں گی۔

مگر وہ کب تک محتاط بنا رہتا! اس نے پہلے اپنے غلوں کو حقیقت میں بدل دیا۔ پھر محبت میں اور پھر بلا گل پن میں اور جتنے اس کے خطا بڑھنے گئے اتنا ہی وہ خود بہت کم مانتا تھا۔ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی کہیں کہیں نظر بھی آجاتا تو بڑا اجنبی بن کر بڑے تکلف کے ساتھ بات کرتا۔

ایک دن آخر کل مل ہی گیا۔

ایک بہت بڑا آل انڈیا مشاعرہ تھا۔ ہندی والے بھی اس کے لئے مالی مدد کر رہے تھے۔ مشاعرہ شروع ہونے میں کچھ ہی دیر تھی۔ لوگ ہاہر گیری میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کل کو اکیلا دیکھ کر میں اس کے پاس چلی گئی۔ اسے ساتھ لئے جان بوجھ کر اس طرف بڑھنے لگی۔ جہاں کوئی نہیں تھا، جہاں درختوں کی آڑ میں اندھیرا سا کروا تھا۔

”مجھے بتاؤ کل میں نے آج تک تمہارے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ پھر

تم مجھ سے اس کی شکایت کیوں نہیں کرتے؟“

”کیونکہ مجھے تمہارے جواب کا انتظار نہیں ہے۔“ اس نے سنبھل سنبھل کر کہا۔

اس وقت ہمارے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو شبہ بھی نہ ہوا ہو گا کہ اس وقت ہم دونوں کیسے بھنور میں گھرے چپکولے کھا رہے ہیں۔

”تم اتنے اُدھے آدوش رکھتی ہو۔ اتنی جہاں کھلا کار ہو اور پھر تم ابھی

صرف بیس برس کی ہو۔ تمہارے لئے دنیا بھر بھیلانے کھڑی ہے۔ عزت و دولت شہرت ہر چیز تمہاری منتظر ہے۔ میں تمہاری راہ کیوں کھوٹی کروں۔ میں تو ایک غریب

آمدنی ہوں۔ بیوی بچوں والا۔ چالیس برس کا بوڑھا۔ اب میرے جیون کا صرف ایک ہی مصروف ہے کہ اپنی ہر ذمہ داری کو پورا کرتا رہوں مگر۔۔۔ مگر پھر بھی میں تمہارا مسنون ہوں کہ تم نے میری کسی بات کا بُرا نہ مانا۔ مجھے اپنی تنہائی کے صحرا میں کیا گلاب ہکانے کی اجازت دے دی میں نے تمہاری بدولت جان لیا کہ کسی کے لئے اپنی ذات کو بھلا دینے کا شکہ کیسا ہوتا ہے۔۔۔۔۔“

وہ جانے کیا کیا کسے جا رہا تھا۔ مگر مجھ سے تو اس نے ایک لمحہ میں ہر سچے کھین لیا تھا۔ اس خود غرض انسان نے جو میری بہار کی ساری ادھ کھلی کھیاں اجاڑ کر اپنے من میں گلاب ہکا رہا تھا۔

اگر اس وقت میرے قریب ایک لگائی بھگائی کرنے والا چنل خورد شاعر نہ کھڑا ہوتا تو شاید میں کل کی باتوں میں جا گرتی۔ شاید زور زور سے رونے لگتی۔ نہ تو کہنتی تھی ”بیبا، آپ ہر بات سوچے سمجھے بغیر کیسے کر ڈالتی ہیں؟“ مگر اس روز میں کتنی مصلحت پسند تھی! اگر اس دن میں ان باتوں پر غور نہ کرتی تو شاید وہ دن کہیں نہ آتا جب مجھے کل کے ہر خط کے ساتھ اپنی ایک نظم جلاتا پڑی تھی۔ اور جب سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا تھا تب میں نے سوچا کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو اس راکھ کا انتساب کل کے نام کرتی۔

لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکی تھی۔ بلکہ مدد مشاعرہ کو آتے دیکھ کر میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ انہیں سلام کیا تھا۔

”اب کیسے ہیں آپ!“ یہ بات میں نے پاس سے گزرتے ہوئے کسی شاعر سے کہی تھی یا کل سے! خون میرے کانوں میں سنسنار رہا تھا۔ اور میں گرنے سے

پہلے کسی سہارے کو تھامنا چاہتی تھی یہ پہلو۔ تم اب گھر واپس چلی جاؤ۔ اپنے گھر جاؤ۔ ” کل مجھے تمام کر کہہ رہا تھا۔ ” نہیں گھر میں بھی جگہ نہیں رہی۔ کہیں بھی جگہ نہیں ہے۔ ” پھر کل مجھے رکشائیں بٹھا کر گھر لایا۔

جب مجھے ہوش آیا تو اتاں مجھے موسمی کارس پلا رہی تھیں کھل سا مٹے کرسی پر بیٹھا تھا اور تم اس سے کہہ رہی تھی: ” آپ ٹھیک کہتے ہیں کل بھائی بیٹا تو بچیا کے بھی کئی ہیں۔ مگر بچیا بیاہ کے لئے راضی ہی نہیں ہوتیں۔ اللہ جانے کس کا انتظار کر رہی ہیں۔ ”

” ایک لڑکا تو سیکریٹری ایٹ ہیں تین سو کا نوکر ہے۔ ” اتاں نے فوراً تفصیل شروع کر دی۔

” وہ خود ہی شاعر ہے، مٹا ہے مولانا بٹل بلگرامی کا شاگرد ہے، چائے، سنگریٹ، شراب کچھ نہیں پیتا۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے۔ ”
” مگر بچیا۔ بچیا کا موڈ۔ بچیا کی پسند۔ تو میری طرف دیکھو دیکھ کر گھورتی جا رہی تھی۔

” بس بس بہت ہو چکا تمہاری بچیا کا لاڈ۔ ” اتاں نے غصے میں نگو کی بات کاٹی۔ ” جانے کیوں اللہ میاں نے اس کا داغ ہی اوندھا کر دیا ہے جب ہی تو ایسی حالت ہو گئی۔ اب میں کچھ نہ سوچوں گی۔ کھل صاحب، آپ اپنی عورتوں پہنوں کا ساتھ ساتھ بیاہ کر دیجئے، بتائیے بھلا میں کسی مرد کے بغیر ان دونوں کے فرض سے کیسے سبکدوش ہوں گی؟ ”

” وہ تو ٹھیک ہے، میں سب کچھ کروں گا۔ آئندہ آپ کو میرا فرض یاد دلانے

کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اماں! مکمل جان بوجھ کر میری طرف نہیں دیکھتا تھا۔ مگر ان کا جیون ساتھی کوئی آرگسٹ ہونا چاہئے۔ بڑے لطیف ذوق والا، بڑے حوصلے والا۔ جو انہیں سنبھالے رہے۔ ان کی شاعری کی رفتار مدغم نہ پڑ جائے، ورنہ عام لکھنے والیوں کی طرح کہیں گھر داری میں گھر کے..... کہیں... کہیں...“

”بس بس رہنے دیجئے۔“ میں نے جھجلا کے کہا: ”شراب سگریٹ چاہتے کچھ نہیں پیتا۔ تین سو روپے کماتا ہے اور کیا چاہیے مجھے۔ اماں تم تم کو کے بیاء کی تیاری کرو۔ اب تاراج مقرر کرو۔“

پھر میں نے سوچا کہ جانے میرے لئے اس پیغام کو ڈھونڈنے کے لئے تمہو نے کتنی جدوجہد کی ہوگی۔ میں کب تک اس گھر میں بیٹھی رہوں گی۔ کوئی تحسید لے رکھا ہے۔ تمہو نے میرا، تمہو کو کتنا ارمان ہے دامن بننے کا ہم دونوں بہنوں کو بٹھایا گیا تو اچانک تمہیں پڑی۔ اس نے اپنا گھر نکلت ہٹا کے مجھے دیکھا اور آہستہ سے بولی بجیا آج مجھے بڑی ہنسی آرہی ہے۔“

”تو ہنسنا۔“

”مگر آپ۔ آپ۔“ میرے چہرے پر جانے کیا دیکھ کر گھبرا گئی؟

”ہاں مجھے بھی ہنسی آرہی ہے تمہو۔ آج تو جی چاہتا ہے۔ دنیا کی ہر

بات پر ہنسوں ہر چیز کا مذاق اڑاؤں؟“

”.... تم جب وہ بنو گی، میں اس وقت بہت دُور بیٹھا تمہیں دیکھ رہا ہوں گا۔

جائے تمہارا دل لہا اس خوبصورتی کو دیکھنے کی تاب کہاں سے لائے گا

آج تمہارے چہرے پر کتنے خوبصورت خوابوں کا اُجالا ہو گا؟

”اس لمحے جب تم ادب، شاعری اور میری بکواس سے پرے — کسی پر اپنا تن من بچھا دو کر رہی ہو گی تو تمہیں کہاں یاد آئے گا کہ کوئی تمہیں اپنی روح کی گرائیوں کے ساتھ مبارک باد دے رہا ہے۔“

”آج تمہارے شکم کا گلاب تمہارے دولہا کے چہرے پر کھلنے والا ہے۔“

”اب میں تمہیں کبھی خط نہ لکھوں گا۔ بس ہر نئی نظم میں

تمہاری کامرائیوں کی خبریں سن لیا کروں گا۔“

جلتی ہوئی روٹی کو جدی سے راکھ میں چھپا کر میں سوچتی ہوں کہ میں نے اپنی کامرائیوں کی کوئی خبر کبھی نہ بھیجی۔

یہ کیسی اچھی بات ہے کہ میری بہار کا آخری گلاب ابھی تک نہیں مڑھایا۔

کہیں میرا ایک خوب صورت سا ہنستے گلاب جیسا خیال زندہ ہے کسل میں چھپا ہوا۔

”بانو“ وہی

وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے

پھر سی ہوا کہ یا جوج ماجوج رات بھر دیوار کو چاٹا کرتے۔ یہاں تک کہ دیوار تحلیل ہوتے ہوتے انڈے کے چھلکے کی مانند ہو گئی اور پھر ماجوج ماجوج خشک گئے اور انہیں نیند آنے لگی اور وہ یہ کہہ کر سو گئے کہ باقی دیوار صبح کو چائیں گے۔ مگر جب وہ صبح کو اٹھے تو دیوار بھر اُدھنی اور سوئی ہو گئی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ پھر اپنی کوتاہی پر کھپتے۔ اور انہوں نے پھر یہ عزم باندھا کہ آج تو ہم دیوار چاٹ کر ہی دم لیں گے۔ سو جب شام ہوئی تو پھر وہ اپنی لمبی لمبی زبانیں نکال کر دیوار کو چاٹنے لگے۔ چاٹتے رہے چاٹتے رہے۔ یہاں تک کہ رات کا کجرا پھیلنے لگا اور دیوار انڈے کے چھلکے کی مثال رہ گئی مگر ماجوج ماجوج اب خشک کر چور ہو گئے تھے اور زبان ایٹھٹھنے لگی تھی اور پوٹے نیند سے بوجھل ہو رہے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ سید سکندری کو ہم نے واقعی چاٹ لیا ہے۔ دم کے لئے سولیں۔ پھر تازہ دم ہو جائیں گے اور دوزبانیں پھیر کر اس کا ستر اٹھ کر دیں گے۔ سو ماجوج نے ایک کان ٹیچے بھجایا اور دوسرا کان اُڑھ کر سو گیا۔ ماجوج نے

بھی اپنا ایک کان نیچے بچھا یا اور دوسرا کان اڑھ کر سو گیا۔

یاجوج ماجوج صبح کو سوکڑا مٹھے تو انھوں نے دیکھا کہ دیوار تو پھر پہاڑ کی مثل ان کے سروں پر کھڑی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ ایسے ڈھے گئے جیسے ہر سات میں کبھی دیوار ڈھے جاتی ہے۔ یاجوج نے بہت دُکھ کے ساتھ یاجوج سے کہا کہ ”اے یاجوج! کیا ہمارے عمل کا کوئی حاصل نہیں ہے؟“

یاجوج ڈھکی آواز میں بولا کہ ”شاید ہماری تقدیر ہی یہ ہے کہ روز رات کو دیوار چٹا کرے اور روز صبح کو دیوار کو وگراں کی طرح ہمارے سروں پر کھڑی ہو جائیگا۔ اس پر یاجوج مایوس ہو کر بولا کہ ”اگر میں بات ہے تو دیوار کو ہم چٹا کئے تو کیا اور نہ چٹا کیا تو کیا۔ پس قبل اس کے کہ وقت ہمیں چاٹ لے ہمیں چاہیے کہ دیوار کی طرف پشت کریں اور تھوڑا زندگی کو چھکیں۔“

تب قوم یاجوج ماجوج کا وہ بوڑھا جواب اپنی عمر کے ہزاروں سال میں تھا۔ پہاڑ کی کموہ سے نکل کر باہر آیا اور بولا کہ ”اے یاجوج ماجوج ہر شے کے ایک معنی ہیں اور ہر عمل کا ایک حاصل ہے۔ کوئی دیوار ایسی نہیں کہ سدا کھڑی رہے۔ ڈھینا دیوار کا اور چٹا زبان کا مقدر ہے۔ اور میں نے تمہارے باپ یا نٹ سے اور تمہارے باپ یا نٹ نے اپنے باپ فوش سے یہ سنا ہے کہ اولاد ان کی مذہب سیکھ کر کو ایسے چاٹ لے گی جیسے دن رات کو چاٹ لیتا ہے۔ پھر وہ آزاد ہو کر کھلے میدانوں اور ساداب سبزہ زاروں میں پھیل جائے گی اور وہ زبانیں جو پتھر جاتی تھیں۔ خیر جن چشموں تک پہنچیں گی۔ پہلے قوم یاجوج ماجوج کا اگلا گروہ طبرستان کے ٹھنڈے پیٹھے چشمے تک پہنچے گا اور وہ اتنا پیاسا ہو گا کہ چشمے کا سارا پانی

پنی جائے گا۔ جب بھلا گروہ دلوں پہنچے گا تو خشک چشے کو دیکھ کر کہے گا کہ شاید یہاں آگے کبھی پانی تھا۔

بوڑھا تو واپس پہاڑ کی کھوہ میں چلا گیا مگر اس کی بات ماجوج کے بیٹے نے سن لی تھی اور اس نے اپنے پہاڑ میں جا کر آل ماجوج کو جمع کیا اور سوال ڈالا کہ اُسے آل ماجوج کیا ختم سید سکندری کے ٹوٹ جانے پر بھی پیچھے رہ جانے والوں میں رہو گے؟

آل ماجوج نے پوچھا کہ تو نے کیا دیکھا جو ایسا سوال زبان پر لایا؟ ماجوج کا بیٹا بولا کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ آل ماجوج نے سرسبز پہاڑ پر قبضہ کر رکھا ہے اور ہمارے حصے میں بھرپور آلی ہے۔ وہ پیٹ بھر کر تل کھاتے ہیں جبکہ ہم پتھر چاٹ کر میٹ پالتے ہیں۔ اب جبکہ سید سکندری ٹوٹنے کو ہے تو میں نے قوم کے بزرگ سے یہ سنا ہے کہ جو گروہ اس قیدی سکندری سے پہلے نکلے گا۔ وہ طبرستان کے خنیریں چشے پر پہلے پہنچے گا اور سیراب ہو گا۔ جو گروہ بعد میں نکلے گا وہ چشے پر بعد میں پہنچے گا اور اسے خشک پائے گا تو اے ماجوج کے محرم بیٹو! کیا تم اس قید سے رہائی کے بعد بھی پیچھے رہ جانے والوں میں رہو گے؟

یہ کلام سن کر آل ماجوج نے تاد کھایا اور بیخ کر کہا کہ اپنے باپ ماجوج کی اس لمبی زبان کے دم سے جو سید سکندری کو پاٹ کر پوست بھیڑنا دیتی ہے ہم پیچھے رہ جانے والوں میں نہیں رہیں گے اور تشنہ لبوں میں شمار نہیں ہوں گے۔ اور صراحتاً ماجوج کو بھی یہ خبر مل چکی تھی کہ سید سکندری اب ڈھینے والی ہے۔ اور آل ماجوج سب سے پہلے نکل کر طبرستان کے چشے سے سیراب ہونے کے

لئے کمر باندھ رہی ہے۔ آل یا جوج نے یہ سُن کر غصہ کیا کہ ماجوج کی آل نے ابھی سچے چشموں پر قبضہ کرنے اور سبزہ زاروں پر چھاپانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ اُنھوں نے غصہ کیا اور اعلان کیا کہ ہم ان میں سے نہیں ہوں گے جو پیچھے رہ جاتے ہیں اور سوکھے چشمے سے نکل کر چلتے ہیں سو ابھی رات باقی تھی وہ اپنے پہاڑ سے نکلے اور دیوار کی سمت چلے۔ مگر اُدھر ماجوج کے بیٹے پرتے بھی اپنے پہاڑ سے نکل پڑے تھے اور آل یا جوج سے پہلے دیوار تک پہنچ جانا چاہتے تھے۔

رات کے اندھیرے میں یا جوج کے بیٹوں نے ماجوج کے بیٹوں کا راستہ کاٹا۔ اور ماجوج کے بیٹوں نے لپک کر یا جوج کے بیٹوں کو جا لیا تب ماجوج کے بیٹے ماجوج کے بیٹوں سے اُلجھے اور ماجوج کے بیٹوں نے یا جوج کے بیٹوں کو لٹکایا۔ وہ آپس میں لڑتے مارتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور اُنھوں نے دیکھا کہ ماجوج ماجوج سوئے پڑے ہیں اور سید سکندری بھراؤ پچی اور موٹی ہو گئی ہے۔ یہ دیکھ کر اُنھوں نے اپنی راہ لی اور واپس اپنے پہاڑوں میں چلے گئے۔

جب پہاڑ سا دن کٹ گیا اور رات نے ڈیرہ کیا، تب ماجوج ماجوج نے پھر اپنی زبانیں تیز کیں اور دیوار چاشنی شروع کر دی اور ابھی رات باقی تھی کہ دیوار کے ڈھلے جانے کی امید لے کر اُدھر شیریں چشمے سے سیرابی کا تصور باندھ کر آل یا جوج اپنے پہاڑ سے نکلے اور آل ماجوج اپنے پہاڑ سے ہمارا جوی۔ اُنھوں نے بھوکا بھوکا کارستہ کاٹا اور پھر آپس میں دست دگریاں جوئے۔

ماجوج ماجوج کے بیٹے رات بھر آپس میں لڑاؤ کر کے اور خونم خون ہو گئے۔

جب تڑکا ہوا تو انہوں نے یہ دیکھا کہ یا جوج یا جوج سو گئے ہیں اور دیوار پھر سپاڑ کی طرح بلند اور سنگین ہو گئی ہے۔ یہ دیکھ کر دبیز آدمے انہوں نے اپنا اپنا رستہ پکڑا اور واپس اپنے اپنے سپاڑوں کو پہلے۔

دن پھر کسی نہ کسی طور کٹ گیا اور رات پھر لگئی مگر آج آل یا جوج یہ تہیہ کر کے نکلی تھی کہ روز بروز کا خر خستہ ختم کر دے اور رستے کا لانا نکل چسکیو۔ تو انہوں نے بنے خجری میں آل یا جوج کو جالیا اور ان کے سپاڑ سے نکلنے سے پہلے ان پر طہ بول دیا۔ انہوں نے ان کے گھروں کو لوٹا، جوانوں کو قتل کیا اور عورتوں کو بے عزت کیا۔ یہ قیامت دیکھ کر یا جوج کی بیٹی اپنے خیمے سے نکلی اور یا جوج کے بیٹوں سے مخاطب ہوئی کہ اے مرے دادا کے بیٹے کے بیٹو! کیا تم ہم میں سے نہیں ہو اور ہم تم میں سے نہیں ہیں کہ تم ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو؟

یا جوج کے بیٹے نے یہ سن کر تازہ کھایا اور کہا کہ اے یا جوج کی بیٹی ہم تم میں سے کیونکر ہو سکتے ہیں اور تم ہم میں سے کیسے ہو جبکہ ہم یا جوج کی اولاد میں اور اپنے سپاڑ میں رہتے ہیں۔ اور تم یا جوج کی اولاد ہو اور اپنے سپاڑ میں آباد ہو۔ یا جوج کی بیٹی یہ سن کر چلائی اور بولی کہ اے مرے دادا کے بیٹے کے بیٹے! کیا تم اس سے انکار کرے گا کہ یا جوج یا جوج ایک باپ سے پیدا ہوئے اور ایک اس کی گود میں پلے؟

یا جوج کا بیٹا تھن انداز میں بولا کہ اے یا جوج کی بیٹی! میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ ہم یا جوج کے بیٹے تو ہم یا جوج میں اور اپنے سپاڑ سے پہلے جلتے ہیں۔ یا جوج کے بیٹوں نے یہ سن کر بہن کو پیچھے دھکیلا اور ادنیٰ آواز میں کہا کہ

”ہم ماجوج کے بیٹے فریم ماجوج ہیں اور اپنے پہاڑ سے پہچانے جاتے ہیں۔“
اور پھر آل ماجوج نے آل ماجوج پر اور آل ماجوج نے آل ماجوج پر طرہ بولا۔
ماجوج کی اولاد نے ماجوج کی اولاد کے خون میں اور ماجوج کی اولاد نے ماجوج
کی اولاد کے خون میں ہاتھ رنگے؟

صبح ہوئے پر ماجوج کی بیٹیوں نے جسموں پر ثاٹ باندھے، بال پریشان کئے
اور برصہ پانا کہناں ماجوج کے پاس پہنچیں اور چلائیں کہ ”اے ہمارے باپ،
تو گریہ کر کہ تیرے بھائی کے بیٹوں کے ہاتھوں ہمارے گھر برباد ہوئے، ہمارے سہا
اُجڑے اور ہمارے ماں جاییوں کے خون سے ہماری زمین لالہ زار ہو گئی۔“

ماجوج نے اپنی آل کا یہ حال دیکھا اور ماجوج کے پاس جا کر بولا کہ ”اے
ماجوج تیرے بیٹوں نے میرے بیٹوں کو تہ تیغ کیا اور میری بیٹوں کو دسوا کیا۔“

ماجوج یہ سن کر لال پلایا ہوا اور بولا کہ ”اے ماجوج تیرے فرزند اب میں سے
ہیں جو شیریں چشموں سے سیراب ہونا چاہتے ہیں اور دوسروں کو پیسا رکھنے
کے در پے ہیں؟“

ماجوج ماجوج میں ٹکرا رہے تھے لگی اور بات مڑتی ہی چلی گئی۔ ماجوج نے
طیش لکھایا اور کہا کہ جو زبان ستر سکندری کو چاٹ کر انڈے کے چھلکے کی مثال
بنادیتی ہے وہ ماجوج کو کبھی چاٹ سکتی ہے۔ ماجوج پھینپھنایا اور بولا کہ ماجوج کی
زبان چاٹنے میں ماجوج کی زبان سے زیادہ چیز ہے۔

بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ شام ہوئے پر ماجوج ماجوج نے اپنی اپنی
زبانیں نکالیں اور ستر سکندری کو چاٹنے کی بجائے عالم غیظ میں ایک دوسرے کو

چاٹنے لگے۔ وہ رات بھر ایک دوسرے کو چاٹتے رہے حتیٰ کہ یا جوج یا جوج کے چاٹنے سے، اور یا جوج یا جوج کے چاٹنے سے انڈے کے پھلکے کی مثال رہ گیا۔ یا جوج نے دل میں سوچا کہ اب یا جوج میں رہ ہی کیا گیا ہے۔ اب سوئے جاتا ہوں۔ صبح اُٹھ کر ایک زبان مادریں گا اور یا جوج کو چاٹ جاؤں گا۔ سو اس نے اپنا ایک کان بچھا یا اور دوسرا کان اوڑھ سو گیا یا جوج نے بھی دل میں یہی کہا کہ یا جوج کے نام کا تو اب ایک پھلکارہ گیا ہے۔ تھوڑا آرام کر لوں۔ صبح اُٹھ کر ایک زبان بھیریوں گا اور اسے صفا چٹ کر جاؤں گا سو وہ بھی ایک کان نیچے بچھا دوسرا کان اوپر سے لے پڑ رہا۔

جب یا جوج یا جوج سو کر اُٹھے تو یا جوج نے یا جوج کو اور یا جوج نے یا جوج کو نازہ دم پایا اور حیران ہوئے۔ پھر یا جوج کے پاس آل یا جوج اور یا جوج کے پاس آل یا جوج نالہ و شیون کرتی پہنچی کہ رات بھر آل یا جوج نے آل یا جوج کا آل یا جوج نے آل یا جوج کا خون بہا یا تھا۔ تب پھر یا جوج نے یا جوج برداشت کر لیا اور کہا کہ میں تجھے ادنیٰ آلی کو یوں چاٹوں گا جیسے ستر سکندی کو چاٹا ہوں۔ اور یا جوج نے یا جوج پر زبان تیزی اور جھلکا کر میں ستر سکندی کو بعد میں ادنیٰ آلی کو پہلے چاٹوں گا۔ اور شام پڑے سے وہ پھر ایک دوسرے کو چاٹنے لگے اور چاٹتے ہی چلے گئے حتیٰ کہ دونوں انڈے کے پھلکے کی مثال رہ گئے۔ مگر اب ان کی زبانیں دہشتہ چلی تھیں اور آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ یا جوج نے طے کیا کہ یا جوج بوند برابر تو باقی رہ گیا ہے۔ آنا سچ کر چاٹ لوں گا۔ سو وہ اپنا ایک کان نیچے ڈال دوسرا کان اوپر تان سو گیا۔

ماہوج نے بھی یہی سوچا کہ باقی ماندہ یاہوج کو صبح چاٹ کر ختم کر دوں گا۔ وہ بھی ایک کان کو گتہا بنا کر اور دوسرے کان کو محاف کی طرح اوڑھ کر سو گیا۔

صبح جب یاہوج کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے کان کے اندر سے جھانک کر ماہوج کو دیکھا اور اسے تازہ دم دیکھ کر متحیر ہوا۔ پوچھا کہ اسے ماہوج کیا میں نے تجھے چاٹ نہیں لیا تھا؟ ماہوج خود اسے خندہ مست دیکھ کر متعجب تھا۔ پوچھنے لگا۔ ”گمراہ یاہوج میں نے تجھے کیا چاٹ نہیں لیا تھا؟“ اور پھر دونوں کی آل، خونم خون اپنے اپنے بزرگ کے پاس پہنچی اور فریادی ہوئی۔ یاہوج ماہوج اپنی اپنی اولاد کی فریاد سن کر پھر ایک دوسرے پر غراتے پھر ان کی لمبی لمبی زبانیں ان کے منہ سے یوں باہر نکلیں جیسے بانسی سے سانپ نکلتے ہیں۔

یاہوج ماہوج ایک دوسرے کی طرف زبان لہراتے تھے کہ بوڑھا دانشمند پھر اپنی کسوہ سے باہر نکل آیا۔ یاہوج ماہوج کو دیکھ کر اس نے افسوس کیا اور کہا کہ اے یاہوج ماہوج، تمہارا بڑا ہو کہ تم سیدہ سکندری کو تو نہ چاٹ سکے مگر ایک دوسرے کو پہنچ جائے لے رہے ہو۔

تب یاہوج نے اپنی آل کا مالٹا یا اور ماہوج نے اپنی آل کا تھم کیا۔ دونوں نے بوڑھے سے انصاف چاہا۔ بوڑھا دانشمند دونوں کی بات سن کر بولا کہ میں ہا جیل اور قہیل کے درمیان تو فیصلہ کر سکتا تھا کہ کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے کہ ان میں سے ایک قاتل تھا اور دوسرا مقتول تھا مگر یاہوج کے باب میں کیے فیصلہ کروں کہ میں یاہوج کی زبان کو ماہوج کے خون سے اور ماہوج کی زبان کو یاہوج کے خون سے لال دیکھتا ہوں ؟

وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے

یا جوج نے کہا کہ اے بزرگ، کیا تو چاہتا ہے کہ آلِ ماجوج طبرستان کے چشمے سے سیراب ہو، اور میری آلِ سوکھے چشمے کے کنکر پتھر چاٹے؟

ماجوج بولا کہ اے بزرگ، کیا تو یہ گوارا کرے گا کہ آلِ ماجوج طبرستان کا پورا چشمہ ڈکوس جائے اور میری آلِ تشنہ لب پھرے؟

بوڑھا بولا کہ طبرستان کا چشمہ کس نے دیکھا ہے۔ وہ تومہ سکندی کے اُس طرف ہے۔ اس چشمہ سے تو وہ سیراب ہو گا جو پہلے پتھر چاٹے گا کہ وہ بولہو چائے گا؟

تب ماجوج نے اعلان کیا کہ میں پہلے ماجوج کو چاٹ لوں، پھر سکندر کے کھڑے کئے ہوئے پتھر چاٹوں گا۔ ماجوج گر جا کہ میں ماجوج کو اس کے آنری بچے تک چاٹ لوں گا۔ پھر میں سہ سکندی کو چاٹوں گا اور اپنی آلِ کرے کرے طبرستان کے چشمے تک پہنچوں گا؟

بوڑھے نے انہیں افسوس کے ساتھ دیکھا اور کہا کہ چاہتا ماجوج ماجوج کی زبانوں کا مقدور ہے۔ وہ سہ سکندی کو نہیں چاٹیں گے تو اپنا لہو چاٹیں گے؟

اور ماجوج ماجوج اپنی لال لہو زبانوں کے ساتھ پھر آپس میں گھٹم گھٹا ہو گئے۔

بوڑھے دانش مند نے انہیں گھٹم گھٹا دیکھ کر بعد افسوس کہا کہ یافت کی اولاد ددمننا سانپ بن گئی کہ خود ہی کو ڈس رہی ہے؟ اور یہ کہہ کر وہ واپس اپنی کھوہ میں چلا گیا۔

یا جوج ماجوج اس اندھیاری رات میں ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے
رہے، پچھتے رہے۔ اُمنوں نے ایک دوسرے کو چاٹا، اتنا چاٹا کہ وہی میل
یا جوج ماجوج گھٹ کر انڈے کے چھلکے سے بھی کم رہ گئے۔

”قنوں“ لاہور

نیون سائنز

اور ہم نے سرا کی مسودہ اندھیری راتوں میں لارنس جانا چھوڑ دیا ہے۔ اور اس بات کا مجھے تعلق بھی بہت ہے۔

پوچھو! وہ کیوں؟

یوں کہ لارنس کی ٹھسری ہوئی کالی راتوں میں رات کی رانی کی آواز ہلک اور لانے لانے گنتے اور عمر رسیدہ درختوں کے ہیپ سائے بہت یاد آتے ہیں۔ گھسپ اندھیرے میں اُونچے درختوں اور بے چراغ لمبے پوستوں سے گھری پختہ سیاہ روش اور دور درختوں کے گنج میں سے ٹیم ٹم نظر آتی نرت مرادشاہ کے مزار کے دیوؤں کی روشنی بہت ہیبت زدہ کر دیا کرتی تھی۔ نامعلوم سہ ہشت کی ایک خشک اور جا دینے والی لہر سارے وجود میں دوڑ جایا کرتی تھی۔ اور خوف دوم ہشت انسان کے لئے گنتی اہم اور ضروری شے ہے۔ کہ انسان خوف زدہ نہ ہو تو بہت پھیلتا ہے اور آدمی سے آدمی ڈوب جاتا ہے۔

اور جب وہ ہمیشہ زندہ ہوتا ہے تو وہ سکڑتا — اور ایک دوسرے کے بہت قریب ہونا چاہتا ہے۔

ہاں تو ہم اپنی سانسوں اور آہٹوں سے ڈرتے ڈرتے جم خانے والی سڑک پر چلتے چلتے بنجباب کلب کی جانب آ نکلتے۔

کلب ہال کے شیشوں سے چین چین کر آتی روشنی اور سایوں کے سوا ایک آواز بھی نہ سنائی دیتی اور میں خوب معلوم ہوتا تھا کہ اندر ماشوں کی بازی اور دھکی کے پیگ پر بزنس پیکٹ طے ہو رہے ہونگے، لیکن دین کے معاملے اور غنیہ معاملے زور شور سے کتے جا رہے ہوں گے۔

دھکی کے ایک پیگ کے گردش میں آنے اور کسی عورت کے ادھر سے اُٹھ کر اُدھر بیٹھ جانے پر لاکھوں اور ہزاروں کے دارے نیارے ہو رہے ہوں گے۔ اور میں بھی خوب معلوم ہوتا تھا کہ اب لوگ شراب پی کر بدست نہیں ہوتے، بے خود ہونے کے بجائے اپنی بزنس کے سارے معاملے اسی عالم میں کرتے ہیں ناؤ اگر لوگ شراب پی کر بدست ہو جایا کرتے تو انھیں ایلن ایس ڈی ایجاؤ کرنا پڑتی۔ پھر میں اس سڑک پر آ کر خون مجھے لگتا اور ہر غلطیوں معلوم دیتا جیسے کوئی ابھی جھوٹا جھانٹا آپٹے گا۔ قدم تیز اُٹھتے، سانس تیز چلتی اور ہم سڑی میں تھکتی گاڑیوں میں بے آرامی سے سوئے ہوئے ڈرائیوروں کو دیکھتے، اور ان سے بھی ڈرتے جلد جلد قدم اٹھاتے اس گیٹ پر آ نکلتے جس کے عین مقابل آرٹ کو فصل کی عمارت ہے۔ اور جس کے ساتھ برگڈ کا گھنا اور تازہ بردست درخت ہے کہ اس کی جڑ نے بختہ اور شفاف سڑک کے ساتھ ساتھ فٹ پائتھ کو جا بجا سے شق کر دیا ہے اور

میں ہمیشہ اور ہر کام کے لئے فلاور باسکٹ مایس استعمال کرتی ہوں کہ اس کی تیلی لکڑی سے نہیں، مومیا کے ہوئے کاغذ سے تباہی جاتی ہے۔ اور میرے نزدیک لکڑی کو اٹک رکھا ناگوار ہے۔

لکڑی جو خود درخت ہوتی ہے، ابو برگ و بار لاتی ہے اور درخت جتنا پرانا ہوتا ہے اتنا ہی خاموش، پُر وقار اور صبران ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہیں انسان بھی پُر وقار اور صبران ہوا کرتا تھا۔

ہاں تو پھر کیا ہوا۔ ایک دم ہی داستانی انداز پھر لے پر غالب آ گیا تھا۔ ایک رات یوں ہوا۔

ایک سرے پر برگ کا درخت تھا اور دوسری طرف وکٹوریہ گیٹ اور اس کے آگے جو لوہوں سے گھرا ہوا راستہ یعنی چڑیا گھر کی سڑک۔

نویس کیا ہوا کہ اس شب برگ کے تلے وقت کی چھا لگیں خاموش رہیں اس کی ایک بھی پائل نہ بھی۔

اگلے اور کچھلے زمانوں کے سارے قافلے گم تھے۔ جیسے کسی نے بھولے سے رات کے بجائے دن کو کوئی کہانی سنادی ہو۔ اور سارے زمانے رستہ بھول گئے ہو۔

اور ہم نے چونک کر دیکھا تو وکٹوریہ گیٹ کے ٹکڑے کو کاکولا کا ایک بہت بڑا سائین سائن نصب تھا۔ ایک بڑا سا گول دائرہ ۱۰ اور اس کے اندر کئی دائرے۔

ہر دائرے کا رنگ دوسرے سے مختلف تھا۔

ہر دائرے کا اپنا الگ رنگ تھا۔

اور سارے دائروں پر جمادی۔

کو کا کو لا کا نام تھا۔

یہ سارے دائرے۔

گاہ جل اُٹھتے اور گاہ بھج جاتے۔

آنکھوں میں چمکا چوند سی ہوئی نظر تھلائی۔

اس طرف برگد کا پرانا درخت تھا۔ اور اس طرف فری میسن ہال کی تاریکی

کی متلاشی ہمارا صارت۔

ہمارے اس اندھ کو وا پڑا بلڈنگ کا پیارنا سبز روشنی سے لہریز رقبہ تھا اور اس

سے کچھ آگے۔ افلاح کی روشن جبین۔ اور اس کی نیون سائز سے دیمکتی پیشانی پر

سروس خنودالوں کا بار بار پکٹتا ہوا جوتا۔

حد ہو گئی تھی.....

ہمارے حمد کی راتیں سو گوارا اور ماتم کناں تھیں۔ تم نے راتوں کی خنوتوں

پر چھاپے مارے ہیں۔ پہلے تم نے ہماری اذانوں کے اسرار گم کئے سائی گہ فون کی

لہروں پر کرخ آوازوں میں دی جانے والی اذانوں میں کوئی بھیدا اور کوئی راز

باقی نہ رہا۔

اور اب تم نے ہماری راتوں کے سماگ بھی لوٹ لئے۔

اور شبوں کا تقدس تو ان کی انصروگی ان کی ظلمتوں اور کینتوں سے عبارت ہے

اب نہ ہماری راتوں میں سکوت باقی ہے اور نہ ظلمتیں۔ انسان اب راتوں کو بھی

اتنا ہی نڈر ہے جتنا وہ دن کو تھا۔

نیون سائز نے رات کی چادر کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔

نیون سائز۔ رات کے بسم پر چکتے ہوئے داغ بجے ان سے خوف آتا ہے۔ اور ان کے اُنظار سے میری یہ آنکھیں درد کرنے لگتی ہیں۔

پھر اس روشنی میں انسان کچھ بھی تو نہیں دیکھ سکتا۔ اور اس دنیا میں کتنی بہت سی چیزوں کو انتظار ہوتا ہے کہ ان کی طرف دیکھا جائے۔

مگر اے نیون سائز۔

جیس تارکی اور غلغلہ کی ضرورت ہے۔

کہ بہت سی روشنی نظر کو خیر و کرہتی ہے۔

وہ پھر اندھیرے میں جنسی۔

اور عجیب بات ہے کہ اتنی بہت سی گلی اور بے سرو پا باتیں کرنے کے باوجود اس کی جنسی میں ذرا بھی پگھلا پن نہ تھا۔

اور پتہ ہے کیا ہوتا ہے۔ جب ہم بہت دیر تک چند حیا دینے والی روشنی کی طرف دیکھتے ہیں تو وہ ہماری آنکھوں میں بس جاتی ہے۔

ہم آنکھیں بھی بند کر لیں تو بھی ان بند آنکھوں میں وہ روشنی در آتی ہے۔ اور پتہ ہے کیا ہوا۔

شاید یہ نیون سائز میری آنکھوں میں ساگئی ہیں۔ یہ ہر گھڑی رنگت بدلتی اور اندھیرے اُجالے سے آنکھ پھولی کھیلتی ہوئی میری آنکھوں میں بس گئی ہیں۔

جب ہی تو میں نے یہ نیون سائز انسانی چہروں پر چلتی جھپتی دیکھی ہیں۔

اب اس کی آواز ہر وحشت تھی۔

دیکھو مجھے لگتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نہیں نہیں لگنا کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے۔

میں کریک ہو گئی ہوں، بچے لگتا ہے کہ جیسے میرے دماغ بچہ کی طرح ہے۔

خراب ہے۔

تمیں روشنی کروں اس کے ساتھی نے گھبرا کر پوچھا۔

تم روشنی کر کے کیا پاؤ گے، جسکا اندھیرے اور اُجالے میں فرق ہی نہیں رہ گیا۔

اُجالے اب اتنے حلقا تو نہیں۔ اب تو راتیں بھی اندھیری نہیں ہوتیں۔

سارے کی میں سگریٹ کا روشن سرا بچھ جانے والی ضلع کے گلی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پھر بھی روشنی کر لینے میں کیا حرج ہے۔ تم یوں سدا اندھیرت میں تو نہیں بیٹھ سکتے۔

تم روشنی کر لو۔

تب اس نے ہنسی جلائی۔ اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ نہایت مطمئن اور

باہوش نظر آ رہی تھی۔

اس کو اطمینان سا ہوا۔ اور حیرت بھی۔

ارے!

ارے کا کیا مطلب، تمہیں کس بات پر حیرت ہوئی!

کچھ نہیں، اس نے بات بنائی، تمہارے گرد قلم ہیں، کاغذ میں برش ہے۔

رنگ اور روغن ہیں۔ تم کیا ایک وقت میں دو دو کام کرتی ہو۔

دو اصل میں کچھ بھی نہیں کرتی ہوں جب ہم سب کچھ کر دینا چھوڑ دیتے ہیں

تو اپنے ارد گرد بڑا خطرناک اکٹھا کر لیتے ہیں اور لوازمات کا ایک جال بٹن لیتے ہیں

اور بہت بولتے ہیں۔

اچھا! اب تم نے اصل بات کہنے سے گریز کر کے دوسری بات کیوں کی تھی! اس لئے کہ تم نے یہ نہیں کنا چاہا تھا کہ 'اے تم تو ذرا بھی پاگل نہیں نظر آ رہی ہو نہیں' میں پاگل نہیں ہوں، لیکن میرے دماغ کا ایک حصہ ضرور خراب ہے جب ہی تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے ارد گرد میرے چہلچلا جانے والے لوگوں کے چہروں پر جن سے میں خوب اور اچھی طرح واقف ہوں یہ بڑے بڑے سے بڑا ڈاؤن ہوا ہے جو گھڑی گھڑی رنگ بدلتے اور جلتے بکتے ہیں۔

اور اب یہ حال ہے کہ میں کسی کو بھی نہیں پہچان پاتی۔

اب ہر شخص اجنبی اور ہر گھڑی نیا نظر آئے گا، لوگوں کی محبتیں، وفائیں، محبتیں اور سارے اصول گھڑی گھڑی بدلتے ہیں۔

کون کیا تھا؟ اور اب کیا ہے؟

یہ فیصلہ مشکل ہو جائے گا۔

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے، 'میں یہاں اپنی ہوں اور اپنی ہستی سے ناواقف۔'

جیسے میری ہستی کھوئی گئی ہو۔

میرے رستے گم ہو گئے ہوں۔

چہرے بہت جلد جلد اپنے رنگ بدل رہے ہیں، لگا لگت اور بیگانگی کے فاصلے

ختم ہو چکے ہیں۔ ایک ایک انسان کے بے شمار روپ مجھے اپنے محیط میں لے رہے ہیں۔

تب اس کی آنکھوں کی چمک سے گھبرا کر اس نے ایک بار اور التجا کی۔ میں روتی

گل کر دوں، ہنسی بھجوا دوں۔

ہاں، ضرور! اس نے فوراً جواب دیا۔ اندھیرے اور ظلمات میں بڑا تحفظ اور چری

کیسا نیت ہے۔ اندھیرے بڑے پردہ پوش ہوتے ہیں۔

بش بھٹی تو وہ اچانک چونک کر پوچھنے لگی۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی۔

کیا بہت ضروری ہے کہ انسان کچھ نہ کچھ کہتا ہی چلا جائے؟

ہاں کم سے کم اس کے لئے بہت ضروری ہے۔ جسے ہر جہرے پر چھوٹے بڑے

بے حساب دائرے نظر آتے ہوں۔ گھڑی گھڑی جھپٹے بجتے رنگ بدلتے اور تمام دائروں پر محیط کوئی نہ کوئی اشتہار نمایاں اور خوبصورت حروف میں لکھا ہو۔

اب انسان کس کس سے کہے اور کس کس کو جتنا پھرے کہ میں نے تمہارے کون

کون سے اور کتنے روپ دیکھے ہیں۔ اور یہ بتاؤ! کہ تمہارا کوئی سچا اور اپنا روپ بھی ہے۔

اب گئے دن کی بات ہے کہ میں نے وہ چہرہ دیکھا جس سے میں بہت واقف

تھی اور میں نے اسے بہت دیکھا تھا۔ اور اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کتنا بدلا

اور میں نے اس پر کتنے دائرے اور کتنے رنگ دیکھے۔ حد تو یہ ہے کہ اس پر لکھے ہوئے

اشتہار بھی گھڑی گھڑی بدلتے تھے اور اس چہرے کے منہ جیسے میں کو کا کولا کا دو نمون

سائن کتنا بہتر لگا تھا کہ جس کے دائرے گھڑی گھڑی رنگ بدلتے اور جھپٹے بجتے تھے۔

لیکن کم سے کم ایک چیز تو مستقل اور برقرار تھی کہ اس پر مستقل کو کا کولا کا اشتہار اور مستقل

اور اب کیا تمہارا خیال ہے کہ مجھ پر یہ فرض تھا کہ میں اپنی اس واقف اور درست

کو بہ بتاتی کہ مجھے تمہارے چہرے پر مختلف دائرے نظر آتے ہیں اور سنم بالا سے سنم یہ کس

پر کوئی مستقل قسم کا اشتہار بھی تحریر نظر نہیں آیا ہے۔

نہیں یہ بات درست نہیں کسی کو اس کے بارے میں بتانا اور جانا بڑا خطرناک

اور غیر منصف بخش سودا ہے۔ دوسروں کے پردے فاش کرنا ہم پر لازم نہیں۔

کہ خداوند ستار العیوب ہے۔ وہ خود پردہ پوش ہے۔ اور اس نے انسان کو نیون سائز عطا کئے ہیں۔ کہ وہ اپنے چہروں کو نقاب اندر نقاب رکھیں۔

لیکن یہ بات بھی ہے کہ دیکھنے والی نظر کا خیال نہ کیا۔ کہ یہ گھڑی گھڑی جتنی بھی روشنیاں نظر پر ظلم کرتی اور جڑا دکھ دیتی ہیں۔ اور با اوقات نظروں میں سما کر رہ جاتی ہیں، کہ میں اس رات کو بہت کو سستی اور نہیں چاتی ہوں کہ جس رات میں نے برگد تلے سے کھڑے ہو کر وکٹوریہ گیٹ کے ننگے پر جھل کرنے کو کا کو لاکے اس نیون سائز کو دیکھا تھا۔ اور پھر اس شب کے بعد مجھے اور اندھیرے نے اپنے آپ کو ان کے محیط میں محصور پایا۔

لاؤس کی راتیں اب بھی ویسی ہی سوکھا موش اور اندھیری ہیں۔ اور روشنی رات کی رانی کی آوارہ دھمکا جھکتی ہے۔ اب بھی جم خانے اور پنجاب کلب کے بار شینوں سے چھین چھین کر آنے والی روشنیوں کی کڑیوں تکی کے پردے چاک کرنے کی ناکام کوششوں میں مصروف نظر آتی ہیں۔ اب بھی وہاں تاش کی بازیوں اور عورتوں کے الٹ پھیرے معاملے اور سودے ملے ہوتے ہیں۔ لوگ بڑھیا سوٹوں میں لمبیں، بڑھیا شراہوں کے جام ہاتھوں میں اٹھائے اپنے چہرے پر نیون سائز کے بورڈ آؤٹوں کے ہنس بول رہے ہیں۔ اور رات گئے با صبح کا ذب کے دھنگ ہیں کوئی بیران کو نیم بے ہوشی کے عالم میں گھسیٹ کر لین کی گاڑیوں میں ڈال دیتا ہو گا اور ڈرائیور کا شانہ ہلا کر اس کو بیدار کرتا ہو گا۔ انہیں لے جاؤ کہ ان کے معاملے اور سودے مکمل ہو چکے ہیں۔

وقت دے تدموں یوں ہی اپنے کاموں میں مصروف رہے گا۔ اور میں شاید

اندھیرے اور غلطیوں کی عافیتوں کی تلاش میں یوں ہی بے کن رہوں گی۔ میرے ارد گرد غریب سائز کے بورڈ کسی بدخت کی ڈالوں پر تیزی سے بڑھتے ہوئے چلتے ہیں۔ اصفانی اور ضربی عمل کی سورت میں بڑھتے جائیں گے۔ اور کہتے ہیں جب بدخت ناقص ہوں اور ڈالوں کا بوجھ اٹھائے اٹھائے اٹھتا جاتا ہے تب خزاں کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ اور خزاں کے دامن میں بہاروں سے کتنی گنا زیادہ رنگ ہوتے ہیں۔ پتے پتے گاروپ بدلتے ہیں۔ پتے پتے کارنگ بدلتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کبھی فصل خزاں کا دور جب پتہ رنگ بدلتا ہے اور پھر صبر سے تمام رنگ آپس میں گھٹا ہوتے ہیں تو مکمل اور پھر خزاں آتی ہے۔ اور یہ کہیں فصل خزاں تو نہیں۔

کہیں ہم نے خزاں کے پاؤں کی چاپ تو نہیں سنی
نہیں ٹھہرو۔ پہلے میں رہی کسٹریاں اور دوازے معنوی سے بند کروں۔
تب کوئی جواب دینا۔

اچھا چھوڑو! مجھے نیند آرہی ہے۔

میں نے تمکبیر پر سر رکھ لیا ہے۔

اور اب تم بھی سو جاؤ!

اس کے ساتھ ہی نے اس کی نیند میں ڈوبی آواز کی آخری بار سنا۔

اور بہت دیر بعد مکمل سکوت کو محسوس کیا۔ بجز دھیرے دھیرے آتی ہوئی

نرم نرم سانسوں کے۔

کھڑکی کے شیشوں میں سے چہن چہن کر آتی ہوئی روشنی میں اس کے ہمارے

طرف بکھرے ہوئے کاغذ تھے اور بلا کیپ کا ایک قلم تھا۔ جس کی روشنائی شاخیم
 ہر چکی تھی۔ اور سگریٹوں کی راکھ سے لبریز راکھ دانی۔ برش لنگ و روغن کھڑکی کے
 شیشوں میں سے آتی ہوئی مدھم روشنی اپنے ساتھ درختوں کی ڈالوں کے جو سائے
 لائی تھی " دیوار پر مدھم اور پراسرار نقش اُبھار رہے تھے۔

پھر اس نے اُن کو کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا اور کھڑکی کے دروازے کھول کر
 دیکھا، سامنے کوہ کا کولہ لاکانیوں سا، گھڑی گھڑی جل جگہ رہا تھا۔

"سیپ" کراچی

آنکھوں پر دونوں ہاتھ

تمہیسا سترن ہوا تھا! یہ سب لوگ باہر کیوں نکل آئے؟ اس نے اپنے برابر ریٹنگ پر جھکی اس لڑکی سے پوچھا جس سے بات کرنے کے لئے وہ صبح سے کوئی بہنا تلاش کر رہا تھا۔ لیکن اس وقت تو وہ کسی سے بھی یہ سوال کر سکتا تھا یہ تو بعض اتفاق تھا کہ اس کے قریب وہی لڑکی کھڑی تھی۔ اسے یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس آواز پر باکس کے کھنڈے پر بیٹھا تھا۔

لڑکی ریٹنگ پر اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اس کا سینہ اس کے دونوں ہاتھوں میں چھپ گیا تھا اور اس کی کمرے چمک کر اس کے ہرے بھرے کوہوں کا اندھ بھی نمایاں کر دیا تھا۔

”تم تو اس کے گول گول کوہوں پر ہاتھ پھیرنے کے لئے سرے جا رہے ہو اور

بس — —!“

اور بس — —!“ اسے یہ کہہ کر صر گیا! اس نے گھوم کر کہیں کہیں کی

طرف دیکھا، سب لوگ اپنے کمبندوں سے باہر نکل آئے تھے۔ ہر شخص ریٹنگ پر جھک کر اندھیری ندی کے پانی میں کچھ دیکھنے، کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کیوں کی کھڑکیوں سے چپن چھن کر آنے والی روشنی سے اسٹیر کے آس پاس ندی کاغیر ترا ساحل نظر آ رہا تھا۔ مگر روشنی میں پانی اور بھی شباب ہو گیا تھا اور اسٹیر کے چھنے سے جو لہریں پیدا ہو رہی تھیں اس سے وہ گدگد پانی بار بار رنگ بدل رہا تھا، کبھی اس کا رنگ کالا ہو جاتا، انگریز کا لاکھنوی نیلا اور کبھی سرخ۔ ندی سے اُٹھنے والے بھاپ کے بخور سے اور کالے بادل سرخ لائٹ کی تیز روشنی کا رستہ روک رہے تھے۔ سامنے بھاپ کی بھڑی دیوار کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ شاید اسٹیر منہر گیا ہے۔ مگر جب اس نے غور سے سنا تو انجن اور پانی کی ملی جلی آوازیں براہ راست تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اسٹیر چل رہا ہے۔ اور اس نے اپنی رفتار بھی ابھی تک کم نہیں کی۔ اس نے ٹوکی کی طرف دیکھا۔ بالکل مطمئن کھڑی تھی، جیسے اس کے لئے طوفان اگر گزر بھی چکا ہو، جیسے وہ صدیوں سے اسی طرح پرسکون کھڑی ہو مگر دیکھ کا عجیب عالم تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہاں جو آرام کرسیاں ترتیب سے رکھی تھیں وہ منتشر ہو گئی تھیں۔ کچھ کرسیاں چھوٹی میزوں پر کھدی گئی تھیں اور کچھ اٹنی چڑی تھیں۔ ریٹنگ کے ساتھ ٹھکنے والی لائف بیلٹ کھول دی گئی تھی۔ ڈائینگ ہال کے بیرے اور مشین روم کے لوگ اب دھڑا دھڑا کھڑے ہوئے تھے۔ ڈائینگ ہال کے اندر سے بھی کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں جیسے برتن چٹنے جا رہے ہوں اور الماریوں کے دروازے کھول کھول کر بند کئے جا رہے ہوں۔

پھر اس نے کچھ اجنبی پھرے دیکھے جو ڈائینگ ہال کے دروازے نکل کر تیزی

سے فوراً کلاس کی طرف جانے اور اسی تیزی سے واپس آجائے۔ وہ حیران ہوا کہ یہ کون لوگ ہیں اور اچانک کہاں سے آگئے؟ پہلے تو اس نے انہیں نہیں دیکھا۔ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟

مگروہ نہیں غیر ملکی کہاں گئے؟ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ کر ایک سفید فام لڑکا، ایک بوڑھی عورت اور ایک بوڑھا مرد مرد نے چادریوں والا سفید فراک پہن رکھا تھا۔ بوڑھی عورت سر پر سفید دو مال باندھے تھی اور لڑکے نے سفید قمیض اور خاکی بتلون پہن رکھی تھی۔ وہ لڑکا بھی دن بھر خاموشی سے اُس لڑکی کو دیکھتا رہا تھا جو اس وقت اُس کے ساتھ ریڈنگ پڑھ چکی ہوئی تھی۔ بوڑھی عورت آرام کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھتی رہی تھی اور بوڑھا مرد وضعتا رہا تھا۔ وہ بیٹھوں جب تک اس کے سامنے رہے، بالکل خاموش رہے۔ اسے تو ایسا لگا کہ انہوں نے اپنے کیبن میں جکر بھی کوئی بات نہیں کی ہوگی وہ حیران تھا کہ اگر یہ بولے تو ان کی آواز کیسی ہوگی؟ وہ ڈیک پر خاموش بیٹھ رہے یا غلطی سے رہے۔ پھر فائینگ ہال میں اسی کلیسا والی متبرک خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتے رہے۔ زیادہ رات ہوئی تو اپنے کیبن پر کیسوں میں چلے گئے۔ پھر۔۔۔ وہ بھی کتنا پاگل ہے۔ وہ خورائے ہی میں کسی گھاٹ پر اتر گئے تھے۔ آدھی رات کے وقت۔! مگر کس گھاٹ پر اتر گئے تھے؟!

تو کیا آدھی رات ہو چکی ہے؟ اس نے ریڈنگ برائڈنگ کر سہاں کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں ایک بھی ستارہ نہیں تھا، اور بادل اتنے گانے اور اتنے گھنے تھے کہ اس کی آنکھوں کی روشنی انہیں پار نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اس نے اپنے سامنے ندی کے کنارے پر نظر جمانے کی کوشش کی کہ شاید ادھر کوئی ایسی چیز نظر

آجائے جس سے وقت کا اندازہ ہو سکے ٹکڑا تے میں لڑکی کھڑی تھی اور ندی لاکوئی کنارہ نہیں تھا۔

”میں اپنے کہیں میں تنہا ہوں اور اس میں دو بستر ہیں۔“
لڑکی نے گنگھوڑا ٹکڑوں پر سے لانی اور گھٹی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا جیسے اس کی بات سن لی ہو اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر بڑے آگے کو جھجک کر اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور کھیلنے لگا کہ جنس پڑی۔

”خوب صورت ہیں آپ بہت خوب صورت! مگر اس لینڈ اسکیپ میں آپ کا یہ تنگ لباس کچھ اچھا نہیں لگا۔“ یا۔ اچھا لگتا ہے! ایس۔؟
”تمہارا کیا خیال ہے۔؟“ یہ بات اس نے کبیرے کسی اور زور سے کہی۔
”کس پاسے ہیں۔؟“

”لابیٹر بہت مزے کی چیز ہے۔“

”اور لابیٹر بھی اس اسٹیئر کے۔“

ساری حرکت کبیر کی تھی۔ اس نے کہیں الگ الگ لئے اور ٹائینگ ہال کی چاروں میزوں میں سے چھانٹ کر اس بیئر پر بیٹھا تھا جو بالکل اس لڑکی کے سامنے تھی۔ پھر وہ پلکیں نہیں اٹھائیں۔ یا خود اس نے ہی ڈر کے مارے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

”اب ہم کل دو بیئرنگ کھانا پہنچ سکیں گے۔“

”کہیوں۔؟“

”اسٹیئر نے راستہ بدل دیا ہے۔“

”راستہ کیوں بدلا؟“

”دو دنیا مارا ضبوت ہو گئے ہیں ہم خلیج بنگال کے قریب ہیں اور سارے طوفان ہمیں

جنم لیتے ہیں۔“

”سارے طوفان ہمیں جنم لیتے ہیں؟ اس نے دریا میں نہرتے ہوئے جل کر مری

کے پودے پر بیٹھی تھی کو دیکھا۔ یہ تھی جو ایک کنارے سے چلی ہے اور جل کر مری کے پودے

پر بیٹھ بیٹھ کر دریا پار کر جائے گی۔ مگر اس تھی کو دریا پار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ

ایک ہی کنارے پر زندہ گی کیوں نہیں گزار دیتی۔ اُس نے اُس لڑکی کو دیکھا۔ وہ بھی

مشابہا سی تھی کو دیکھ رہی تھی اور اس کا ساتھی گھوم پھر کر تصویریں اُتار رہا تھا۔ اسے

ہنسی آگئی۔

وہ دونوں بیک وقت ایک تیسری چیز کو دیکھ رہے ہیں۔ کتنا شاعرانہ خیال ہے!

وہ اور ایک خوب صورت ترکیب۔ اور تیسری شے! دونوں میں مشترک! — اور پھر

مشترک حقیقت۔ یہ سفر۔!

پھر اسے شبہ ہوا کہ اس نے اس لڑکی سے کچھ پوچھا بھی تھا یا محض اس کا خیال

تھا کہ اس نے پوچھا ہے؟

”کیا سائرن ہوا تھا؟ سب لوگ باہر کیوں نکل آئے؟“

اس نے زور سے کھٹک رک رکھا صاف کیا اور چاہا کہ پھر اس سے وہی سوال کرے۔

لیکن پھر سوچا کہ سوال کرنے سے کیا حاصل؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ لوگ اپنے کینڑوں

سے باہر نکل آئے ہیں اور ریلنگ پر رک گئے ہیں، جو ریلنگ پر نہیں رک سکے وہ

ایک دوسرے کا منہ تکیے پھر رہے ہیں جیسے دو مردوں کی آنکھوں میں نہیں پانی تھا

کا سامان نظر آئے گا۔ وہ خود ریٹنگ برٹکنے والوں میں سے تھا کیونکہ جن آنکھوں میں وہ اپنے بچاؤ کی تدبیریں بڑھا چاہتا تھا وہ بھی ندی کے تھیلے اور تار یک پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

”اے یہ کبیر کدھر گیا؟“ اس نے گھوم کر اس زمین کی طرف دیکھا جو نوٹر کلاس کے تنگ و تاریک غار کی طرف اترتا تھا اور جس کی طرف جانے کے لئے وہ صبح سے کئی مرتبہ ارادہ کرتا تھا۔ مگر جب بھی قدم بڑھاتا وہ آنکھیں اس کا راستہ روک لیتی تھیں۔ کتبہ قضا بتا نیچے چوگا بلکہ ہو سکتا ہے وہ مسافروں کا سامان اکٹھا کر کے نہیں گھاٹ پر اتارنے کے لئے تیار کر رہا ہو۔ مگر کونسا گھاٹ؟ ایک گھاٹ تو گزر گیا۔ اب کونسا گھاٹ آئے گا؟ اور وہ تینوں غیر ملکی جس گھاٹ پر اترے وہ کونسا گھاٹ تھا؟ رات کا کونسا پر تھا؟ اسے پتہ کیوں نہیں چلا!! ہو سکتا ہے وہ بھی یہی اتر جاتا۔ تو پھر وہ سندھ بن کیسے پہنچتا؟!

”اب اسٹیرسندھ بن کے راستے جائے گا۔“ اسے یہ اطلاع دوپہر کے کھانے پر ملے۔ ”اچھا۔۔۔!!“ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ خوش تھا کہ مقررہ وقت سے پہلے ہی وہ سندھ بن دیکھ سکے گا۔

”مگر وہ تو آدھی رات کے بعد کہیں آئے گا۔ آپ کیا دیکھ سکیں گے؟“
 ”کچھ بھی نہ دیکھ سکیں! اس کی خوشبو تو سونگھ سکیں گے۔“

پھر اس نے پہلی بار گستاو پ آنکھوں اور بجاپ دیتے سانولے جسم کی گرہنگا خوشبو اپنی ناک آنکھوں اور ہونٹوں کے قریب محسوس کی۔ وہ بیماری بیماری کی بری تکلیف سے اٹھیں، پھر سادے دریاؤں کی گہرائی نے اس کا جائزہ لیا اور ٹھیک

حکیم گولڈ پر جھج گئیں۔ اس نے جلدی سے لائبریری نرم نرم میگ سے رہنا منہ ہر
لیا اور محسوس کیا کہ چشمدہنی چیز کھاتے ہوئے بھی منہ میں پانی بھر سکتا ہے۔ اب
سفر اچھا کٹ جائے گا۔ اس نے سوچا۔ !

پھر دائیں ہاتھ والی میز سے تینوں غیر ملکی اٹھے اور اپنے کمپنوں کی طرف چلے گئے۔
ان کے بائیں جانب میز پر تنہا بیٹھ گئے پولیس افسر نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا وہ
بھی خاموش تھا۔ تینوں غیر ملکی بھی خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ وہ توکی بھی چن
ساختی سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی، سفید وردی میں ملبوس دیشر بھی ایک کونے
میں بت بنا کھڑا تھا حتیٰ کہ کبیر بھی خاموشی سے لائبریری میں گھوم رہا تھا۔

اس مکمل سکوت سے اسے ڈر لگا۔ اتنی گہری اور گہیر خاموشی! بنگال کے تمام

دریادوں کی گہرائی اور سارے جنگلوں کا سناٹا اس وقت اس دامننگ ہال میں گھس
آیا تھا۔ اس نے گہرے سکوت کے بعد کچھ نہ کچھ مزور ہو جاتا ہے، مگر کیا ہو جاتا ہے؟
پھر اس نے خاموشی توڑنے کے لئے بھاری رستے والی شیفلڈ کی چھری اٹھائی
اور اپنے سر کے پاس لے جا کر زور سے لکڑی کے فرش پر جھوڑ دی اور سامنے کھڑکی
کے شیشوں میں سے کھلے آسمان کو دیکھنے لگا۔ آٹھ آنکھوں نے گہرا کر اس کی طرف
دیکھا اور ویز جو پاک کر چھری اٹھانے کے لئے لپکا۔ کبیر نے پہلے تو آنکھیں پھاڑ کر اس
کو دیکھا پھر مسکرا کر کڑم کڑم جھینگے چالے لگا، خاموشی پھر چھا گئی۔

لوئر کلاس کی طرف جانے والی سبز جیولڈر سافروں کی بھیڑ غمی، پتہ نہیں اتنے
بہت سے لوگ کہاں سے آ گئے تھے۔ ہر شخص نیچے اترنے کے لئے بے قرار تھا اور چلتا
تھا کہ سب سے پہلے وہی نیچے پہنچ جائے مگر ایسا لگتا تھا کہ آگے کسی چیز نے راستہ

فرق پڑتا ہے کہ وہ ملکی تھے یا غیر ملکی۔ وہ سکرایا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ وہ رات میں کسی وقت چپکے سے کسی گھاٹ پر اتر گئے۔ تو وہ کونسا گھاٹ تھا!! اس کی پریشانی قرار نہ لی۔ اس لڑکی کو ضرور معلوم ہو گا۔ وہ بھی بڑی شیشی میٹھی نظروں سے اس لڑکے کو دیکھ رہی تھی۔ مگر۔۔۔ اس کے دماغ میں اچانک ایک کونسا سا پکا۔ اس لڑکی کا ساختی نظر نہیں آیا۔ کہاں گیا وہ جیسی۔۔۔ جیسی۔۔۔؟

”عجیب بات ہے خوب صورت لوگوں کے ساتھ مرد ہمیشہ یہ صورت ہوتے ہیں۔“
”ہوتے نہیں لگتے ہیں۔“

اس نے بے ساختہ قہقہہ لگا یا اب اس کے ارد گرد کھڑے بہت سے چہرے اس کی طرف مڑ گئے اور ساری آنکھیں اس کے چہرے پر گڑ گئیں۔ نیم تاریکی میں اس نے دیکھا کہ اُن کا لے بھجنگ چہروں سے تیل ٹپکا رہا تھا اور رنگ و طرح جسم اس میں آپس میں چٹے ہوئے تھے جیسے انھیں گوند سے چپکا دیا گیا ہو۔ پھر وہ چہرے ساکت ہو گئے اور سارے جسم پیسنے میں چپکے گوشت کی دیوار بن گئے۔ اب صرف آنکھوں کی سفیدی جگر جگر کر رہی تھی۔ وہ ڈرا لگئیں اس کا جسم بھی تاریکی کے اس وسیع جسم میں تحلیل نہ ہو جائے۔ اس نے خوف سے جھجھری لی اور زور سے آنکھیں بند کر لیں۔

نہ جانے رات کا وہ کونسا پہر تھا۔ جب وہ اپنے کہیں میں گیا تھا۔ اسی وقت اس نے بہت سے لوگوں کی آوازیں سنی تھیں، جو ایک ہی لے اوں ایک ہی آہنگ میں۔

”اٹھو۔ اٹھو۔ اٹھو۔“ کہہ رہے تھے۔ جیسے بہت بھاری بوجھ یا جیوت کی بھاری بھاری کاتھیں اسٹیئر سے دھکیل کر گھاٹ پر لے جانی جا رہی ہو اور بوجھ اور ٹھکن کا احسا کم کرنے کے لئے ”اٹھو۔ اٹھو۔“ کی آواز لگاتی جا رہی ہو۔ تو گویا وہ کوئی گھاٹ تھا اور وہ

تینوں ضرور اسی گھاٹ پر اترے ہوں گے۔ مگر وہ کونسا گھاٹ تھا اور اسے اس وقت خیال کیوں نہیں آیا۔ اب کیوں آرہا ہے؟

لوئر کلاس کی طرف جانے والی میٹر جیوں پر جو جگہ گھاٹ تھا اُس سے زیادہ مجمع اب اس کو بھیچے ہو گیا تھا اور سب مل کر اسے دوبارہ بتاتے تھے اس نے آہستہ آہستہ انگلیں کھینچیں اور اس طرف دیکھنے کی ہمت کی جب ضرورہ لڑکی ریٹنگ پر چکی ہوئی تھی۔ چاہا کہ آگے بڑھے مگر راستے میں ایک لمبی سی دائری والا دیوار بنا کھڑا تھا۔ وہ ٹھٹھک گیا نیچے اترنے والا راستہ تنگ و مضرتنگ جو م نے روک رکھا تھا اور اوپر جانے کا راستہ اس دائری والے نے۔ اس نے اپنے پیروں کو دیکھنے کی ناکام کوشش کی اور بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔ کبیرا چھا رہا ہو پہلے ہی نیچے اتر گیا۔ اس نے دائری والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں جو سکت نہیں اور اسے تکیے جا رہی تھیں۔

”اس لڑکی کا سانسی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔ وہ کبھی ہے بچے اوپر جانے وہ۔“

پھر اسے بکھت خیال آیا کہ کہیں وہ بھی نواں تینوں کے ساتھ اس نامعلوم گھاٹ پر نہیں اتر گیا! اتوار لڑکی کو اکیس چھوڑ گیا۔ اس نے دائری والے کے کندھوں پر سے اچک کر اوپر دیکھا۔ ڈائینگ ہال کے دروازے تک آدمی ہی آدمی تھے۔ اب تو ریٹنگ کے پاس بھی انسانی جسموں کی دیوار بن گئی تھی۔ اب وہ اس مقام تک نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جہاں اس کا خیال تھا لڑکی کھڑی ہے۔ مگر یہ اتنے لوگ کہاں سے آگئے؟! وہ حیران ہوا۔ اوپر آٹھ دس کینوں میں رہا۔ سے زیادہ سولہ مسافر سکتے تھے۔ ڈائینگ ہال کے اشاف کو بھی شامل کر لیا جائے تو پانچ چھ افراد اور بن گئے۔

تو پھر یہ سینکڑوں ننگے تیل ٹپکاتے جسم کہاں سے آگئے۔! اورہ خوف سے کانپ گیا۔ کہیں اسٹیئر ہی نہ ڈوب جائے۔!

”کبیر بھیا..... فی.....“

پھر اسے سب اُپر بیٹھنے والوں کا خیال آیا۔ وہ کوشیٹے کے گھروندے میں بیٹھا کہ اسٹیئر کو راستہ بتاتے ہیں طوفان آیا تو سب سے پہلے وہی مشائخ ہوں گے! مگر مس وقت ان کا کیا حال ہے۔۔۔!

جس کلاس میں وہ سفر کر رہا تھا۔ اس میں سے اُپر جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں تھا۔ یا اگر راستہ تھا تو اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُپر پہنچنے کے لئے سب سے خپلی کلاس میں اُترنا پڑتا تھا۔۔۔ جب وہ اُپر چڑھنے کے لئے نیچے پہنچا تو اس نے لڑکھاس کے مسافروں کو بھی دیکھا جو کڑے کرکٹ کے ڈبیر کی طرح کڑی کے فرش پر باوجود سر بکھرے پڑے تھے۔ پیسے میں چھپانے کا لے بھگ مرد عورتیں اور بچے جو ہال میں کافی جگہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اس طرح چمٹے ہوتے تھے کہ اگر علیحدہ ہوتے تو ہی کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔۔۔ ابھی وہ یہ سوچ رہی ہی رہا تھا کہ اسٹیئر کی اصل زندگی میں لوگ ہیں کہ کچھوں کے پیشاب پاخانے بوڑھوں کے بلغم اور جوان جسموں کی تیز بوٹے اسے اور کبیر کو فوراً اُپر پہنچا دیا۔

اُپر بیٹھنے کے گھر میں بیٹھے اس شخص نے جو جوفی گھسا رہا تھا اسے گور کر دیکھا اور اپنے ساتھی سے کچھ کہا۔ پھر وہ دوسرا آدمی کہیں سے باہر آیا اور کبیر کو ایک طرف لے جا کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا۔ کبیر نے بھی سب سے تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔۔۔ اس نے سوچا اور دُور درختوں کے درمیان تنگ ہوتی ندی کے ٹوٹنے

لگا۔ ندی چر سکون تھی۔ خاموش پانی میں بہتے جل کمڑی کے پودوں نے بھی جیسے زمیں میں جڑ پکڑ لی تھی۔ کناروں پر کھڑے درخت بالکل خاموش تھے۔ صرف آسمان پر بادل تیر رہے تھے جو اتنے نیچے تھے جیسے ذرا سا اچک کر انہیں ہاتھ لگایا جاسکتا تھا۔ البتہ یہاں پہنچ کر دریا کا پانی دُور ہو گیا تھا اور کنارے بھی کہیں دُور بہتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں اسٹیمر کی بھٹ ہے!۔ اس نے اپنے آپ سے کہا اور ہم سب مسافروں کے سروں پر کھڑے ہیں!! پھر وہ دُور رسوں کے درمیان چلتا ہوا سب سے آگے دسٹر کے سرے پر پہنچ گیا اور نیچے جھانک کر دیکھا۔ نیچے ایک کشتی موٹے موٹے رسوں سے بندھی اسٹیمر کے ساتھ ٹک رہی تھی اور اس میں دو آدمی بیٹھے مٹھیاں بھر کر کھاتے اور مچھلی کھا رہے تھے۔ وہ ٹھکانا ان دونوں نے سراٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور منہ میں بھرے ہوئے مچھلی کے کاٹے زور سے ندی میں تنوک دیئے۔ سچے بٹ گیا۔ اے ایسے لگا جیسے ان دونوں آدمیوں نے اسے دیکھ کر تنوک کا ہے۔ مگر کیوں!!

اب وہ لڑکی اور اس کا ساتھی بھی اُپر آ گئے اور اس کا ساتھی کیبن کو بیک گراؤٹ بنا کر اس کی تصویر تار رہا تھا۔ کتیرا اس کے پاس آ گیا تھا اور بنگالہ کی جادو گریتوں کا ذکر کر رہا تھا اور اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو اب کیبن کے قریب ریٹنگ کے ساتھ بیٹھ لگاے 'سینئر' بھاسے 'مگرون' کے ذرا سے غم کے ساتھ ٹھوڑی اُتر ہی گئے سیاہ بال ہوا میں لہرا رہی تھی اور اس کا ساتھی تصویر کھینچنے کے لئے کیمرو ہی سیٹ نہیں کر پا رہا تھا۔

اے پھر رسوں سے بندھی ہوئی کشتی کا خیال آیا۔ طوفان اُجھائے تو یہی کشتی مسافروں کو کنارے تک پہنچاتی ہے۔ مگر ایک چھوٹی سی کشتی کتنے مسافروں کو کنارے

نمک پہنچا سکتی ہے ! اور اگر وہ خود ہی اٹ جائے تو —
 ”تم تو ہمیشہ اُلتی ہی بات سوچتے ہو۔“

اس نے بچوں کے بل کھڑے ہو کر کانے سا بندے گوشت کی دیوار پر سے نیچے
 جمنا کہا کہ شاید کیر کیس دکھائی دے جائے۔ مگر اب اتنی تاریکی ہو گئی تھی کہ کچھ بھی نظر
 نہیں آ رہا تھا۔ سوائے ایک جسم کے جو اسٹیمر کے انجن کے ساتھ سانس لے رہا تھا
 اور یہی سانس ندی کی لہروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی تھی۔ انسانوں، اسٹیل اور زک
 کی لہروں کے ایک ساتھ سانس لینے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسٹیمر بھی چل رہا ہے
 اور اس کی رفتار میں بھی فرق نہیں پڑا۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہی جیسے
 تاریک چروں کا جائزہ لیا اور حیران ہوا کہ اس عرصہ میں کوئی بھی گھاٹ نہیں آیا کہ
 طوفان گزرنے تک اسٹیلروہاں ٹھہر جاتا۔ !! پھر اس نے دقت کا اندازہ لگانے
 کی کوشش کی۔ کیا دقت ہو گا۔؟ اس نے اس عرصے میں گزرنے والے تمام واقعات
 پر غور کیا۔ پھر سوچا کہ یاہر بھی نمک کالی رات برس رہی ہے، اندر دیا ہے جیسا نمک
 اندر دیا ہے جنگل کی خوشبو بھی ابھی تک نہیں آئی کہ سندھین آئے کی نوید ملتی ہو تو
 آتا تو رات کا پھپھلاہٹا ہو رہی آتا اور پھر صبح — مگر اس کی گھڑی کہاں گئی؟ اس
 نے گھبرا کر اپنی دونوں کلاٹیاں آنکھوں کے ساتھ لگا لیں۔ شاید وہ کہیں میں
 ہی بھول آیا گھڑی ہوتی تو کم سے کم اسے دقت تو معلوم ہو جاتا۔ پتہ نہیں طوفان آیا تو اس
 کی گھڑی بھی مل سکے گی یا نہیں! — اور اس کا باقی سامان؟ کیا سب کچھ غائب ہو جائے
 گا۔؟ — کبیر نے بہت دھوکا دیا۔ خدا جانے وہ اسے چھوڑ کر نیچے کیوں بھاگ گیا۔
 کبیر جتنا تو وہ اس سے باتیں ہی کرتا۔ آگے بڑھنے یا واپس جانے کی باتیں۔

جس جوں وہ آگئے بڑھتی گئی۔ راستے میں دانے بکھیرتی گئی کہ واپسی میں راستہ نہ
بمحل جائے لیکن جب وہ طویل اودکشن راستوں پر ہنگام کر ٹوٹی تو کوا سارے دانے
چگ گیا تھا۔ مگر میں تو راستے میں دانے بھی نہیں بکھیر سکتا! اپنی بے بسی کا
احساس کر کے وہ خوفزدہ ہوا۔ میرے آس پاس پانی ہی پانی ہے جو سارے نشانِ شا
ڈالتا ہے۔!

اب اس کے کپڑے بھی پسینے میں بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئے تھے۔
اور اسے اپنے جسم سے بھی دوسرے جسموں کی بو آنے لگی تھی۔ وہ کمرے کھڑے تنگ
گیا تھا اور چاہتا تھا کہ کہیں خنوڑی سی جگہ بھی مل جائے تو بیٹھ جائے۔ اب تو وہ
اندھیرے میں گھپلتے ہوئے جسموں کے قدموں میں بھی بیٹھنے کو تیار تھا۔ مگر ان جسموں
کے پاؤں کہاں ہیں؟! اور میرے پاؤں۔!! اس نے ہمت کر کے واپس پاؤں
اوپر اٹھانے کی کوشش کی مگر دوسری ٹانگوں کی طرح اس کا پاؤں بھی کٹھنی کے فرش
میں جم گیا تھا اور اس کی طاقت جواب دے گئی تھی۔

پھر وہ سرے پاؤں تنگ کانپ گیا۔ یہ طوفان کب آئے گا؟ کیوں نہیں
چمکتا۔!! یہ کیسا عذاب ہے۔!! اس نے جی کر ڈاکر کے ایک بار پھر کبیر کو آواز
دینے کے لئے منہ کھولا۔ لیکن ابھی وہ حلق سے آواز نکالنے ہی والا تھا کہ اوپر ایک
بلند رخ بلند ہوئی اور سارا سیٹھ لڑ گیا، پھر تمام سکت آنکھیں اپنے خوں سے ہنپکی
پڑیں اور کان لمبے ہو کر کہیں کی قطار تک پہنچ گئے۔

”اس نے ندی میں چھلانگ لگا دی۔“

اس نے؟ کس نے؟! اس کون! انوکھا! میں تھا۔!!۔ مگر میں نے تو

ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

پھر اس نے زور سے دونوں آنکھیں میچ کر اور دونوں کان بند کر کے سینے کے
پودے زور سے آواز لگائی۔

”کیئر — ہا.....ئی.....ای“

لیکن اس کے آس پاس کھڑے لوگوں میں سے کسی نے بھی اس کی آواز نہیں
سُنی تھی۔

”فنون“ لاہور

نویدا انجم

ریپ

پہلے تو ایک ہی گھر تھا مگر جب جھگڑا حد سے بڑھا تو بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی گئی اور پھر جوں جوں وقت گزرنے لگا۔ نئے نئے جھگڑے بڑھتے چلے گئے۔

پہلے برآمدے میں مٹی کے تیل والا چولہا لے آگری سویرے میں غرقِ مٹی تھی۔ سر کے بال اُلجھے اُلجھے اور بکھرے ہوئے تھے۔ سر کا دوپٹہ رستی کی صورت بن گیا مگر گردن کے گرد پڑا تھا اور پکے فرش پر انگشتِ شہادت سے وہ بار بار لکیریں سی کھینچنے لگتی اور ایسے میں نظریں نہیں کہ بار بار دیوار پر جا پڑتیں۔

ابھی ابھی ذہن تھا اس کے پاس سے اُٹھ کر باہر گئی تھیں۔

وہ خوب جانتی تھی جو کچھ مٹی مودی آپا کے ہاں پک رہی تھی اس کا مطلب کیا تھا اور بے قرار میاں جس اُجھڑے سے نکلے کو ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اس کی نوعیت سے بھی آگاہ تھی۔ غضب یہ تھا کہ میاں اُنظم کے بعد اب جیسے ساروں کو انگریزوں کی طرح دیکھا کرتا تھا اور فکر بھی ایسا کہ اس سے کچھ بچنا تو یا ایسا گناہ تھا جو سرد ہو جا

تو جاننا اسلام خطرے میں پڑ جاتا!

یہ جو سارے جہاد کھٹکھٹسپرسپس لگے تھے اس کی ابتدا کہاں اور کیسے ہوئی
اب وہ کیا کیا سوچتی۔ پیچ بوجھ تو جب سے اس نے ہوش منبہ لایا یہی کانچھوس نکلتی
جلی آرہی تھی 'بات کی گرائی میں کچھ اور جاؤ تو یہ بھنگا رتی چوٹی سرگوشیاں اسی دن
سے وجود میں آئیں جس روز اس نے آنکھ کھولی۔

مودی آپا تو اسے ناجائز اولاد سمجھتے تھے جب انہوں نے ہی ایسا جانا تو پھر
دیوار پر سے والے کیوں نہ ہاں میں ہاں ملاتے۔ ساروں کا گنا ہے۔ کہ اعظم میاں دولت
کیا گئے کہ گوری چڑی والی مسم سے آنکھیں چار کر بیٹھے۔ اے دہ کیا جانے کھ کیا ہے
اور دین اسلام کس چیز کا نام ہے۔ نماز روزہ، زکوٰۃ، حج، کسی بات کی تو خبر
نہیں اور لے آئے گھوالی کی نشانی اک لوٹنے سے ایسی بھی۔ بیچ کی بات تو یہ ہے کہ بڑی
ساری جائداد ورثے میں پائی تھی۔ سو گھڑے اڑائے گئے جو من میں آیا کیا۔ روکنے
فونکے یا پوچھنے والا کون۔ کسی کو کیا چڑی تھی کہ خواہ مخواہ میں ٹانگ اڑاتا؟

سچی بات پوچھتے تو ساروں پر میاں اعظم کا بڑا رعب تھا، زندگی میں تو کہیں
کسی نے چوس نہ کی۔ مودی آپا کہیں کبار، نام جھوں چڑھا کر کوئی تیغ یا سڑا جلد کہہ
دیتیں تو وہ یوں نظر انداز کر دیتے کہ وہ اپنا سامنہ لے کر وہ جاتیں اور پھر منہ کاہنہ
بدلنے کو جگ کرنے کی ٹھان لیتیں مگر پر دین کی بیدائش کے سوا سال بعد ہی ستم یہ ہوا
کہ اعظم میاں نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں اور جن ماں کی بچی انگھوٹھا
چوستی رہ گئی!

ستمبر کا دہینہ واقعی ستم گر میں کرایا۔

ہوں بچی کو سنبھالنے والے بہترے تھے خیر سے لگی پھوپھی اماں بھی نہیں مگر اس
 نصیحتی سی جان کے ساتھ دھیر ساری باتوں کی چمک کچھ اتنی تیز تھی کہ ادھر ادھر
 سارے آن اکٹھے ہوئے۔ قریبی رشتے داری جتانے کو سبھی نے لیاقت بگھاری۔
 ہر ایک اپنی پوری قوت سے چخا چلایا۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی گئیں۔ ایک
 پڑھے لکھے لائق میاں نے اپنی بیگم سمیت بچی کے سر پر ہاتھ بھی رکھ دیا۔
 مگر قسمت کو کچھ اور سی منظور تھا۔ ان کی بیوی کو بناؤ سنگھار کچھ زیادہ سی محو
 تھا اور غرارہ پسنے کی توانائی شوقین نقیب کے نت نئے فیشن کے غرارے دیکھ کر وہی
 آپا کا منہ کر دیا ہونے لگا۔

جانے ان کے غرارے کو کس کی نظر کھانسی کہ کچھ عرصے بعد وہ شوہر بنا دیا جس
 کی بندھنیں دیکھ کر دیوار پر سے والے صم صم جاتے ایسوں ہی کی سازش کا شکار
 ہو گئے اور ایک بار پھر ساروں کو پردہ کے سر پر ہاتھ دھرنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔
 فاطمہ آپا تک گود پھیلانے پھیس پھیس کرتی دھڑی آئی اور ایک وہ لاغری سا
 بوڑھا جو خود کو سب کا غلام کہتے نہ نکلتا۔ ساتھیوں سمیت پہنچا، بڑی بوا کا ہے کہ
 نیچے نہیں وہ بھی اس دھڑ میں شریک ہوئیں اور عالیہ بوا ساری باتیں دیکھ کر حساب کتاب
 انگلیوں پر گنتی اور اعداد و شمار سے خود کو جائز قرار دیتے دیتے ایک دم سے اتنے سادوں
 کی پٹریوں دیکھ کر کچھ اتنی فحاش ہوئیں کہ مستقبل کے پروگرام کا خاکہ دھندلانے لگا۔ پھر
 سنا ہی اپنی بیگم کا بازو دھماکے بھاگے آئے اور سوئی آپا کو تھینکا دیکھائی بیگم نے پڑھ لے
 میں گانے کی کوشش کی تو نفرت سے منہ سکڑ کر پامودی نے اپنے طور پر پھڑکنے ہوئے
 یہ شمر رہا:

”اس غیرت نامید کی ہر تان ہے چپکنا“

انہوں نے گانے کی کوشش فوراً ترک کر دی۔ عالیہ بوا کو البتہ ترس گیا اور کچھ دیر کو اس کا بھی ہٹلایا اور ہمدردی میں بڑی بوا کو کہا: ”بے چاری گانا تو الگ رہا، ایک شعر بھی سلیقے سے نہ پڑھ سکتی تھیں“

مرزا جی اپنے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھامے اس کا بھی ہٹلانے کی کوشش کرتے رہے پر وہ مزاج کی مذا تیز تھیں، اپنے بے چوٹ نہ برداشت کر سکیں اور پھر تو وہ سانس نہیں ہوئیں کہ اللہ کی پناہ!

پھر یہی اماں کہیں کبھار جب بات برداشت سے باہر چلے گئی تو چیخ کر سمجھانے کی کوشش کرتیں مگر نثار خانے میں کسی کی آواز سنائی جاتی ہے؛

دیوار پر سے والوں سے تو کب کی ٹھن بھگی ٹھن وہ مزے سے تماشہ دیکھ کر کہنے اور زیر لب سکراہٹ قبضوں کے روپ میں ڈھکھکی بھر کر شہرہ اپنا صندوق کھول کر روپ دکانے کے بہانے شال لاکر سامنے دیوار پر ڈال دیا کرتے اور ادھر لڑنے بھگرنے والے وقفہ وقفہ سے چھپائی نظروں سے اس کو گھور کر رہ جاتے۔

اس شال کا بھی عجیب قصہ تھا۔

اس خاندان میں بڑی پرانی چلی آرہی تھی۔ یوں سمجھو کہ جب بھی اس گھر کا وارث پیدا ہوا اس کی پیدائش پر اسے اس قیمتی شال میں لپیٹا گیا اور اعظم میاں تک کو اس پر بڑا ناز تھا۔

مگر جب بیچ میں دیوار کھڑی ہوئی تو دیوار پر سے والوں کے ساتھ اس شال کا تماشہ شروع ہو گیا اور جب اعظم میاں کی آنکھیں بند ہوئیں تو بھگڑا کچھ اور بھی بڑھ گیا۔

دراصل سب کے مینے میں جب ساما گھر اعظم میاں کی جدائی میں جمع ہو کر شک بہا بہا تھا کسی کو دھوپ میں پٹری اس شال اور وہ اور ضروری کپڑوں کا خیال نہ رہا۔ بس یہی وجہ ہے ان قیمتی چیزوں کو بھولے ہوئے تھے !

دیوار پر بے دالوں کا جی لٹایا۔ سو تیلے تھے تو کیا ہوا۔ کسی نہ کسی طرح اپنا حق تو جتایا جاسکتا ہی ہے سو آؤ دیکھنا نہ تاؤ کدوا اور قیمتی کپڑوں کے ساتھ شال بھی دیوار پر سے گسیٹ لی۔ ادھر جانے کس کی نظر پڑی اور کوئی چلا یا "ارے ذرا لینا پکڑنا۔ وہ شال لے چنے۔"

عالیہ ہوا کا کہنا ہے۔ ادھر کسی نے شال نہیں پکڑی ورنہ دشمن کیوں کامیاب ہو جاتے، وہ تو اتفاق سے اس طرف گئی ایک کیل میں شال اُلجھ گئی زمین سے وہ لے گئے ایک حصہ کیل سے لٹکا ٹھونڈا رہ گیا۔ اب کیل نہ ہوتی تو ساری شال ہاتھ سے گئی تھی !

مگر جی ہوا کا کہنا تھا کہ انھوں نے شال تھپتھپتے دیکھا ادھر سے پلو پکڑ لیا۔ اور پھر وقتی طور پر تیز ہوتے جذبات کو اسودہ کرنا چاہا۔

تو اب شال تب سے اسی حالت میں دونوں طرف والے لئے بیٹھے تھے تب سے اُدھر اور پھر اُدھر اور کوشش دونوں طرف سے برابر تھی کہ کسی ایک طرف پوری پوری شال آئے اور صندوق میں سما جائے۔

ابھی اسی کشمکش میں کچھ وقت گزرا تھا کہ دشمنوں کی نظر لگ گئی اور سرسبز عذاب نازل ہوا کہ جسے اب سارے یاد کر کے تو بہ تو بہ کرتے ہیں۔

بات کچھ یوں ہوئی کہ اعظم میاں نے جائیداد کی دیکھ بھال کو ایک منشی رکھا تھا۔ نوابان ساگور انورا خود بصورت سا چٹھان، مہربان کو اس پر اعتماد تھا خان میاں خاں میاں

کہتے کہتے سبھی کا منہ خشک ہوا جانا اور وہ بھی ہر ایک کے کنگے مسکین بنا ہی حضوری
کئے جانا گروہ بڑا کایاں نکلا !

سبھی اس کی طرف سے بے فکر بیٹھے تھے 'یوں بھی اس پر عبور نہ کرنا ہی ہوتا تھا کہ
ساری جائیداد کی تفصیل وہ خوب جانتا تھا۔ زمینوں کی آمدنی ان کا خرچہ سزا و حق کی
باز پر اس اور دیگر پرے والوں کی غیبی تقویٰ کو گھونکر ٹھکانا سے سبھی کچھ خوب آتا تھا۔
ماخذ آپا سے لے کر عالیہ بولچک اور بڑی ہا سے لے کر مرزا ہی اور ان کی سلیم سہیں ان
کی جائیداد کی فائل ہو رہے تھے۔ اسے بلاتے پاس بٹھاتے حساب کتاب پوچھتے
حال احوال پوچھتے، شاہاٹیاں دیتے اور یوں ان کا بوملہ بڑھتا چلا گیا۔

حاصل کچھ اتنا بڑھا کہ پھر اس کا جی گیارہ برس کی پردہ کی حالت پر بڑا کرھا
اس کا کہنا تھا کہ وہ تو اس بن ماں باپ کی بی کا ہمیشہ سے خیر خواہ ہے۔ اس کی
پیدا نش سے لے کر اس کے گیارہ برس تک کی ہونے کے سارے حالات وہ خوب جانتا
تھا۔ جو جو ستم اس ننھی سی جان پر کئے گئے اس نے دیکھے اور صرف دیکھے ہی نہیں ابھی
طرح سے جانتے حتیٰ کہ کئی بار ایسا وقت بھی آیا کہ مرزا ہی نے خود بولا کہ اسے جائیداد
کی آمدنی میں حصہ دار بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

میرزاں کا کہنا تھا کہ وہ پکا مسلمان تھا۔ دیندار تھا اور ایسی دھاندلی اسے بالکل
پسند نہ آئی اور صاف انکار کر دیا۔

ایک بی بی کا کہنا تھا کہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ اصل میں وہ بی بی کہ جسے گانا تو ایک
طرف رہا شعر چڑھنے تک سلیقہ نہ تھا۔ خان کی بڑی مداح تھیں اور یہ کہتے وقت ان
بی بی کی آنکھیں چمکتیں تو بڑی بوا کی باجھیں کھل جاتیں اور پھر پوتوں پر بڑی گہری اور

زہری مسکرا ہٹ چھٹکار نے گنتی۔

قصہ مختصر یہ سمجھو کہ ایک دن جب اس نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ اب اندرونِ خانہ ہر بار زبانے کے بعد وہ ہر اہم بات کا اہل بن چکا تھا۔

گیارہ برس کی پردہ بین جی کو کچھ آنا بھائی کہہ بے اختیار چو گیا

جس نے سنا دنگ رہ گیا۔ چہرے ہلکی ایسے پیلے پھٹک، اتنے اتنے سے منہ کلک آئے۔ لوجی دیکھ لویہ انجام ہوتا ہے بے اتفاقی کا، ہر دل اپنے آپ میں کڑھا اپنی اپنی استعداد پر غور ہوا اور پھر پوچھے ہوئے دن گزرنے لگے تو خان کو خوش کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔

پہلے پہل تو پھر بھی اماں نکالنے کہہ دیا: "اے جو ہوا اچھا ہوا۔ میں تو پہلے ہی بخدا کتے دیتی تھی کہ ہوش کے ناخن لو۔ کیوں آپس میں جو تم بیزار ہو رہی ہو۔ پر میری کون سنتا ہے جو تیروں میں دال بت کے رہی برابر اب بھی سنبھل جاؤ۔ چلو اب بھی کچھ نہیں گیا۔ دیر ہوئی اندھیر نہیں ہوئی!"

لیکن پھر دیر کے ساتھ ساتھ اندھیر بھی ہو گئی!

سب سے پہلے یہ بات جس نے کی "اسے خود اپنے آپ پر اعتبار نہ تھا۔ ہے جے گیاد

سال کی ناسمجھ کے ساتھ یہ ظلم!؟ تو بہ! تو بہ!

پھر عالیہ جانے سراٹھایا اور یوں بھی ان کا ذہن کمپیوٹر کی طرح حساب کتاب میں ڈرا ماہر تھا۔ جو جو دن گزرا وہ خان کے گھر میں جمع ہوتا دھن حساب کے نقطوں کی صورت ان کے ذہن میں ڈھالتا اور وہ پھر سب کے عین درمیان بیٹھی اپنی انگلیوں کی ہر دو ہر تیزی سے گنا کرتی تھیں۔ "ایک دو۔ تین، ہزار لاکھ۔ لاکھ کروڑ۔ کروڑ"

لاکھ کروڑ کی باتیں سننے والے کہتے عالیہ بڑا کا دماغ چل نکلا ہے اور خوب ہنستے مگر ہنسنے ہنسنے آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔

اسی دنوں کام کچھ اتنا پیچیدہ کہ بے چارہ خان تنہا کیونکر سرانجام دیتا۔ سو اس نے ادھر ادھر نظر دوڑانی شروع کر دی۔

اُس کی نظروں میں آئے کوسب دوبارہ پر توڑنے لگے حالانکہ وہ ان سب کی امیدوں پر گھروں پانی بہانے کے بعد خوب کسل کھیلنے لگا تھا۔

سو ہی آپا دیویسوں میں گھیر کر دو ایک بار اندر چ کر آئی تھیں اور اب جائے نماز پر بیٹھی تاک بھروسہ پر چھایا کرتیں عالیہ بڑا ابھی تک اپنے طور پر حساب کتاب میں الجھی بیٹھی تھیں بڑی بھاننا غم آپا کے سنگ مرزا بھی کد لایت خط پر خط لکھا کرتیں وہ تو کہیں کے یہاں سے سدا کے رشتے مائے توڑ کے مسند پار جا بیٹھے تھے، عالیہ بڑا کہیں کھانا چوک کر بتا یا کرنی تھیں کمان کے خرچے پورے نہیں ہوتے وہاں مالگیری کر رہی ہیں۔ اشد اشد کیم کو بدلتے زمانے کا سارا پھر خاں بابا کے اور گردنئی نئی خشکیں گھیرا ڈالنے لگیں، اسنی میں ایک نوجوان بہر کے کام کرنے پر مامور ہوا۔ تک سب کا اچھا جوانی کے خون کی لالی سانولے سے چہرے پہ بیٹھے کئی ایک کو وہ بڑا بھلا نظر آتا۔ بڑی بڑا کو ایک بار اک ہمدردی بی نے کان میں بھونکا۔

”خان کے اہنوں میں سے ہوگا“

کسی نے بولے سے سرگوشی کی۔ ”ہمدرد بھی تو خیر سے جوان ہو رہی ہے؟“

سب کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ یہ خاں بابا کیا کرنے لگا۔

پھر ادھر ادھر چھوٹے شروع ہوئی۔ معلوم ہوا نام تو کچھ اور تھا مگر تخلص بے قرار تھا۔ خون بھی گرم گرم تھا اور رہتا بھی ہر دم پارے کی طرح میٹھا اور تھلا۔ باہر کے کاموں میں

بڑا ہوشیار اور خان بابا کے خلاف کوئی بات سننے کا تو بالکل رد و ادارہ تھا۔ جو کچھ کہنے کو کوئی آگے آتا تو جھٹ سے قمیض کی آستین چڑھا مقابلے کو تیار ہو جاتا۔
پچھلوں کے بارے میں تحقیق ہوتی تو خبر ملی کہ کسی سے کہہ نہ تھا۔ اینٹوں کے کئی پتھر
کا تن تنہا مالک تھا اور پھر کیا تھا سبھی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے خان بابا نے پھر
کا بر تلاش کر لیا ہے۔

لیکن زمانہ کی رفتار دیکھو! اور مریطاً اور آسمان بدل گیا۔

بات کچھ یوں ہوئی کہ مودی آپا کی ایک جاننے والی جو پردیس سے آئی تھیں ایک
دن دیوار پرے والے گھر گئیں۔ دراصل وہ شال کے جھگڑے کو پٹانے کی کوشش میں ہی
پھیرے پھیرے ڈال رہی تھیں کہ وہاں سے یہ بات سن کر حیران پریشان سرسید ہو کھاگی
بھاگی مودی آپا کے دل آئیں۔

مودی آپا اس وقت قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں۔

حیران پریشان بی بی سینے پر ہاتھ مار مار کر وہ راز دہانے کی کوشش کرنے لگیں۔
مگر کب تک یہ کوشش ہوتی؟ پیٹ میں ڈھیر سا راز دہاٹھنے لگا تو اب مودی آپا
کچھ سنو گی بھی کہ نہیں؟

”کاشے کو غری جاتی ہو۔ دیکھتی نہیں یہ آیت ختم کروں“

آے خوب دیکھ رہی ہوں بس اب تم یہ سلسلہ ختم کرنا اور میری سنو“

مودی آپا اس بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جائیں مگر ان بی بی کا چہرہ گواہی دے
رہا تھا کہ اس وقت جو بات تھی وہ کچھ زیادہ ہی اہم تھی۔ سو جلدی سے فاسخ ہو کر پچھے
گئیں یہ کیا ہوا جلدی بولو“

”یہ پوچھو کیا نہیں ہوا۔ اے بی بی پوچھو کہ پچھلے چھ برسوں سے کیا کچھ نہیں ہو رہا؟“
 اے ہمیں تو بس یہ خبر ہے کہ میاں متھرا د کو چینی کچھ زیادہ ہی پسند ہے سو بازار میں
 مستانیوں کا بھاؤ.... وہ تیزی سے بات کاٹ کر بولیں۔ بس بڑا تمہیں ہوا کیا ہے؟ کیوں
 کونٹیں کا سینڈلک بنی جا رہی ہو؟

”تو پھر قسم ہی بتاؤ دیر کیوں لگاتی ہو؟ مودی آپا کا سانس پھول گیا
 کیسے بتاؤں تو یہ تو ہے۔“

”اے اب کد بھی چکو دیکھو میرے دل کو دھڑکے جاتی ہو؟“
 ”تمہاری قسم کس منہ سے کہوں! میں تو سنتے ہی دم بخود ہو گئی۔ بات کروں تو کیسے؟“
 مودی آپا کو آگ لگ گئی۔ میں کہوں بس تمہاری یہ بات دھم نہیں۔ خواہ خواہ بھلے
 کونٹ پہنچانے لگی ہو۔ دھم طرح خبر ہے تمہیں، مجھ سے یوں پسیلیاں نہیں دھم جاتیں۔“
 ”اے بی بی وہ اپنی پردیہ کی بات ہے؟ وہ پھر روک گئیں۔“

”اللہ اب کد بھی چکو؟“ مودی آپا نے زح ہو کر کہا۔ ”تمہیں میری قسم؟“
 ”ہائے! ہائے!“ ٹھنڈا سانس بھر دہ بی بی بولیں۔ ”بس یوں سمجھو کہ پردیہ کو خان
 نے کہیں کا نہ چھوڑا۔“

”زیں؟“ مودی آپا نے چیخ ضبط کی
 کہنے والے نے تو قسم کھا کر کہا ہے کہ گیارہ برس کی بچی پہلی یہ ظلم ہو گیا۔ اب تو خیر
 سے سترہ برس کی ہو گئی ہے۔“

”آئیں؟“ آپا مودی کی چٹکیاں پھیلیں۔ ”میرے بچوں۔ اللہ قسم! ایسی سچ کو تمہیں
 میرے سر کی قسم!“

ان بی بی نے آنکھوں پر پتھر رکھ لیا۔ میں کس منہ سے کہوں اے اعظم میاں کے بعد
حشر جو نا تھا۔ سچی آپا۔ یہ کیا اندھیر ہوا؟

مودی آپا اس فلم کا جان کر دل گئیں بلکہ یوں سمجھو کہ انہوں نے جس کسی کو بتایا وہ بھی
پھٹی آنکھیں بنے دانتوں تلے انگلیاں دبانا رہ گیا۔

"نکاح ہو جاتا تو پھر بھی تھا۔" عالیہ بوا نے آنکھوں پر عینک جھاتے ہوئے کہا۔
"جے جے معصوم پر یہ قسم! توبہ توبہ!"

یہ انکشاف سرگوشی کی صورت اُبھرا اور پھر شطوں میں ڈھل کر پھیلنے لگا۔ ساروں پر
پس چڑ گئی۔ سفید روٹی ایسے سرکھڑی بالوں بھرے سروں کے ساتھ جڑنے لگے۔ خوراک
روٹے بی بی، عالیہ بوا اور دوسرے سب جو خود آپس میں ٹھن پکنے کے بعد ٹوٹی ملا کے
موتیوں کی صورت بکھر چکے تھے اب اس آگ کی لپیٹ میں آئے کہ پلاٹنگ کی طرح سکڑ
ادھکے کر دو بارہ ایک دوسرے کے ساتھ آن لگے۔ یہ انکشاف جیسے وہ دھاگہ بن گیا
جس نے دو بارہ انہیں ایک دوسرے کے قریب لاکر سی دیا۔

بہت سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ کریں تو کیا کریں۔ ہے ہے مسلمان کے گھر میں یہ
ظلم۔ یہ تو کافروں سے بھی گئے گزرے ہو گئے۔

پھر سب کے سب برقعے اوڑھ پھر بھی اماں کے ہاں پہنچے
دہاں کا سال نہ پوچھو تو اچھا ہے۔ ناظمہ آپا نقاب اٹھا تے پھینک پھینک کر دھیں۔
مودی آپا کا مارے جھکیوں کے بُرا حال ہوا۔ وہ جو ہمیشہ مرد کی رائے کو ترجیح دیا کرتی
تھیں اس بُرے وقت میں پھر بھی اماں میں مردانگی ڈھونڈنے لگی تھیں، عالیہ بوا اپروں
کو لگیں گن اور عینک منبھاتے بے حال ہوئیں اور پھر بڑی بوا ملک نے وہ چار آئینہ کائے

اور دوتے بی بی نے سرگوشیوں کا آغاز کیا۔

ہولے ہولے سب کا رونا دھونا شروع ہوئے غفلتوں میں ڈھلا اور پھر بھی اماں کو بتایا گیا کہ بدنیت خاں نے محصور کو زبردستی اپنی ہوس کا شکار بنا لیا تھا۔ ہردن اس مظلوم پر نیا ڈگھ لے کرتا ہے اور گے ہیں کہ اپنے اپنے جھگڑوں میں بے حال ہو رہے ہیں۔

ان کا خیال تھا کہ پھر بھی اماں کو اس واردات کی خبر ہی نہ تھی۔ پھر بھی اماں کی آنکھیں غصے سے کھلیں اور تب انہوں نے بتایا کہ ”اری کھتر اے تو یہ سب معلوم ہو چکا ہے میں تو اس انتظار میں تھی کہ تم ساری آنکھیں کھلیں تمہیں کچھ سمجھ میں آئے تو پھر سب مل کر اس کے تدارک کا بندوبست کریں۔!!“

”تو پھر اب کیا کیا جائے؟“ کئی آوازیں بیک وقت اٹھیں۔

پھر بھی اماں دیر تک سفید سریر وایاں ہاتھ رکھے سوچ میں ڈوبی رہیں۔ اور گلے میں پڑی سفید موتیوں کی مالا کو بانیں ہاتھ کی انگلیوں سے سستے وہ افسردگی سے سرمٹاتی رہیں۔

”میرا خیال ہے حقہ پانی بند کر داس کا“ نصیحتیں بی بی پہلی بار دیں۔ انہیں حقہ پینے کا پس شوق تھا۔

”بے وقوف نہ بن۔۔۔۔۔۔“ مودی آپا نے ڈانٹا۔

”اے تو کیا وہ حقہ نہیں پیتا؟“ عالیہ ہوائے مصیبت سے پوچھا تو پھر بھی اماں کا جی چاہا کہ اپنا سر پٹ لیں۔ میں کون محموداں؟ انہوں نے مودی آپا کو مخاطب کیا۔ تو جی اتنی عالم فاضل بن رہتی ہے تو کچھ انہیں بھی عقل دی ہوتی۔!“

”اے چھوٹی ماں! مودی آپا کی آنکھیں بھر آئیں۔“ مجھے کیا کتنی ہر میں تو آپ بڑا
 بیٹھی ہوں۔ یہ گھڑیاں جھڑکی کو گھنٹی بدلتی ہیں کدیہ تو پردین کی سیدائش ہی سے اس
 کے خلاف ہے۔“

”جسے سچی بات کو محسوس نہ کیا۔“ دوتے بی بی بولیں۔ ”جب سے اعظم میاں محمد
 پار گئے ہیں تو تم ہی نے تو مخالفت کی تھی۔۔۔۔۔“

”بس رہنے دو بڑی آپا۔“ مودی آپا نے تنک کر کہا: ”گھڑیاں مجھے تو یاد نہیں جاتے
 تم کون سی بات کہاں سے لے اڑتی ہو۔ بغیر سیاق و سباق کے خاک معلوم ہوتا ہے اہل
 بات کیا ہے؟“

اب ناظمہ آپا بڑے ہوئے ہیٹ پر ہاتھ رکھ کر بولیں: ”چلو جانے دو پرانے گڑے
 مڑے اکھیرنے سے فائدہ؟ اب تو یہ سوچنا ہے کہ مسموم کو اس کے پنوں سے کیسے نکالیں؟
 ”مسموم کی فکر کیسے ہے؟“ چھوٹی ماں نے فستے میں سچ بات کی۔ ”سبھی کو اپنی اپنی
 ہانڈی روٹی کی فکر ہے۔“

سبھی نے نظریں نیچی کر لیں۔

”اب غصہ متو کہ دو چھوٹی ماں۔“ ناظمہ آپا نے التبا کی۔

”ورنہ ہم کہیں گے نہ رہیں گے۔“ عالیہ براہمت کر کے بولیں۔

”خانہ ان میں جو مٹری مٹری ہوگی وہ الگ اور جو تھوٹکا پڑ رہی ہے وہ علیحدہ۔۔۔“

ایک بی بی اند بولیں۔

”ہیں اور کیا کر سکتی ہوں“ چھوٹی ماں نے کانپتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے پوچھا

”تم سب کچھ کر سکتی ہو۔ سب نہیں جانتے ہیں چھوٹی ماں۔“ ناظمہ آپا بولیں۔ ”او

معصوم کو بچا لو؟

”میری رائے بھی یہی ہے۔“ دو تھے بی بی تاک پہ انگلی دھر کر بولیں۔

”تجے چاری پر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔“ عالیہ بولا بولیں۔ ”میں خوب جانتی ہوں۔ وہ بالکل معصوم ہے۔“

”گیارہ برس کی عمر میں اسے بھلا دنیا کی اُدھنچ پنچ کی کیا خبر تھی۔ مودی آپا سر پر پچولے کر پولے سے بولیں۔ ”وہ کس سے فریاد کرے؟“

بھوپہی اماں کا دل بھر آیا۔

اب سب کے ہتے ہوتے سرود بارہ جلا گئے اور ہر سرگوشیوں میں تباہی مچ رہی تھی۔
ہونے لگا۔

آخر میں فیصلہ ہوا کہ پنچایت بلائی جائے۔

اس فیصلے کے بعد معلوم ہوا کہ پنچایت بلوانا کوئی گڈے ٹھڑیا کا کھیل نہ تھا۔ ناظمہ آپا مودی آپا۔ دو تھے بی بی اور عالیہ بوا وغیرہ سے کئی ایک خفا تھے۔ کئی بڑے بزرگ ان عورتوں کے کڑوت خوب جانتے بوجھتے تھے۔ اور بے حد تالاں تھے۔ کئی ایک تو ان کی رگ رگ سے واقف ہونے کے ناطے خان بابا کو سچا اور مسلمان جانتے تھے۔

لیکن بھوپہی اماں ایک ایسی سستی تھیں کہ جن کے سفید بالوں اور بڑھا چکے ہی سب کو پاس تھا اور جب انہوں نے ان عورتوں کا ساتھ دیا تو کئی بزرگ ان کا اعتبار کرنے لگے۔ اسی اثنا میں ناظمہ آپا کا انتقال ہو گیا۔ تو کئی ایک جدو دی میں ساتھ دینے لگے۔

ادھر بے قرار مہیاں کو جب اس سازش کا علم ہوا تو خان بابا کے کہنے کے مطابق انہوں نے ان کا توڑ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اچھے بھلے مرد کے منہ کو عورتیں آنے لگی ہیں غصہ غصہ!

اصل سچ بات یہ ہے کہ بے قرار میاں کو اپنے مالک پر پورا اعتبار تھا۔ اسے یقین تھا کہ پردین ایسی معصوم جس کی بدلت وہ ہر طرح سے صاحب الرائے بنا ہوا تھا خانہ بانہ کے کسی ظلم کا شکار نہیں ہو سکتی۔ ادھیڑ عمر کا مرد اور اتنی سی بچی۔ تیرہ بیس پاؤں لٹکانے والا اپنی عاقبت دونوں خراب کا ہے کو کرنے لگا۔

پنچایت بلوائی گئی۔ خوف شہو مچا۔ بڑے جسے حاشی آئے دونوں طرف سے بڑی بڑی تقریریں جوئیں اور جب پھر بھی اماں نے صاف صاف کہا کہ ان کو یقین ہی نہیں بلکہ اس بات کے شواہد بھی ہیں کہ خان بابا معصوم پر دین کو اپنی ہوس کا شکار بنا رہا ہے۔ تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے سب لوگ خان بابا کے مخالف ہیں اور سب ہی حق کا ستھدین گئے پھر بحث شروع ہو گئی۔

خان بابا بھاگے پھرتے سب کو گلاب کے پھول پیش کرتے۔ بے قرار میاں نے ان کے خلاف عاید کردہ الزامات کے جواب دیئے اور گرگرمی میں بحث کا اختتام ہوا۔ بالآخر پنچایت نے آخری فیصلہ نام شروع کیا لیکن ابھی آغاز ہی ہوا تھا کہ بھلی نفل ہو گئی تب لائیں کی روشنی میں پورا فیصلہ سنا گیا جسے ٹھستے ہی مودی آپادھاڑیں ماما کر رہے لگیں اور پھر ان کے رونے میں عالیہ بوا بڑی بوا دوتے بی بی اور سب ہی نے ساتھ دینا شروع کر دیا۔ وہ رہ کر ناظمہ آپادھاڑیں۔ اچھا ہوا جو اس بڑے وقت کا منہ دیکھنے سے پہلے آنکھیں بند کر گئیں۔

ایک پھر بھی اماں تھیں کہ خاموشی سے سینے میں اُبلتے ہوئے جذبات و باکرو گئیں اور آنکھوں میں ایک ذرا سا آنسو آیا تو اسے آنکھوں نے ضبط کر لیا اور لائیں کی جلتی ہوئی تہی کو گھور کر دیکھنے لگیں۔ اس وقت منہ سے کہہ کر کیا رہتا۔ جانتی تھیں اس

زمانے میں سونے کا ذرہ بھی سوراخ بن گیا ہے !!

ابھی خان بابا کے ہاتھوں زخم کھا کر کوئی سنبھلا بھی نہ تھا کہ ایک اندھ ظلم ہو گیا۔

دیوار پر سے والوں نے شمال کے تسانے پر مشتعل ہو کر پروین پر حملہ کر دیا !!

خود سے سوچو تو یہ فسادوں بڑھا کہ خان بابا کے ہاتھوں زخم خوردہ پروین دیں بد
نڈھال ہو رہی تھی اور شمال والے جگڑے کی وقعت قدرے کم ہونے لگی تھی۔ کہ ایک روز
دیوار پر سے والوں نے شور مچا دیا کہ پروین دیوار پر سے پھلانگ لگا کر صدق تک پہنچی اور
ابھی اس کا ڈھلکا اٹھا کر شمال باہر نکالنے لگی تھی کہ انہیں خبر ہو گئی۔ سوا منہوں نے اسے
مارنا پٹینا شروع کر دیا۔ اس کی دل و دھڑکیں ٹس کر اس کے حاسی آگے آدیں جھگڑا بڑھا
مگر جاننے والے جانتے کہ شمال کے اتھائی قیمتی ہونے کے سبب ہر دو فریق کے
حاصل کسے بہتے ہوئے ہیں ادا اب پروین کو نڈھال دیکھ کر دیوار پر سے والے موقع
سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے انہیں اس طرف ہونے والے واقعات کی ساری خبر
تھی۔ سو شمال کا جو تھا حصہ بھی مل جائے تو اور کیا چاہئے۔

شمال کا جھگڑا سب کے لئے اتھائی اہم تھا۔ سو ساری بہادری نہاپنے اپنے

جگڑے بھول کر ایک جان ہو کر دیوار پر سے والوں کا مقابلہ کیا۔

سادوں کا کہنا تھا کہ سب ہی نے مقابلے کا حق ادا کیا اور پھر انہی دنوں میں

بے قرار میاں کو بھی معلوم ہو گیا کہ کتنے والے غلط نہیں کہتے تھے۔ خان بابا واقعی اس
معصوم پر ظلم کر رہا تھا۔

یہ خبروں ہوئی کہ زخمی پروین سترہ گھرے زخموں کے مارے کو ہستی اپنے چنگ

پر پڑی تھی کہ میاں بے قرار ڈاکڑے اس کے لئے دوا لے کر آئے اور اندر صحن میں

اگر دیکھا کر سنا سے نہ کرے گا دروازہ بند ہے۔

دھکا دیا دروازہ کھل گیا مگر

وہ دیکھتے ہی جھکا کر قدم پچھے کو ہٹے۔

خان بابا بے خودی کے عالم میں دنیا و مافیہا سے بے پرواہ بدسی دارو کے لئے
میں زخموں سے جو رونا دک سے بدن پر ٹھیکا ہوا تھا۔

زخمی اچھڑا دیں ڈوب رہا تھا: مجھے تنگ مت کرو بابا!

”تنگ نہ کرنا۔ تم تو میری جان ہے۔“

”تم نے کیا کیا ظلم نہ کئے ہیں، سسکی سی اُبھری۔“ اب تو کچھ خیال کرو۔

”ہم تہیں خون دھجکے پاتا، کیوں گھبراتا؟ خان بابا بولا

”مجھے چھوڑ دو۔“ اس نے گھسا کر اپنے آپ کو سٹینا جاپا، پھول ایسے چہرے پر

باؤں کی لٹ بکھری پڑی غمی اور سینے کے اُستبار پر دو سفید کبود زخموں نے اپنی پیازی چوٹیں

چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ”مجھے چھوڑ دو خدا کے لئے!“

بنے قرار مہیاں کا مارے غصے کے بُرا حال ہو گیا۔ سارے جسم کا گرم گرم خون پارے

کی طرح چہرے پر گرایا، اندر زخموں پر پھلنے لگا، مسٹیاں بھیج کر انہوں نے زور سے یا

علی کا غرہ لگایا تو خان بابا کا سارا جسم کانپ گیا۔ گھبرا کر اس نے ہر دین کو بھٹ دیا اور

پلٹ کر بغیر ارمیاں پر حملہ آور ہوا۔

دوڑوں کو لڑنا دیکھا کہ پوری سسکیاں لینے لگی اور اپنے نیم برہ جسم کو جس پر بڑے بڑے

زخموں کے منہ کھلے تھے۔ ڈھانچے کی کوشش کرتی کرے کے کونے میں سمٹ کر لال لال

جلدوں والی کتابوں کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

لڑائی ہوئی اور خوب ہوئی مگر بقیہ آدمیاں کے ہاتھوں میں صرف دوا کی شیشی تھی اور خان بابا نے لپک کر کمرے کے کونے میں پڑی سمند پار بنی بندوق اپنے دائیں ہاتھ میں اٹھالی اور بائیں ہاتھ میں وہ دوائی پکڑی جو ابھی پچھلے دنوں ایک مزاح نے اسے بطور تحفہ پیش کی تھی۔

ظاہر ہے شکست بقیہ آدمیاں ہی کی ہوئی تھی۔
رومال سے ماتھے سے ہار کا پسینہ پونگھتے وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئے تو راستے میں سووی آپا مل گئی۔

دیوار پرے والوں کے ہاں جانے والی بی بی سے سارا سال سن چکی تھیں۔ بڑی طنز سے مسکرائیں، برقعہ کی اوٹ سے سلام کیا حال بوجھا دیوں گویا ہوں یہ وہاں کہاں سے لیا۔ بڑا قیمتی معلوم ہوتا ہے۔

وہ کچھ نہ بولے تو پھر کیا کہہ میاں ہم تو پہلے ہی جانتے تھے تمہارا یہ حال ہوگا!
ادھر بھیجی رہاں تھیں کہ سارا حال سنا اور ضبط نہ کر سکیں پہلے ہی نیم مردہ ہو رہی تھیں۔ اب جو ہر طرف سے آہٹیں ہوتی سرگوشیوں کی پھینکاروں میں گھیریں تو دل ہی دل میں پر دین کو ظلم کے شکنجے سے بچانے کی آرزو نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔
پھر چلے ہوئے دن سرگتے چلے گئے۔

پر دین نیم جان سی کمزور کمزور پہلے چہرے کے ساتھ اٹھ کر برآمدے میں آن بیٹھی مٹی کے تیل والا چولہا جلا کر خان بابا کے بیٹ بھر لے کا سامان تیار کرتی اور کھانسی کھانسی کر بے حال ہو جاتی اور کچے فرش پر ڈھس جاتی۔

دیوار پر پنے والے خوش ہو ہو کر نہ رہا نہ رہا کہ پھر شام ان کے ہاتھ بھی ایک پر دین کی

لڑکی اگنی ہے جو زخموں سے چورمبھوک کے مادے جلتی آہیں بھرتی ہوتی ہے اور وہ میں کہ شمال کے ذریعے اس کے زخموں کو ڈھانپنے کی کوشش کرنے کرتے تنگ آ چکے ہیں۔

مودی آپا کو یہ سن کر عالیہ برا بولیں: ”میرا تو خیال ہے اب اللہ اللہ کیا کروں ہر وقت حساب کتاب کرتے رہنے کی عادت نے دماغ شل کر کے رکھ دیا ہے۔“

پر مودی آپا کے تو عزائم ہی کچھ اور تھے۔ ”ابھی سے جی ہار بیٹھیں؟ تم نے ساتھ نہ دیا تو کوئی ہاتھ تھامے گا۔“

”اے اب تو میاں بیقرار بھی تمہارے ساتھ ہیں۔“

”لو امید سنو: مودی آپا اتنے پر ہاتھ رکھ کر بولیں: ”جیسے تو وہ ایک آنکھ نہیں بھانپتا۔“

”اے وہ کیوں؟“

”اے ہوا۔ مجھے تو اس کی یہی پسند کرنے والی عادت بالکل پسند نہیں غضب خدا

کا زیادہ جیسی کھاؤ تو شکر کی بیماریاں جو نے کا احتمال رہتا ہے۔“

”کمال ہے مودی آپا۔“ عالیہ برا بولیں: ”پر میں تو تنگ ہو چکی ہوں۔“

”تھکاوٹ کی بات چھوڑو؟“ مودی آپا پر مودی سے بولیں: ”اے میری ماں تو اس

گنگا رکے لیتے لو۔ اللہ بد کرے گا؟“

انہوں نے گنگا رکے لئے کیا لینے تھے۔ وہ تو اللہ نے ایسا سامان کر دیا۔

بیقرار دیاں کا قویہ حال تھا کہ گھر کے بھیدی تھے اس ڈر سے کہ کہیں لکنا نہ ڈھادی

خان باپانے وہ ایک باپ کو انڈر ہی اندر معاملہ طے کرنا چاہا مگر پارے کی طرح پھلنا دل تھا۔

کہ ہر لمحے اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کو سوچا کرتا۔ یوں بھی دل کو پر دین اتنا بھائی تھی

کہ اب سوائے اس کے کچھ اور سوچتا بھی نہ تھا۔

وہ معموم سی صورت، غم اور دکھ تلے زرہ زرد سی، نوخیزی کی چمک اور بھتی ہوئی رانگ
تکے انگاروں ایسی آنکھیں۔ بسی لمبی مگر اجڑی ہوئی پلکیں اور سوکھے سوکھے سے ہونٹ
جن کی بناوٹ اپنی مثال آپ ہے۔ بیقرار میاں کے ذہن میں اس کا ہر انداز جھلک
رکھتا اور چھپ جاتا ان کی بیقراری بڑھنے لگی۔

یوں بھی جب تصور ہی تصور میں وہ پردوں کے سرسید و پٹے کی جگہ پوری مثال
اور صریح دیکھتے تو بے اختیار دل سے ہر ک نکل جاتی جس کچھ اور بھی نکھر جاتا۔ !
گھر کا بھیدی لنگا ڈھانے پر کمر بستہ ہو گیا بے قرار میاں نے باقاعدہ خان بابا
کی حرکتوں کی ٹواہ یعنی شروع کردی اور پھر وہاں کے واقعات کا جب اپنے خاص انداز
میں ذکر شروع کیا تو جو سنا بس سنا ہی رہ جاتا خان بابا کے حصول کے بول کھٹنے کی
دیر نہ تھی کہ دھاگوں کے گولے کی طرح وہ کھلتے چلے گئے۔

شال کے جھگڑے میں بیقرار میاں نے جو کردار انجام دیا تھا وہ سب کی نظروں
میں تھا۔ سوائے اس ایک بی بی کے جو دیوار پر سے دالوں کے ہاں آجا کر جھگڑا پٹاتے
پٹاتے جھگڑے کی شدت میں اپنی سٹی گم کر چکی تھیں۔ سب ہی سر نہکھوں پر بٹھانے
لگے تھے۔

بیقرار میاں کی گوشیشیں رنگ لائیں۔ خان بابا کے خلاف ایک طوفان تیزی سے
اٹھا اور پھر جیسے چاروں طرف سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

ادھر بے قرار میاں کی پاٹ واد آواز تھی کہ نعرے پر نعرہ لگ رہا تھا۔
ادھر ناظمہ آپا کے جانشین مودی آپا کے ساتھ آئے۔ عالیہ بھائیوں درتے
بی بی لک لک کر مشورے دینے کو موجود ہو گئیں بھیسراں بی بی تو اپنے سمیت

بیقرار میاں کی مدد کو آئیں۔ اور تو اور اسفندی خانم جو کسی زمانے میں خان بابا کی معتقدوں میں تھیں، کچا چٹھا جان کر اپنے میاں سمیت بیقرار میاں کی مدد کو آئیں۔

بڑی بوا، بڑی بی، بڑی چودھریاں اور سب ہی دوسرے سردوں نے اٹھ اٹھ کر پھانا شروع کر دیا، بقول بیقرار میاں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جنگل میں شیر کے مرنے پر ہلچل سے کثیرے مکڑوں نے یلغار کر دی ہو۔

اسی یلغار میں خان بابا کا دم گھٹ گھٹ گیا۔

اک صبح سب کو پیغام آیا، میزوں کے گرد بیٹھ کر دعوت اڑانے کی درخواست بہنوں کے منتھنوں میں قسم قسم کے کھانوں کی تھک اٹھی، سردی آپا سمیت کئی ایک مگر بیہوشوں نے جلدی جلدی نئے سوٹ سلوائے، رنگ ہر رنگ دوپٹے اوڑھے اور بے سوچے سمجھے دعوت میں شریک ہونے کو بھاگے۔

نہ گئے تو ایک بیقرار میاں اور ان کے رفیق لاثانی۔

دعوت سے بھی کوئی بھرم نہ رہا، سکا تو ایک صبح سردی آپا یہ جان کر دم بخود ہو گئیں کہ خان بابا ہتھیار ڈال گئے۔!

”خان بابا بھاگ گیا؟ ایک ساخند کئی آوازیں اٹھیں۔

جائے کہاں گیا۔ کوئی کتا اپنے شہر میں واپس بھاگ گیا۔ جہاں سے غیور تھا وہیں پر خاک سمانے کو چل دیا۔ کہاں گیا کہھر گیا کب گیا کے شہر میں عالیہ بوا کو فکر ہوا کہ وہ گیا تو خیر سے جانا ہی تھا مگر اب پردہین کہاں ہے؟

سارے کے سارے برقعوں میں لپٹے لپٹائے، شالیں اوڑھے، رنگیں دھڑوں کو لہراتے پردہین کے شہر اپنے اٹھ دھرنے دوڑے۔

مگر گھر کے باہر ہی روک دیئے گئے۔

خان بابا جاتے جاتے اپنے ایک بھائی ڈکڑا کو پردین کے پہرے چھوڑ گیا تھا!!
گھر کی دلیز پر قدم دھرنے کا اسان پورا بھی نہ ہوا تھا کہ بیسنے میں گھٹ کر رہ گیا۔
کولہوں پر ہاتھ دھرے منہ ٹکا کر کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ جو بوڑھی بھائی تانے
انہیں روکے ہوئے کہہ رہا تھا: "فکرت کرو۔ پردین خیریت سے ہے ہم اس کی مدد کرے گا!"
غالب بولنے میں پرہیز تھا تمام لیا اور صاف کہہ دیا: "اے سودی آپا! مجھ میں تو
اب بالکل بہت نہیں۔ میں تو گھر پہلی۔ اللہ اللہ کرنے کے دن آگئے۔"

صغریٰ خانم نے فوراً ہی ساتھ دینے کا ارادہ ظاہر کیا مگر سودی آپا کی سرخ شوش
آنکھیں دیکھ کر فوراً ہی توبہ توبہ کر کے دوبارہ ہاتھ تمام کر کھڑی ہو گئیں۔
یوں بھی ابھی انہیں اس خاندان میں قدم دھرے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ کہ
توبہ توبہ کر لیتیں؟

باہر توبہ حال۔ اور اندر صحن میں پردین مٹی کے چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔
صبح سویرے کا وقت تھا۔ سورج ابھی نکلے کو تھا۔ جب پہلی کرنی پھوٹنے لگی تو
سامنے اس دیوار پر چڑھے گی اور پھر سارا گھر جگمگا جائے گا۔

پہلے تو ایک ہی گھر تھا۔ مگر جب جھکڑا اس سے بڑھا تو بیچ میں ایک دیوار کھڑی
کر دی گئی اور پھر جوں جوں وقت گزرنے لگا بیت نے جھکڑے بڑھتے چلے گئے۔ ابھی
ابھی زینت بوا اس کے پاس سے اٹھ کر باہر گئی تھیں۔

انہوں نے اسے سب کچھ بتایا تھا۔ سودی آپا کے ہاں سارے جمع تھے۔ سب
ہی اس کے بارے میں پریشان ہو رہے تھے مگر اس کے دل میں کیا ہے کوئی بھی تو

پرچنے نہیں آتا تھا۔

بچے فرش پر گشتِ شاد سے اُٹھی سیدھی لکیریں کھینچتے اسے سب کے چہرے یاد آ رہے تھے۔ ان سب کے جو اس کے ہمدون تھے اور ان سب کے جو ہمدون کسونا چاہتے تھے، مگر یہ کیسی ہمدون تھی کہ ان کے چڑھتے سورج کی روشنی کرنیں بھی کا لاد پڑھا کر آتی تھیں۔

ابھی ابھی زینت ہوا اسے بتا کر گئی تھیں کہ ذکریا خان نے فریاد بھائی تھی اور وہ اس کی قسمت کا فیصلہ کرے گی۔

فیصلے کے لئے بڑے زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بیخارا میاں سے لے کر مودی آپا تک اپنا حق جانے کے لئے بھاگ دوڑ میں ہیں۔

جولے کے قریب اُلجے بالوں کو سنوارتے ہوئے بھائیوں نے سامنے دیوار پر دیکھا۔ ابھی تک سورج کی پہلی کرن نہ جھلکائی تھی۔

اسے اس کرن کا انتظار تھا جو واقعی سنہری اور روشن ہوتی ہے!

”آدبِ لطیف“ لاہور

ما تم یک شہر آرزو

ہال میں دہلی دہلی سرگوشیاں مکتیوں کی بھنبھناہٹ کی مانند ڈوبتی اُبھرتی ہیں۔ کبھی کبھی کسی میز پر سے کوئی تہقہ گونجتا اور پھر اپنے اچانک پن پر شرسار جلد ہی دھوئیں اُڑ کافی کی جلی جلی خوشبو میں غائب ہو جاتا ہے۔ ابھی پردہ اٹھنے میں کچھ دیر باقی ہے۔ میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھایہ شخص جو استغائی انہماک کے ساتھ پائپ پینے میں مصروف ہے۔ جیسے دنیا میں اس کے لئے اس سے زیادہ دلچسپ اور اہم کام کوئی نہیں۔ یہ میری بہن کا دلور ہے۔ میں اس کے پائپ میں انہماک اور اپنے وجود سے عدم توجہی پر چپکے سے دل میں مسکراتی ہوں۔ تو یہ طے ہے کہ تم عورتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تمہارا خیال ہے میں تمہاری آنکھوں کی زبان نہیں پڑھ سکتی۔ خوب! قاسم میاں آؤ تمہیں ایک ناز کی بات بتاؤں بہنوئی! تم نے کبھی شکاری کتوں کو دیکھا ہے جب وہ اپنے نیتھے ٹھٹھلا کر مہا ہیں اپنے شکار کی خوشبو سونگھتے ہیں اور کس قدر جلد اپنے شکار کو جالیٹے ہیں۔ تو تمہیں اپنے شکار کو ان سے بھی جلد پہچان لیتی ہیں یا ایک

پہلی نظر میں وہ مرد کی آنکھوں میں اتر کر اپنا مقام تلاش کر لیتی ہیں میرا جی چاہتا ہے میں میز پر آگے کو جھک کر اسے یہ بات بتاؤں اور اس کے منہ پر ہنسوں مگر سیاں میں اکیلے نہیں بیڑے دائیں ہاتھ کی کسی بڑھتی عورت جو آگے کی طرف جھک کر دے دے لیجے میں کوئی گفتگو نہ رہی ہے میری بہن ہے۔ میں اس کے چہرے کو پل کی بل غور سے دیکھتی ہوں وہاں دن بھر کے واقعات کا ہلکا سا سایہ بھی نہیں۔ یہ اس کا پبلک فیس "PUBLIC FACE" ہے، ابھی کلب آنے سے گھنٹہ بھر پیشتر یہی عورت ایک چھوٹی سی بات پر اپنے خاوند سے جھگڑی تھی اور دونوں نے امتحانی تلخ لیجے میں ایک دوسرے کو کھری کھری کہ سنائی تھیں۔ مگر اب وہ چہرے پر مسکراہٹ طاری کئے اپنے خاوند سے یوں باتیں کر رہی ہے جیسے مدتوں سے ان میں لڑائی جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اور بائیں طرف بیٹھا مرد جو سنجیدگی سے اور دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا ہے، میرا جہنوی ہے میرا جی چاہتا ہے میں اس کے کان میں سرگوشی کروں کہ کیا آپ نے میری بد مزاج بہن کو معاف کر دیا تا صبر بھائی، مگر اس کے چہرے سے ایسا لگتا ہے جیسے سامنے بیٹھی عورت ہی اس دنیا میں اس کی واحد دلچسپی ہے۔ اسپرنگ وار دروازہ بغیر کسی شور کے کھٹنا بند ہوتا ہے۔ میز پر تقریباً ساری بھر چکی ہیں، بغیر ٹیکسوں نے اب سارے آداب پس پشت ڈال کر اونچے اونچے قہقہے لگانا اور تیز تیز باتیں کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہال کے وسط کی ایک میز اب بھی تک خالی ہے اور پردہ اٹھنے میں چند منٹ باقی ہیں۔ اچانک میری بہن کسانا اُدھوری چھوڑ کر دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایک لمحے کے لئے بدلتے ہیں مگر پھر وہ خوش باشی اور بے فکری کے ساتھ اپنے خاوند کی طرف نظر آتی

موزلیتی ہے۔ ”ناصر۔ ایک عجیب بات سفر۔ ڈاکٹر آفریدی اپنی ٹیم کی بجائے سلسلے کے ساتھ آیا ہے۔ اس نے بات کے دوران اپنے میاں کو اطلاع دی اور پہلے اپنی بات شروع کر دی۔ میں نے آنکھیں اٹھائیں اور دیکھا بال کے وسط کی جو ایک میز خالی تھی اس پر ڈاکٹر آفریدی اور سلسلہ بیٹھ رہے تھے میں نے دائیں ہاتھ جھک کر سرگوشی میں پوچھا ”یہ سلسلہ وہی نئی ڈاکٹر ہے نا جس کے ساتھ آفریدی کا A F F A I R چل رہا ہے۔“ معطر نے گھور کر مجھے دیکھا اور تنبیہ کے انداز میں بولی ”بی بی کنواری لڑکیوں کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔“ قاسم نے منہ سے پاپ نکال کر معطر کے منہ سے دیکھا لگتا ہے ابھی وہ اپنا ٹک شگاف قہقہہ لگا کے لگا کر وہ صرف سکڑانے پر اکتفا کرتا ہے پھر پاپ منہ سے نکالتا ہوئے ٹک کر اچانک معطر کو مخاطب کرتا ہے۔ ”اور کنواری لڑکیوں کو ایسی جگہوں پر آنا چاہئے۔“ کہیں بھابی؟ اس کا لہجہ کچھ کچھ سوالیہ ہے مگر چہرے پر سوائے تسخیر پسینہ جی کے اور کچھ نہیں۔ معطر پچھلے میری طرف دیکھ کر میرے چہرے کے تاثرات سے کچھ جاننے کی کوشش کرتی ہے اور اطمینان سے کہتی ہے۔ ”لیکن یہ کوئی ایسی ایسی جگہ تو نہیں نام؟“ ابھی خاصی شریف لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ اب کے قاسم قہقہہ لگاتا ہے مگر اس کا قہقہہ معمول کی مانند بلند نہیں۔ میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنے بارے میں ان کی بحث سنتی ہوں۔ ”قواب کے خیال میں ڈاکٹر آفریدی شریف انسان نہیں۔ اب معطر قاسم کی بات پر تقریباً جھنجھلا کر صر کی طرف دیکھتی ہے اور ناک کچھ کہنے کو لب کھولتا ہے۔ کھردرائی اچانک بار کا ہمد ہنسا کر نمودار ہوتا ہے اور اسٹیج کے قریب کھڑے ہو کر انڈانس کرتا ہے۔ ”خواتین و حضرات۔ اب ہمارا ہمد گرام شروع ہوتا ہے۔“ اور اس کے بعد وہ پود گرام کی توضیل بنانے لگتا ہے قاسم اپنی نشست کا رُخ اسٹیج کی طرف

کر لیتا ہے۔ میں اپنی دونوں کھنیاں مینہ نہکا کر گئے کی طرف مڑ چک جاتی ہیں میں مریض
میں پہلی بار بیٹے ڈانس دیکھ رہی ہوں اور اُسے ہری طرح دیکھتا اور اس سے پورا
لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔ مگر میرے سامنے کی مینہ آفریدی کا بڑا سانس ہے جو مڑکا
رقاصہ کی بجائے سلسلہ کے چہرے کا طواف کر رہا ہے۔ میں منظر کی آستین کو ہلکا سا جھٹکا
دے کر اسے مخاطب کرتی ہوں۔ "آفریدی کی عمر کتنی ہوگی۔ معطلہ باجی۔" وہ ناگواری سے
مجھے گھورتی ہیں۔ "یہ تم ڈانس دیکھنے کی بجائے لوگوں کے زائچے کیوں بنا رہی ہو نہیں
خفت مٹانے کو مہنس دیتی ہوں اور پھر ایک دوسرے شخص کے گاؤں سے اپنے بھتیجے
کو ہاں میں ابھرتا، گوجتا اور پھر ڈوبتا سنتی ہوں، قاسم گردن مڑ کر مجھے دیکھتا ہے۔
پریشانی سے نظر کر آخر غصے کی کیا بات تھی؟"

مصری رقصہ کا نیم عریاں جسم درد دہیاؤ شینوں میں جھلکا رہا ہے۔ اس کے سیاہ
بال اس کے شانوں پر کبھرے ہوئے ہیں اس کے جسم میں ہلا کی پھرتی ہے مرد اپنے
ہاتھوں میں چلتے سگرٹ ٹمک بھلا بیٹھے ہیں میرا جی چاہتا ہے میں اس وقت تمام
کے برابر کی نشست پر ہوتی اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتی۔ ایک نیم عریاں جسم
رقص میں۔ جیسے مصری رقصہ کا رقص بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ میں کوئی موسم نہیں
لیکن شبانہ زندگی کی ہر بات دیکھ کر مجھے انتہائی صدمہ پہنچا ہے، آج سے پہلے کبھی کسی
انسان میں بھی عورت کو اتنا ذلیل نہیں کیا گیا۔ عورت پہلے حرم میں ناجی، پھر غلاموں
کی منڈی میں ناجی، لیکن اب — اب عورت ہر جگہ عریاں ہے۔ ہر شے پر ہر شہر
میں عورت ہے اور عریاں ہے۔ یہ عورت کا سراسر تجارقی وحش استعمال ہے۔ میرے منہ
کا ذائقہ انتہائی گڑوا ہوا جاتا ہے۔ میں اپنی توجہ ہٹانے کو سلسلہ کے چہرے کی طرف مڑتی

ہوں پچیس پچیس کے لگ بھگ ایک خوب صورت چہرہ اس کے پیرے کاٹھن پکار
 پکار کر اس کے ایرانی نسل ہونے کا یقین دلاتا ہے میں نے اسے کل سہ پہر میں روڈ پر
 دیکھا تھا۔ وہ سفید اسٹائل ایک بازو پر ڈالے دوسرے میں پرس لٹکانے بڑے مزے
 میں اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے اپنا سر خاصہ چونکا دینے کی جھٹک اُپر
 اٹھایا ہوا تھا۔ جیسے اسے اپنے ارد گرد چلتے لوگوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ جیسے اس
 کا مقام وہاں آسمان کی وسعتوں میں تقابل مغلطہ نے مجھے بتایا تھا کہ یہ ڈاکٹر سلمیٰ ہے
 آفریدی کے پاس ایک Vase and a picture تھی اس پر آئی ہے۔ اور آفریدی نے
 اس پر ایک نظر ڈالتے ہی اپنی بیوی کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا آج کا یہ اس
 بات کی پوری گواہی دے رہا تھا۔ — مصری رقاصہ اپنا رقص ختم کر کے جا چکی ہے
 آفریدی سلمیٰ کی طرف دیکھ کر کچھ کہہ رہا ہے اور وہ شرمیلی سی جھنسی جھنسی رہی ہے ہنستے
 میں اس کی گالوں میں نچنے نچنے سے گڑھے چڑھاتے ہیں۔ تاسم نے اپنی نشست کا رخ
 ٹھیک کر لیا ہے اور مین پر پائپ رکھ کر جیب سے تمباکو کی ڈبیا نکال رہا ہے۔ ناصر مصری
 رقاصہ کے رقص کے بارے میں مغز کو کچھ بتانے کی کوشش کر رہا ہے غیر ملکی جن میں
 زیادہ تعداد امریکیوں کی ہے مل کر خاصا شور مچا رہے ہیں۔ فساد و سرگرمی اور کافی کی خوشبو
 سے بوجھل ہو رہی ہے۔

دوڑانی پروگرام لسٹ نکال کر پھر اسٹیج کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے اب مصری
 حسینہ عربی کا ایک گیت سنائے گی۔ تاسم نے گردن ہودھ کر اپنا رخ پھر اسٹیج کی طرف
 کر لیا ہے۔ میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھی ہوں۔ مصری حسینہ
 کا گیت بھی مجھے اپنی طرف نہیں کھینچ سکا۔ میں بے بسی کے احساس کے ساتھ کھینچ

بند کر لیتی ہوں۔ اور اچانک وہ کوچہ جسے میں کوسوں پہلے چھوڑ آئی ہوں میری آنکھوں میں روشن ہو جاتا ہے۔ میں یہاں سب کے درمیان اپنی گنہگارنا چاہتی ہوں مگر میرا اندر کا جی دور درو کر بلکان ہو جاتا ہے میں کیا بات کروں۔ میں تم کو کیا سناؤں آدمی کبھی کبھی اس کیفیت سے بھی گزرتا ہے کہ جہاں دل میں صرف ایک بے نام سادرد ہی رہ جاتا ہے۔ نہ اُمید نہ مایوسی۔ نہ کسی چیز کی اُس۔ نہ کسی شے کی لگی نہ جنت نہ نفرت۔ انتظار بھی نہیں۔ سفید آنکھیں۔ سرد اور بے جان جسم جس کو تنہا کی اوندھ بھاتی ہے۔ یہ میں ہوں۔ یہ میں ہوں۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی تیز کپکپا دینے والی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی ہوں۔ میری پیشانی پر پسینے کی نمی ہے۔ میں چاہتی ہوں معظّمہ کو آواز دوں مگر آواز میرے گلے میں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ میں چاہتی ہوں معظّمہ کی آستین پر کوسوں مگر میرا ہاتھ کانپ کے رہ جاتا ہے میں اپنے بے جان جسم کو کرسی کی پشت سے جھکا کر آنکھیں پُردی کھول دیتی ہوں۔ اور مصری حسینہ کی طرف دیکھنے لگتی ہوں۔ شاید اس کا حسین چہرہ مجھے شانتی دے سکے۔ مگر نہیں۔ مصری حسینہ کے ہتے لبوں میں بھی شانتی نہیں۔ آفریدی کے جذبات سے بھرے چہرے اور سلمیٰ کی شرمیلی ہنسی میں بھی تو شانتی نہیں۔ کبھی تو میری توقع کے خلاف بھی کچھ کرو۔ کبھی کچھ لئے بغیر بھی کچھ دینا سیکھو۔ میں ازل سے انتظار میں ہوں۔ عیث انتظار۔

معظّمہ کے چہرے پر سکون ہے اور وہ طمانیت سے چہرہ موڑے گانا سن رہی ہے۔ کیا یہ سکون یہ اطمینان میرے مقدر میں نہیں مگر یہ معظّمہ کا پلک نہیں ہے کیا تم نے کبھی گھر میں اس کے چہرے پر سکون یہ شانتی دیکھی ہے؟ — بی بی میری جان

ہم سب تنہا ہیں۔ ازل سے تنہا، تنہائی ہمارا مقصد بن چکی ہے۔ کوئی اس تنہائی کو توڑنے کی خاطر کسی کی دوسرا ہمت قبول کر لیتا ہے۔ (کیا سلسلی آفریدی سے شادی کرے گی؟) مگر یہ دوسرا ہمت اس کے اندر کی تنہائی کو توڑ نہیں کر سکتی۔ میں آگے جھٹک کر میری بہ کسبیاں ٹپکا کر آفریدی کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوں ہال کی دودھیار و دھنی میں اس کا سرخ و سفید چہرہ چمک رہا ہے گھٹی موٹھوں کے تلے موٹے موٹے ہونٹ سامنے بیٹھی لڑکی کے دل میں یقین و اعتماد کے جذبے جگمگا رہے ہیں۔ کیا اس سامنے بیٹھی لڑکی کو یقین ہے کہ یہ شخص اور صرف یہی شخص اسے خوشیاں دے سکتا ہے۔ ہنوشی! میری چاہتا ہے زور سے قہقہہ لگاؤں خوشی۔ یہ لفظ کس نے ہمیں سکھایا کرتے ہو؟ کیا کس نے؟ کوئی مجھے بتاؤ کہ میں اس سے اس لفظ کا مفہوم مانگوں۔ سلسلی بی بی کیا ختم آفریدی کی دوسرا ہمت اپنا کر خوش پالکی۔ تم نے دیکھا ہم تبرنیا کام کرنے سے شہر کس درجہ پر اعتماد ہوتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ہم ضرور خوشی پالیں گے۔ مگر خوشی کس نہیں۔ ساری عمر اس کی تلاش میں گزر جاتی ہے اور خوشی پھر بھی دوسرے کنارے پر کھڑی ٹسکرا کر ہاتھ پھیرتی ہے۔ میں اب اس کے پیچھے ہرگز نہیں بھاگوں گی۔ میں اب قہقہہ چمکی ہوں۔

مصری حسینہ گانا ختم کر کے ہانچکی ہے، تاسم ابھی تک اسٹیج کی طرف رخ کرتے بیٹھا ہے۔ بچے پر دگرام سے فائدہ بھر بھی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی۔ میں پھر اٹھ کھینچ کر لیتی ہوں۔ اور بند آنکھوں میں اپنے وجود کو بیٹھتے گاتے ہال میں افسردگی سے بیٹھا دیکھتی ہوں۔ میں ہوں کہ پاس کو ہاتھ لگاؤں، کوئلہ بنے۔ خوشی کے قریب سے گزرا دھاروں روئے۔ ہوا مجھے دیکھو کا پناہ رخ پھیرے۔ بادل اپنا سایہ چھوڑ دے۔

ٹوٹا جب اگر لوگ تنہائی میں اکیلے ہیں میں کہیں۔ تم ہو۔" گوجوم میں میرے شہات کوغنی میں بدل دیں۔ آج مجھے ہزارویں بار اس کا تجربہ ہوتا ہے اور میں سچ کہتی ہوں نہ اُداس ہوں نہ دل گرفتہ۔ صرف حلقے سے لٹکے ہوئے تنگ شدید بد مزگی کا احساس ہے ایک اینٹھن۔ کیا نام دوں اس کو؟؟؟ — اپنے اندر کے سناٹے اور باہر کی تنہائی کو (شکلیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر سے) کا ماتم کرتے برس بیت گئے کوئی چارہ نہیں غلامیں کوئی کب تک تجھے۔ بس اپنے ہی بال دپر تو چتے ہیں۔

قاسم اچانک پائپ رکھنے یا لینے کے واسطے میز کی طرف مڑتا ہے۔ اور اس کی نظروں سے ناوا دانتہ میرے چہرے پر پڑتی ہے۔ میں اپنی نظریں ہٹا لینا چاہتی ہوں مگر اس کی نظریں لٹھ بھر کے لئے میری نظروں کو اپنی گرفت میں لئے لیتی ہیں ان نظروں میں حیرت بھی ہے اور پریشانی بھی — سوالیہ بھی ہیں اور کسی حد تک CONSOLING بھی۔ پھر وہ ہلکے سے مسکرا کر چروائیچ کی طرف مڑ لیتا ہے۔ میں پھر آنکھیں بند کر کے کمر کو کسی کی پخت سے ٹکا دیتی ہوں۔ یہ محض تنہائی کا زہر نہیں ہے جو میری رگ رگ میں سرایت کر رہا ہے۔ یہ محض بے مقصدیت تو نہیں۔ عائشہ بی بی۔ یہ تو لا حاصل کاڑکھ ہے۔ یہ تو نازِ مائی کا زہر ہے۔ میں جب غم کو دیکھتی ہوں تو میرے اندر کبھی دوتا ہے۔ میرے آنسو اندر گرتے ہیں گلے میں قطرہ قطرہ۔ دل پر ستوا گر گئی بارش۔ اور وہ کہتا تھا اگر بولنے کو جی نہیں چاہتا تو مت بولو، اگر منہ سے کو جی نہیں چاہتا تو مت منہ سے مت ہونٹوں کو پھیلاؤ، خود کو کسی کہیں دھو کا نہ دو، جہاں جس وقت تھکدا جی جس بات کے لئے کام کئے تھے بھی کرتا ہے وہ کرو۔ اگر کچھ نہیں تو چپ چاپ بسز پر لیٹ جاؤ اور آنسوؤں کو خاموشی سے چتے دو۔ اور سنو۔ اگر تمہیں کوئی میسر ہے تو اس سے

کہو۔ آؤ اپنا ہاتھ ہمارے سپرد کھو، آؤ ہیں پیار کرو۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے میں انہیں
کھول کر مار دوں گا دیکھتی ہوں۔ ہر کوئی مصری حسینہ کے گانے میں مجھ ہے۔ گانے میں بھی
اس کے صرف ہونٹ ہی جنبش نہیں کرتے بلکہ اس کے ابرو یا اس کے ہاتھ حتیٰ کہ
اس کے جسم کی چمک بھی بس اوقات اس کے گانے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔
ایک سناٹا ہے جو سارے ہال پر طاری ہے۔ سوائے مصری حسینہ کی آواز اور پس منظر
ساز کے۔ میں پچھرا نکھیں بند کر لیتی ہوں۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے عاشقہ بیگم کو وہ نہیں
سمجھتا، وہ سمجھنا نہیں چاہتا اتم شکست خوردہ تب مر جاؤ مگر خود پر ترس مت کھاؤ۔
اور وہ جو یہ سب باتیں مجھے سکھاتا تھا مجھے سمجھ نہ سکا۔ مگر کیا یہ سچی ہے؟ کیا حقیقت
یہ نہیں کہ وہ مجھے سمجھنا نہ چاہتا تھا۔ سائن بی بی، نہیں اچانک آنکھیں کھول کر کہاں کے
وسط میں اُسے تلاش کرتی ہوں۔ تمہیں آفریدی کی بانوں میں سمانے کے لئے اس
کی پہلی بیوی کی قبر سے گزرتا ہو گا، کیا تم ایسا کر سکتی؟ کیا ایک لمحے، ایک لمحے کے
ہزاروں حصے میں بھی تمہیں یہ خیال نہ آئے گا کہ عورت جس کے سینے پہ پاؤں رکھ
کر تم اس کے خاندان اور اپنے محبوب کے پاس جاؤ گی وہ بھی تمہاری طرح گوشت
پرست کی ہے۔ اس کی نسوں میں بھی تمہاری مانند گرم گرم شرف خون دھتا ہے۔
اس کے سینے میں بھی زندگی کی آن گت مسرتیں خیمہ زن ہیں۔ نہیں تم ایسا
نہیں سوچو گی۔ تم بہاد ہو، تم کو صرف اپنی خوشیوں کے حصول کی چاہ ہے۔ اپنا وجود
ختم کو عزت دے دو ہے۔ اور نہیں۔ میں چپکے سے ہنستی ہوں۔ بے آواز ہنسی۔ بے بسی
کی ہنسی۔ مغلطہ اگر جان لے کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ مغلطہ اگر میرے پاس بھی
نیزے جیسا ایک پبلک فیس ہوتا، میں اس کے شگفتہ چہرے کو دیکھ کر رخ سے

سوچتی ہوں اور دفعتاً چونک اٹھتی ہوں۔ ناصر میری کرسی پر جھپک کر کچھ کہہ رہے ہیں جی۔ میں گھبرا کر ان کی طرف دیکھتی ہوں، بیانی: تمہاری طبیعت عجیب نہیں۔ ان کے لہجے میں اپنائیت ہے میں شکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلا دیتی ہوں۔ میں مزے میں ہوں آپ فکر مت کیجئے۔ میں اپنی آواز حتی الامکان خوشگوار بنا کر کہتی ہوں اور نظریں ایلیٹ پر گاڑ دیتی ہوں۔

میں نے آنکھیں ایلیٹ پر گاڑ رکھی ہیں مگر مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا سا ماساؤل دھندلا رہا ہے میں گوش برآواز ہوں مگر میرے کانوں میں کوئی آواز نہیں آ رہی میرے اندر باہر سناٹے کی حکمرانی ہے۔ آفریدی اور سلمیٰ کے چہرے بھی اسی دھند میں گم ہو چکے ہیں۔ میں اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی خاطر آنکھیں موند لیتی ہوں اور وہ کوچہ اپنی تمام تر روضینیوں سمیت میری آنکھوں میں اتر آتا ہے۔ میں اس سے بھاگ کر کہاں چتا، پاؤں گی؟ مغلہ ہنساؤ مجھے یہاں لے کر آئی ہے کہ میں اس رنگ بھرے ساحل میں اپنی تلخ اور ناکام زندگی خوشگوار بنا سکوں۔ اپنے زخم ٹھلا سکوں۔ ناصر کہتے ہیں وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ وقت۔ میں اپنے جسم میں تناؤ سا محسوس کرتی ہوں مگر۔ بھائی میرے یہ وقت ہے کیا۔ کیا ہے وقت؟؟؟ وقت اندھے کی لاش ہے جس سے وہ راستہ پاتا ہے۔ راستہ پاتا بھی ہے راستہ کھوتا بھی ہے مگر وقت ٹھنڈا اندر ہے یا تم وقت کے اندر ہو؟۔ وقت ایک جال ہے اور تم صید ہو۔ کون جال ہو اور وقت صید؟ وقت تمہارا غلام ہے یا تم وقت کے غلام ہو؟۔ مگر تم کون ہو اور وقت کیا ہے؟ اور وقت کیا ہے اور تم کون ہو؟ اور تم مر جاؤ گے اور وقت یونہی رواں دواں رہے گا۔ پھر تم میں کون فاتح ہے اور کون مغتوح؟ اور کون

حاکم ہے اور کون محکوم !! اور جو مر جائے گا، مفتوح ہوا اور جو زندہ رہا وہ خلع۔ پس وقت قارج ہے !! امیراچی چاہتا ہے میں ناصر کاندھا کی طرح کراں سے کہوں میں نے وقت کو پایا۔ میں نے وقت کو پایا۔ خود اپنی بے آواز سوچ میرے کانوں میں گونج کی پیدا کرتی ہے، وہ خوبصورت کشادہ گھر، وہ بھاگتے کھیتے بچے۔ وہ دن، وہ لوگ۔

— کہاں گئے۔ ۹۹۲۰

(وہ پریشانی سے کمرہ گھومتی ہے سارے میں ایک چپ ہے ایک سنا، ویرانی، یہ بھرا پڑا انگن اب کیسا سنسان ہو رہا ہے کمرے کیسے خاموش، کوئی سداوت نہیں کھنسا، کسی کمرے سے کوئی آواز نہیں ابھرتی۔ یہ گھر ہے، یہ گھر ہے، یا قریب۔ وہ ماں کے کانوں کے پاس جا کر ڈھاڑتی ہے۔ بڑھی عورت سفید پلو سے مڑھائیے تخت پر بیٹھی ہے، سپاٹ بے رنگ آنکھیں لئے، آوازانی میرے پاس بیٹھو، بھنات سے بھاری آواز رانی۔ ہنہ۔ وہ طنز سے ہنستی ہے اور ہنسے چلی جاتی ہے۔ پھر نڈھال ہو کر تخت پر گر جاتی ہے۔ ایک دم وہی سکوت، وہی خاموشی، وہی سنا۔ آنکھیں بند کئے کیا سکون ملتا ہے، سکون۔ ہنہ سکون کیا ہے، آنکھیں کھول کر وہ بڑھی عورت کو دیکھتی ہے۔ ماں کیا ہے میرے سینے میں معدوم جہاں خنفسہ فق سے بھی خاموشی قبر نہیں ٹوٹتی۔ اور آگے بڑھ کر ماں کی گود میں سر رکھ کر بچکیوں میں دھن گنتی ہے۔)

منظفہ مجھے پھر کہہ رہی ہے میں نے آنکھیں کھول دی ہیں میری آنکھوں میں میرے کوچے کی گرد اڑ رہی ہے منظفہ اسے دیکھ لے گی۔ میں نے جلدی سے دریا نکال کر اپنی آنکھیں صاف کی ہیں۔ منظفہ باہمی۔ آپ کے کلب کی روخیاں میری

انکسوں کو غروہ کئے دے رہی ہیں۔ میں اپنی آواز میں بشارت پیدا کرتے ہوئے کہتی ہوں۔ وہ ہاتھ بڑھا کر میرا شانہ تھپتھپاتی ہے۔ ہولے ہولے ختم ان روشنیوں کی عادی ہو جاؤ گی بانو۔ اس کے لمحے میں مانتا ہے میرا گلہ رندہ جاتا ہے (کیا ہے میرے سینے میں معدوم۔ کیا ہے) میں اقرار میں سرکھ دیتی ہوں۔ مغلہ پھر اسٹیج کی طرف چہرہ ہڈی ہے عربی حسینہ DAGGER DANCE پیش کر رہی ہے اس کے دونوں ہاتھوں میں چمکتے ہوئے خنجر ہیں اس کی سرکات میں بلا کی پھرتی ہے اور وہ اس تیزی سے اپنے ہاتھوں کو داتیں بانیں اوپر نیچے گھماتی ہے کہ خنجر نظر تک نہیں آتا اور صرف بجلی سی کوئٹی نظر آتی ہے۔ میری توجہ لمحاتی طور پر حسینہ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ تمام انگلیوں سے میری جانب دیکھتا ہے۔ میرے چہرے پر دلچسپی پا کر خود میں خوش ہوا اٹھتا ہے لیکن آفریدی کا سراپک بار پھر میری توجہ اُچک لیتا ہے آفریدی اُسے یہاں لے کر کیوں آیا ہے؟ کل رات ڈنر پر خواجہ دے دے کہہ رہا تھا کہ آفریدی پہلی بیوی کو طلاق دے کر سہیلی سے شادی کرے گا اور دونوں مل کر ہسپتال کھولیں گے میری خواہش ہے میں ان کے قریب بیٹھ دوں اور ان کی باتیں سنوں۔ آخر آفریدی سہیلی سے کیا کہہ سکتا ہے؟ سہیلی نے کیونکہ اس کی باتوں کا یقین کر لیا ہر جگہ سہیلی لی بی تو کس قدر معمولی ہے انگلیں میچے اس شخص پر اعتبار کر رہی ہے جس نے تیری خاطر پانچ سالہ رفاقت کو ختم کر دیا۔ کیا وہ تیری رفاقت سے کسی بھی وقت ایسے ہی منہ نہیں موڑ سکتا؟ میں چاہتی ہوں سہیلی کو یہ سب باتیں بتاؤں، اسے اس فعل سے باز رکھوں وہ ابھی معدوم ہے اس نے سہیلی نے عیاری سے اسے اپنے جینگل میں پھانس لیا ہے۔ مگر ابھی وقت ہے وہ اس جاں کو توڑ سکتی ہے۔ اگر میں اس کی مدد کروں۔

قاسم اسپانک پائپ رکھنے کے بہانے میز پر جھک کر میری طرف دیکھتا ہے، اگر میں غلطی پر نہیں، یہ پروگرام آپ کی معمولی سی توجہ بھی نہیں کھینچ سکا، میں غصہ مٹانے کو کچے سے مسکراتی ہوں یہ حقیقت ہے قاسم میاں، غم کو کچھ سمجھ دار قسم کے آدمی ہو مگر میں اسے اپنی رائے سے باخبر نہیں کرتی، بس کچے سے مسکرا کر بات ختم کر دیتی ہوں۔ اسٹیج پر پردہ چڑا ہے، رقصہ جاچکی ہے، خدا کی بار کی طرف سے نکل کر پروگرام کے ختم ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ کرسیوں کا شور، باتوں مقصود کا غل، امریکی سرواپنے پائپ سنبھالے بار میں گھس جاتے ہیں۔ عورتیں، پروگرام پر اپنی باریک آوازوں میں تجرہ کرتی، باہر نکل جاتی ہیں۔ آخری آدمی اور سٹیج، ابھی اسی بھیڑ میں گم ہو چکے ہیں، سترکے لمبے گھر چلنے کو کہتی ہے گھر۔ میز گھر کو نسا ہے ۹۹۹

(ادورہ بالکنی میں کھڑی، اکیلی، تنہا اور آداس، اپنے غیر محفوظ ہونے کا احساس میرے سینے میں وہی ایک عزم، ایک خطا۔ اے گراں بار سکوت۔ ٹوٹ جا، بالکنی سے نیچے جھانکتے ہوئے، اس نے سوچا، نیچے کوڑ جاؤں۔ تب کیا ہو گا، اگر میں یہاں سے کوڑ کر نیچے جا کر دوں اور سرخ سرخ بھری پریٹ کوڑ جاؤں تب کیا ہو گا؟ اس کے بعد میں کہاں جاؤں گی؟ کیا پھر یہی تنہائی میں، آداسی، یہی اکیلا ہیں۔ اور جو اس بالکنی سے نیچے کوڑ جاؤں تو نیچے بچے وہی خدا ٹے گا جو میری ماں کا خدا ہے۔ نہیں نہیں بچے تیری ضرورت نہیں۔ میں زندہ رہوں گی۔ میں زندہ رہوں گی)

معتزلہ نے میز پر اتنے تمام لیا ہے، تا صوبہ ہی طرف، باغیچہ پشت پر باندھے سر جو گائے پل رہے ہیں۔ میری سوچیں آپس میں گٹھ جوڑ رہی ہیں، میں پروگرام کے بارے میں سوچنا چاہتی ہوں کہ اس کی تعریف، مصر کے رو برداروں اور شکر برداروں کے آج

کی شام بڑی دلچسپ گزری مگر مجھے آفریدی کا جذبات سے شرم چہرہ اور سلی کی جھینپی جھینپی سی ہنسی یاد آجاتی ہے۔ اور جب میں آفریدی کے بارے میں کچھ کہنے کو بٹھولتی ہوں تو قاسم کے بوٹوں کی چاپ ہتھوڑے بن کر میرے ذہن میں گونجنے لگتی ہے۔ قاسم ہم سب سے چار قدم پیچھے اکیلا چلا آ رہا ہے۔ اچانک میں اتھنائی بھونڈے پن سے مغصہ سے کہتی ہوں: ”مغصہ باجی۔ قاسم کی بیوی کب آئے گی؟“ نامہ کا ٹھکانہ سارا بھی جھک جاتا ہے قاسم کے بوٹوں کی چاپ کھیں ڈور گرم ہونے لگتی ہے اور مغصہ مرگوشی کے لہجے میں کہتی ہے: ”ان کی تو SEPERATION ہو چکی ہے بانو۔ پھر تو دے اُمّی آواز میں مجھے بتاتی ہے کہ وہ بے انتہا بد مزاج اور پھوٹر قسم کی عورت تھی میرا جی چاہتا ہے فقہہ لگاؤں۔ ایسا فقہہ جو ساری کائنات کو اپنے گیرہوں لے لے جے ہر کوئی سر اٹھا کر ٹھنسنے۔ یہ سارے دھوکے ہیں مغصہ کسی کو کسی کی ضرورت نہیں۔ کوئی دوسرا مت ابدی نہیں۔ سارے رشتے ٹوٹ جانے والے ہیں کسی کو ثبات نہیں۔ کسی کو ثبات نہیں۔“

آیا نے بچوں کو سٹلا دیا ہے۔ ہم چاروں خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ نامہ کبھی کبھار ایک آدھ بات بھیڑ دیتے ہیں۔ قاسم ہمارے میری طرف دیکھتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے ہمیں سب کے درمیان اس سے پوچھوں۔ تم بویوں نظروں نظروں میں مجھے اُن گنت پیغام دے رہے ہو۔ کیا تمہارا خیال ہے میں تمہاری بد مزاجی سمجھتا ہوں؟ قسم کی جو ی سے بہتر ثابت ہوں گی۔ تم غلطی نہ ہو قاسم۔ یہاں کوئی کسی سے بہتر نہیں۔ اور پھر میں تو رشتوں ناطوں پر ایمان بھی نہیں رکھتی۔ نہ مجھے کسی کی دوسرا بہت کی ضرورت ہے۔ تنہائی میرا مقصود بن چکی ہے۔ مگر میں اس سے کچھ نہیں

کھتی میں اس کی نظروں کی زبان سمجھنے سے انکار کر دیتی ہوں اور مجھ کا کرکھانا کھاتی ہوں۔
مجھے کھانے سے بھی نفرت ہے مجھے ہر اس شے سے نفرت ہے جو مجھے زندہ رہنے پر
اکھاتی ہے لیکن میں مرنا بھی نہیں چاہتی۔ کیونکہ مرنے کے بعد مجھے وہی خدائے کوس
نے زندگی بھر مجھے کچھ نہیں دیا۔ اور وہ مرنے کے بعد مجھے کیا دے گا؟

میں پرانی پڑھی ہوئی ایک نظم کو دل میں دہرانے لگتی ہوں:

زیست اور موت کا چکر! جینا

موت اور آگ کی خوراک میں ڈھلنا۔۔۔ مرنا

اور پھر زیست کی تکلیف اٹھانا۔۔۔ خود کو

اس سوالات کی خوراک بنانا۔۔۔ کیا ہے؟

تاسم نے کافی کی پیالی میز پر رکھ کر مجھے ہلکی ہلکی سیر کے لئے کہا۔ یقیناً تھوڑی
سی سیر سے آپ کو قطعاً نقصان نہیں پہنچے گا۔ مگر میں اس کے ساتھ باہر نہیں جانا چاہتا
میں اس کا پیغام نہیں سمجھتا چاہتی۔ مجھے تمہاری قطعی ضرورت نہیں تاسم۔ وہ میرے انکار
پر دل ہواشتہ ہو جاتا ہے اور کافی کی ایک اور پیالی باؤ پودہ مضطرب کی مخالفت کے پانی کر جانے
کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ پھلنے نہیں میں رہتا ہے اور رات کا کھانا اگر مضطرب
کے ہاں کھاتا ہے۔ ناصر اور مضطرب مجھے میرے چھوٹے سے بیڈ روم میں چھوڑ کر اچھی سی
یشمی ٹینڈ لینے کی ہدایت کر کے اپنی خواب گاہ میں چلے جاتے ہیں۔ سیاہی بھلتی ہے
تو شام ٹپتی ہے اور روشنی بھلتی ہے تو دن۔ اور دن گزرتے ہیں تو سلا گزرتے ہیں
تو۔۔۔ مجھے موت کیوں نہیں آتی۔ مگر میں مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے زندہ رہنا ہے اور مجھے
زندگی سے نفرت ہے۔

”ماں‘ رات کیوں ہوتی ہے؟“ بڑھی عورت چہرہ لحاف سے نکال کر اسے دیکھتی ہے
 ”سو جاؤ بیٹی“ وہ آنکھیں چھپت پر گھاڑے لیٹی ہے۔ ”ماں اگر ہم دن کو سو جائیں اللہ تعالیٰ
 کو کام کریں تو پھر رات کو دن اور دن کو رات کہیں گے نا؟“ بڑھی عورت عاجزی سے
 کروٹ بدل کر اسے دیکھتی ہے۔ ”بیٹی‘ سورۃ الرحمن پڑھ کر اپنے سینے پر بھونک مارو اور
 سو جاؤ۔“ تب وہ یکدم لحاف پر سے پھینک کر اٹھ بیٹھتی ہے اور چلا کر کہتی ہے۔ ”ماں
 اپنے خدا کا نام میرے سامنے مت لیا کرو۔ مت لیا کرو۔“ چلاتے چلاتے اسے کھانسی
 آجاتی ہے اور وہ بے ذم سہی ہو کر بستر پر گر جاتی ہے۔ خاموش‘ دیران گھر سناٹا بند کر کے
 بند دروازے۔ کسی کمرے سے کوئی آواز نہیں ابھرتی‘ اسکت و جامد چیزیں۔ کوئی بولے
 کوئی کروٹ بدلے‘ کوئی سسکی‘ کوئی آواز‘ کراہ!! پھر کوئی ہوتا یہ ہو۔“

سب کچھ ٹھہر گیا ہے۔ سب کچھ سو گیا ہے۔ میں شاید مرد ہی ہوں!
 ”سیپ“ کراچی

رشتہ

گوالی بین کے ایک طرف آگے کوچل کر جہاں بائیں ہاتھ کو ٹرتا ہوا راستہ نکلتا ہے
 بنایا کرتا تھا، وہاں ہلکا سا ہوا لوگوں کی پھٹی پڑائی جوتیوں میں تکیاں، ایڑیاں اور اسٹینج
 کے چیلوں کے ٹوٹے ہوئے تسموں کو لڑکیوں کی طرح کے نازک اور نرم گورے گورے
 ہاتھوں سے ٹانگے لگایا کرتا۔ یاد دو آئے، چار چلے آنے میں بحری اور گرد کے کھائے
 ہوئے جوتوں کے چمڑے کی چیلہ کو از سر نو لال یا کالا کرتا رہتا، گویا لوگوں کے پیچھے پرانے
 جوتوں میں ٹانگے نہ لگا رہا ہو، خستہ جوتوں کی چیلہ کو لال کالی پالش سے چمکانہ رہا ہو
 بلکہ اپنی اُدھڑی ہوئی زندگی میں ٹانگے لگا رہا ہو اور اس کی کمرہ اور مسخ شدہ جلد
 کو بنا سنوار رہا ہو۔

دو پہر ہوتے ہوتے جب وہ جوتوں میں ٹانگے لگاتے دکاتے غٹک جاتا اور
 سورج سامنے کی تین منزلہ بلڈنگ کو مچلا رنگ کر اس کے سامنے پڑے ہوئے پیٹے
 پرانے موکے ہوئے چمڑے کے جوتوں کے ڈھیر پھیل جاتا اور دوپتے نئے ہاتھوں

کے سہارے اٹھا کر کھڑی ہوئی کپڑے کی چادر سوج کی تپش میں مزاحم نہ رہتی تو وہ روئی دکھانے یا پانی کا ٹھنڈا گلاس پینے، ساری گلی کو عبور کر کے آخری کونے کے بھٹیاریخانے میں چلا جاتا جہاں کالک چربی میں پکائے ہوئے سالن کو حلق میں جما دینے کی غرض سے برف کے پانی کے پہلوانی گلاس مفت ٹا یا کرتا تھا۔ پلٹے ہوئے وہ راستے میں چرتی دکانوں سے کسی کا ہوتا پالش کرنے، ایڑی لگانے یا اٹھوڑا ہونی جگہ ٹانگے لگانے کے لئے لیتا آتا۔

گلی کے بچوں بیچ محمد حنیف پنواڑی کی دکان چرتی تھی۔ محمد حنیف پنواڑی نے زندگی میں کبھی سیر نہیں گھرے گھر سے نشان ڈالنے والی نری کی لال لال مچوئی کے علاوہ کوئی چیز نہ پیتی تھی۔ اور اس کا جوتا گھسنے کا نام نہ لیا کرتا کیونکہ جوتا تو جب گھستا ہے جب آدمی کی ٹانگیں چلتے چلتے ٹھک جاتی ہیں اور اگر ٹانگیں نہ ٹھکیں تو جوتا بھی نہیں ٹھکنا۔ اور محمد حنیف تھا کہ صبح کو جوتا دکان کی گڈی پر الٹی پالتی مارے بیٹھتا تھا تو رات گئے ہی اٹھتا۔ لہذا جوتی سدا کی بہار دکھائی دیتی گویا ابھی ابھی دکان سے اٹھا کر لائی گئی ہو۔ ہفتہ کے ہفتہ اس کی جوتی باجوہ بڑے چاؤ کے ساتھ محمد حنیف کی دکان بند کر کے رات کو گھر آنے پر گھائی کے خالص سرسوں کے تیل سے اجاس کا چھٹا بھائی برانے جانے والے کے ہاتھ گاؤں بھیجتا رہتا تھا۔ گودڑ جھگو جھگو کر جوتی کو چمکاتی رہتی تھی۔ مگر ہوا یہ کہ محمد حنیف کا بڑا سالہ ایک دفعہ اپنی بہن سے ملنے آیا تو سہوئی کے لئے چمک دیک دیکھاتی ایک گرگابی لیتا آیا۔ جب گوجرہ کی بہن ہوئی تھیں تو ٹانگوں کے گرد پیٹے اور پاؤں میں چرم چرم کرتی گرگابی کو پہن کر محمد حنیف دکان جائے کو نکلا تو زندگی میں پہلی بار اسے یوں محسوس ہوا گویا پیر کے نیچے کوئی دیبر قالین بچھا ہوا ہے اور

چاروں طرف سے اس کے پیروں کو نرم و نازک گرفت میں لے رہا ہے۔

گارسے مٹی سے بچاتا اس گرگابی کو حنیف، کان کے پترے پر پیر رکھتے ہی تھامتھا اور اسے بڑی احتیاط سے جیسے ڈبیر ساری تعداد میں چاندی کے ذوق لگے پائوں کا پیکٹ تیار کر رہا ہوا تھا کراپنے بیٹھنے کی گڈی کے قریب ہی رکھ دیتا۔

جب گرگابی کی کالی جلد روز بروز کے استعمال سے اپنی چمک و بک کھونے لگی تو اسے پالش کی ایک ڈبہ اور برش خریدنے کا خیال آیا مگر وہ خود تو پالش کرنے سے رہا! پالش کون کرے گا؟ اسے باجرہ کا خیال آیا جو ابھی تک نری کی پرانی ہوتی کو ہر روز اگرچہ وہ پھنسا تو نہیں کرتا تھا لیکن صاف ضرور کیا کرتی تھی مگر باجرہ....

باجرہ انگریزی جوتے کے ساتھ برتاؤ کرنا کیا جانے۔ وہ تو گاؤں کی رہنے والی سیگا سادھی، صبح اٹھ کر پانچ سیر گندم چکی میں پیسنے اور باجرے کی موٹی موٹی روٹیاں پکھنے والی عورت، ایک دوسرے میں آٹے سیدھے کر کے اڑا کر رکھس ہوئی گرگابی کی طرف دیکھتے اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے سانبھی پان پر کھٹے کی تھد جھانے ہوئے اس نے سوچا۔ اس سالی کو کیا تسبیح (تمین) باپ دادا سدا نری کی جوتی پہنتے آیا سرسوں کے تیل میں ڈبوتے آتے؟ دل میں ایسا سوچتے ہوئے اس نے نری کی جوتی پہننے کے الزام کو باجرہ کے باپ دادا پر لگاتے ہوئے خود کو صاف صاف بچا لیا۔ جیسے رہ ہمیشہ سے یہی گرگابی پھنسا چلا آ رہا ہو۔

استاد دولز کا ایک پیکٹ دینا۔ ساتھ موہنی تبا کو دالا ڈبل کتے چونے کا پان۔ ایک مہاری اور کرخت آواز نے اسے جوتوں کے چکر سے نکال دیا۔ اور پھر گاؤں کے آنے جانے میں طرح طرح کے پان لگاتے، سگریٹوں کے پیکٹ دیتے،

وہ اپنے جوتے کو بھولے رہا۔

سہ پہر کا وقت تھا جب اوٹنگھتے اوٹنگھتے ہوتا پھر کمراس کی نگاہوں کے سامنے کھک گیا۔ وہ جلدی سے اپنی گتھی سے اُترا اور آبادی مٹے کوتاہ لگایا۔ جوتوں کو آہستہ آہستہ جیسے کاپرنگ کے ہوں مرکز پر جا کر رکھا اور پہن کر سوچی کی دکان پر چلا گیا۔

انور سر جھکائے، ہاتھ میں مٹی پکڑے ایک بوت میں اٹھری لگا رہا تھا کہ محمد صیف ایسی نگہ آتی ہوئی چال سے کہ جب آدمی دیر تک اتنی پانتی مار کر بیٹھنے کے بعد چلتا ہے، اس تک پہنچا۔

اسٹیج کی ایک خلی اور ایک لال چل کو پاؤں میں ڈال کر اُس نے جب اپنی نگاہ کو داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے پکڑ کر اس کے پاس رکھا تو محمد صیف کی نظرس انور کی میٹھی کی پھٹی ہوئی شلوار کے اندر سے چمک دیمک دکھاتی سنرے سنرے ریشے سے بُندان پر جا پڑیں۔ گاہک کی موجودگی سے باخبر ہو کر جب وہ اپنے خوب صورت چہرے پریشہ و راز منہ مسکراہٹ لایا تو اس کے پتلے پتلے اور لال لال ہڈیوں کے درمیان موتی کی طرح چمکتے ہوئے سفید دانت ایک لمے کو یوں لگے جیسے گلابی میٹھی پرکھن کی سفید سفید تہ جی ہوئی ہو۔ اور پھر خدا جانے بیڑا صلتی دو سپر انور کے چمکتے ہوئے جسم کی چاندنی تھی یا محمد صیف کی اوٹنگھتی آنکھوں کا تصور کہ اس کے منہ میں پانی بھرا آیا اور اس پانی کو جلدی جلدی ثروت کے شیریں گھونٹ کی طرح حلق سے نیچے آتے ہوئے اس نے کہا۔ ارے جوتہ پر ایک لمبر پاس کر دے مجھے دے جائیو، مجھے آن؟

پھر ایک مسکراہٹ اس نے انور پر ڈالی۔ دوبارہ وہی مسکراہٹ جواب میں چمکی، اور اس نے ماتھے پر پڑی ہوئی جھوٹے بالوں کی لٹ کو جھٹکا دیتے ہوئے نمبروں پاش

کایتین دلایا۔ اس ڈھلتی دو پہر میں محمد حنیف جب واپس آکر اپنی گدی پر بیٹھا تو اُسے یوں لگا جیسے وہ بہت تیز دھوپ میں چل کر آ رہا ہو اور اسے زور کی پیاس لگ رہی ہو۔

اور ایک صبح جب اس گلی کا یہ چھوٹا سا بازار کھلا تو عبدالرسول بساطیہ، بمشاید خانے کا مالک، آگاہ گندھنے والے فقیرے اور لمبے لمبے بازوؤں کو اکڑا کر چھنے والے چھوٹے اور اسٹیشنری بیچنے والے کے سامنے، سوچی اند کو محمد حنیف کی دکان میں اس کی گدی کے مقابل ایک نئی بنی ہوئی گدی پر بیٹھا ہوا دیکھ کر جیسے ہم کارگر چٹ گیا اور گردن اکڑا کر ٹھکرایا لے ہاں بنا کر، اسی تسخیر کے کھٹے ہوئے گریبان میں لگے کار کو گردن کے پیچھے ڈھکا کر چھنے والے چھوٹے کا زبانتہ کی سپاٹ سطح سے آگے کو جاکر گول گول طاقتور کلائی کے چوچوں پر مہرے لگے ہوئے منڈل زخم میں جیسے پھرے کھدبہ ہونے لگی۔ اند کی دہری سے لگے ہوئے زخم کے نشان والے ہاتھ کو کڑنے کی جیب میں ڈال کر ہلکے کی سگریٹ نکالتے ہوئے اس نے بمشاید خانے کے آگاہ گندھنے والے فقیرے سے جس کے بدن کا میل پسینہ ہو چو کر آٹے میں شامل ہوتا جا رہا تھا کہا۔

”اُسے فقیرے محمد حنیف سالہ کوئی بہت ہی جوان ہے جو یہ.....“

فقیرے نے چھوٹوں کی بات کو درمیان ہی سے کاٹتے اور ساتھ ہی اُسے ہونے پسینے کو اٹے ہاتھ کی دوا انگلیوں سے بچاؤ کر اٹے میں جھٹکتے ہوئے ہنس کر جواب دیا۔

”اُستاد اس میں کوئی بات نا ہے۔ تیرے سے جیسا کہ (مزید) جوان تو میں نے اپنی جندگی (زندگی) میں نا دیکھا ہے.....“ اور وہ پھر پھٹوں کو یوں ٹھہرا کر اور کرتے ہوئے گویا وہ چھوٹوں کے دل پر لگے زخم کی پٹی آٹا رہا ہو بولا۔ ”پسند اپنی اپنی سگریٹ

اکش کھینچ کر دھواں چھوڑتے ہوئے اپنے بدن کے کڑیل پن پر نظر پھسلانے ہوئے اس نے غرور سے گردن اٹھا کر کہا: ”پر میں بھی اپنی ماں کا نا ہوں جو.....“ اور یہ کہہ کر گھیر وار شہوار کے پھیر درست کرتا وہ صنفِ خنواڑی کی دکان کی طرف ہولیا۔ سامنے انور بوسکی کی کریم کار تھیں اور سفید شہوار بیٹے، ہونٹوں پر پان کا لاکھا جمائے، انارڑی کی طرح چوٹے اور کتے کی ٹکلیوں میں لکڑی کا گول گول چھپ چلا رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اس نے پتے لوگوں کی طرح خنواڑی کی نظریں جھکالیں۔ شاید ابھی تک اس کی نظروں میں وہ بے حیائی نہیں آ پائی تھی۔ چھوٹن زور سے پنجابی کے بول۔

تیرا پچھا نہیں اور چھٹنا اے

بادریں پہ جہان ہنٹکریاں

(تیرا پچھا نہیں چھوڑنا۔ بچا ہے ہنٹکریاں پڑ جائیں)

اپنے انور بوسکی میں گھاتا ہوا دکان کے سامنے سے گزر گیا۔ پنجابی وہ اکثر انوری بوسکی میں بولا کرتا انوریوں اپنے ساتھ لائے ہوئے کچھ کو اس زمین کے کچھ سے ملانے کی کوشش کیا کرتا۔

خنکریوں کا چھٹنا کچھوٹن کی آواز بن کر محمد صنف کے کانوں تک پہنچ گیا۔ کیدپش کے بیکٹ کو کھولتے ہوئے اس کی انگلیاں جہاں تھیں وہیں رہ گئیں۔ ایک تھرا کوڈ نظر کے ساتھ اس نے چھوٹن کی طرف دیکھا جو آگے نکل چکا تھا۔ اندر جس کی چوڑی چکی پیٹھ نظر آرہی تھی۔ پھر وہی تھرا کوڈ نظر پیار میں بدلی اور وہ اپنے سامنے بیٹھ ہوئے انور کو دیکھنے لگا۔ انور نے جس کی گوری گوری انگلیاں چوٹے کتے میں رنگ دار ہو گئی تھیں، نظریں جھکالیں، گویا کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ پہلے یہ ہاتھ پالش کی

سیاہی میں کالے ہوا کرتے تھے ادا بکتے چرنے میں لال۔

گلی کی ساری دکانوں میں انور احمد حنیف کی نئی دوستی کے بارے میں طرح طرح کی خبریں فضا میں چھوڑے جانے والے گیس کے غباروں کی طرح چھوڑی جاتی تھیں۔ اب انور کے پاس دو گھوڑا بوسکی کی قمیص اور پھلتے میں کھڑکھڑا کرتے ہوئے سفید لٹھے کی شلوار کے علاوہ کلائی میں کبھی گھڑی بھی چکنے لگی تھی۔ اور دائیں ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی میں لال رنگ لگی سونے کی انگوٹھی بھی اپنی بہادر دکھلاتی رہتی۔

چھوٹن ایک دن ڈبل پتی کا پان اور وٹز کی ایک سگریٹ لینے آیا۔ پیسے دیتے وقت اس نے دس کے کراسے نوٹ کو انور کی تہہ کی ہوئی ران پر دکھا اور دوسرے ہاتھ سے پان سنبھالا تو محمد حنیف کی مونچھوں کے بال غصے کے مارے تھرکتے گئے اور اس کی پان مٹی ہوئی باجھوں میں غصے کے مارے سفید سفید جھاگ نکل کر لال رنگ میں تبدیل ہونے لگی زندگی آواز میں اُس نے کہا۔

”دیکھ بے چھوٹن اب کی تو تو نے بدلتی (بدلتی) کر لی پر آگے کو کان رکھو۔ اپنی سگریٹ بھری کو لے جا اور کھیردار (خیردار) جو آئندہ اس دکان سے سودا کھیرنے (خریدنے) آیا، تیرے نہ آنے سے میری دکان چوٹ نہ ہو جائے گی۔ سمجھا۔ اور چھوٹن نے پیسوں کو گرتے کی جیب میں ڈالتے ہوئے بے حیائی سے کہا۔

”اُستاد نے نئے سکاری (شکاری) جو مل بانٹ کر کھاؤ۔ سمجھے؟“

”چل بے تیرے مل بانٹ کے کھانے والے کی....“ محمد حنیف نے چھوٹن کو ایسی رنگ دار گالی دی کہ پاس سے گزرتا ہوا خیرات مانگنے والا بوڑھا بھکاری تیز تیز قدموں کے ساتھ بغیر سوال کتے ہی آگے کو نکل گیا۔ چھوٹن نے ڈھٹائی سے محمد حنیف

کو دیکھا اور پھر ذریعہ بڑبڑاتا ہوا ہالار کو گردن کے پیچھے دھککا مارا، اکڑتا چلا گیا۔

نہ جانے اس میں چھوٹن کی بواہو سی کو دخل تھا یا لگی کے کسی دوسرے دکان دار کی رقابت اور حسد کو کہ محمد حنیف کے اس نئے شوق کا پتہ ہاجرہ کو بھی چل گیا۔ پہلے تو ہاجرہ کے کانوں کو یقین نہ آیا مگر جب بتانے والے نے ہراسرا پر سے پردہ سرکا یا اور وہ خود جوری چپے جاکر دکان پر بیٹھے ہوئے انور کو دیکھ آئی تو اس کا بدن سن سے رہ گیا۔

وہ تو محمد حنیف کے راتوں کو باہر رہنے کو کسی کوٹھے سے وابستہ کئے پہلی آر سی تھی اور اس بات کو صبر و شکر کر کے یوں تسلیم بھی کر چکی تھی گویا مرد کا اور کوٹھے کا رشتہ انہی بدیہی ابدی ہے جس کی راہ میں کوئی جوی مزام نہیں ہو سکتی مگر..... مگر اس بات کا کوئی

جواز نہیں تھا۔ جب وہ یہ سارا اثر مناک منظر دیکھ کر گھبرائی، لجائی، شرم میں ڈوبی ہوئی گرمی میں نہائی گھر واپس لوٹی اور برقعہ اتار کر عین کا تو گرنی کے سبب بالوں کی لٹیں ادھیڑ عمر کے چہرے پر چپک رہی تھیں۔ سامنے کا درخت پردہ سے آئینے میں اس نے اپنی صورت دیکھی اور دل ہی دل میں اپنا اور وقیب کا موازنہ کرنے لگی۔ اپنا اڑھٹ ہونا اور جلدی تناؤ کٹھناتہوا جسم اُسے میاں کے سامنے بیٹھنے والے لڑکے کے مقابلے

میں بالکل بے معنی سا لگا اور جب اس نے اپنے ڈھلے ہوئے سینے چھو سات بچے جننے کے بعد جن میں زندہ ایک ہی لڑکی بچی تھی، اپنے پیٹ کی ملائیت کے ختم ہو جانے کے بعد اس پر پڑی ہوئی سفید سفید چکلیوں اور آڑی تر چھی لکیروں کی طرف دیکھا، اور اپنی رانوں کا جائزہ لیا جو کبھی درخت کے تنے کی طرح سیدھی اوڑھت تھیں مگر اب..... ڈھلے ہوئے بغیر اتھری والے کپڑے کی طرح شکن دار ہو گئی تھیں تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ساری زندگی اکارت پہلی گئی ہو، اور وہ

مقصد پر راز نہ ہوا جو جس کے لئے اسے اتنے سارے لوگوں کے درمیان محمد صنیف ڈھولک ادا باجوں کی تیز تر آوازوں کے درمیان گھنٹری کی طرح اٹھا کر لایا تھا۔ برو کی ہوس کی کوئی حد نہیں ہوتی شاید..... اور پھر اُس نے زندگی کی بہت سی دوسری مکروہ اور ناگوار باتوں کی طرح اس بات کو بھی تسلیم کر لیا کہ اُس کا ایک اور رقیب بھی ہے جو اب اس کے نسبت 'خاوند' سے زیادہ قریب ہے۔

نکلیں ہی رہی چھوٹیں اب اس مگی کو چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا محمد اوز کی چھاتی اب بوڑھی قد لمبا اور چہرے پر سبزہ آگ آیا تھا۔ محمد صنیف نے اب اتنی لمبی دائرہ سی رکھ لی تھی گویا زندگی بھر اسے منڈوانے کا کفارہ ادا کر رہا ہو مگی کی اسی ٹکون والی جگہ پر جہاں کسی وہ بیٹھ کر جوتیاں اٹھا کرتا تھا۔ اس کا پان بٹری کھینا کیبن، لگ چکا تھا۔ کیبن کے اندر مگروٹوں کی ڈبیوں کے بیچوں بیچ لگے شیشے کے سین اور پر آیتہ، لکڑی سے تراشہ شیشہ لگے فریم میں اوپر کٹنگی ہوئی تھی۔ اور اس کے نیچے محمد صنیف اور اس کا ایک فوٹو ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے آویزاں تھا۔ ایک رات باہر کے پتنگ کے برابر والے پتنگ پر لیٹے ہوئے محمد صنیف نے کہا: میں نے اپنی سیم (شمیم) کے واسطے چھوکر ڈھونڈ لیا ہے۔ ری۔ اپنی ہی بیسے (پیشے) کا ہے 'میری' دکان سے جہاں (درا) ہٹ کر اس نے نئی نئی دکان کھولی ہے۔ لڑکا سریف (شریف) ہے اور فرما نبردار۔

محمد صنیف کے منہ سے یہ بات سن کر بارہ کے دل میں نہ جانے کون سی دہائی ہوئی، دھیسے دھیسے لگتی ہوئی چنگاری نے سزا اٹھایا مگر پھر صبر کا ہتھیار استعمال کرتے ہوئے اُس نے اُسے آگ میں تبدیل کرنے میں دیا۔ اور ہاں ناں میں کوئی جواب

دیئے بغیر بنی گزشت چڑھی پڑی چکی کمر کو محمد حنیف کی طرف سے پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

اگلے دن صبح ہوتے ہی محمد حنیف کے دکان پر جانے کے بعد وہ اس ٹیڈ کے کو دیکھنے اور اپنے ٹیڈے کی تردید کرنے لگی۔ لیکن وہاں جا کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ انور بے تردید حقیقت بنا پھرتی سے انگلیاں چلا چلا کر گاہکوں کو گلو ریاں دے رہا تھا۔ اس کے دل میں کئی جذبوں نے سُراٹھ ایا مگر مدتوں پہلے کی طرح اس نے اس فیصلے کو بھی بے یون و چرا تسلیم کر لیا۔

ہاجرہ کو نے میں بنی ہوئی گیارہ کے قریب پلنگ ڈالے بے سندھ پڑی سو رہی تھی۔ چاند نے اب اتنا سفر طے کر لیا تھا کہ وہ اس کے مکان سے آگے کے دو منزلہ مکان کے پیچھے جا کر بچھلے گھر کے صحن سے اپنی چاندنی سمیٹ کر لے جا چکا تھا۔ ضمیم کے کمرے سے ایک لمبا تڑنگ سیاہی دے پاؤں نکلا۔ ہاجرہ اس نے سانس روک کر ایک نظر پڑھی ہاجرہ کی طرف دیکھا اور پھر دے قدموں سے چلتا ہوا ہاجرہ کے کمرے میں چلا گیا۔

محمد حنیف اور ہاجرہ اب برابر برابر پلنگ بچھا کر نہیں سوتے تھے۔ کیونکہ گھر میں ایک تو داماد تھا اور دوسرے اب وہ دونوں عمر کے اس مرحلے میں تھے جہاں کوئی کہیں پڑ رہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔

آنکھیں بند تھیں ہوئے محمد حنیف نے چونک کر پوچھا۔

”کون؟“

لپٹے ٹرنگے سانس نے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

تیر تیز سانسوں کے آنے جانے کے دوران جیسے اندر سے کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا ہو، اس نے منہ کا غفوک نکلتے ہوئے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا: میں ہوں انور۔“

”انور جا کر سو جاؤ اب تم میرے داماد ہو۔“ نیند کے خماری سے بھری ہوئی آواز نے کہا۔

”نیا دور“ کراچی

فنکار

میں نے اس کو بارہائی بس اسٹاپوں پر دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا۔ جد سے زیادہ پہلی گڈری میں بیٹھے ہوئے گندی دارھی والے ایک پر گھٹنے سے غائب اور ستر ہوا ایسے بیک سنگوں پر قوس آنے کے بجائے مجھے گھن آیا کرتی تھی۔ مگر آج بجیک لائن کے بس اسٹاپ پر میں اس کے پاس سے گزرا تو اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا جو گندی دارھی میں قریب قریب چھپا ہوا تھا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ چہرہ ایک جوان کا تھا اور میرا شعور اس سے مانوس معلوم ہوتا تھا۔

”ادھر آئیے۔“ اس نے کہا اور بس اسٹاپ سے اپنی بیس کیوں پر اچکنو کے کنارے چلا۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے گھینا جاتا تھا مگر اس وقت وہ کچھ اس طرح سے دلچسپ ہو گیا تھا کہ میں اس کے پاس پہنچ ہی گیا۔

”میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔“ اس نے ایسے لمبے میں کہا جو مجھے مانوس معلوم

ہوا۔ اور پھر اس نے آیت کے بجائے آؤ کہا جس سے مجھے محسوس ہوا کہ یہ مجھے
برابری بتانا چاہتا تھا

وہ آگے آگے اور میں اس سے کچھ دُور پیچھے دیکھتے بڑھتے رہے۔ وہ پھر پھر
مجھے دیکھتا رہا اور پچلے آؤ کہتا رہا۔ اس کا وہانا وار بھی مرنے والوں میں چھاپا ہوا تھا
مگر نہ کھینیں برابر شکر اور ہی نہیں میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون ہے اور کچھ کچھ یاد کر رہا
تھا کہ اسے یا اس کے سے کسی کو کہاں دیکھا تھا۔

کوئی چالیس قدم جا کر وہ ایک گلی میں ٹرا اور پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ زیادہ
دور نہیں جانا ہے چلے آؤ۔

اس گلی کو پار کر کے وہ ایک اور گلی میں ٹرا جو بہت تنگ تھی ایسی تنگ جیسی کوئی
میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس گلی میں وہ ایک دروازے کے پاس پہنچا
اور اپنی گڈی میں سے ہاتھ نکال کر دروازے میں لگے ہوئے قفل کو کھولا۔ اور پھر
دروازہ کھولا۔ میں نے دیکھا کہ دروازے سے ایک زمین اُپر کو جا رہا تھا۔ اس پر وہ
پہنچا کیاں ٹکاتا ہوا چڑھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چڑھا گیا۔ اس نے دہانے
کو ایک دروازہ کھولا اور بولا: تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ آؤ یہاں کمرے میں بیٹھو
میں ابھی آتا ہوں۔

میں اس کمرے میں داخل ہوا جس کو اس نے کھولا تھا۔ یہ کمرہ نہایت عمدہ
سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا۔ اس میں سے ہوتا ہوا برابر کے کمرے میں چلا گیا اور
صوفے پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دروازوں پر بہت
اچھے پردے تھے۔ زمین پر نہایت عمدہ قالین تھا جس کنارے دو صوفے سٹ

گئے تھے۔ بیچ میں دو چھوٹی میزیں نہیں جن پر سگریٹ اور سگار کیس اور رائیٹ ٹرسے
نہیں۔ میں ان چیزوں کو بے خیالی میں ہی دیکھ رہا تھا کہ برابر والے کمرے کے دروازے
سے ایک جوان صاف محل کا کرتہ اور ساٹن کا پاجامہ پہنے ہوئے ہنستا ہوا آیا۔

میرے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا: ”اب تم نے مجھے پہچانا کہ نہیں؟“
میں نے غور سے دیکھ کر کہا: ”تم وہی بھکاری ہو جو مجھے یہاں تک لا گئے؟“
”بس اتنا ہی پہچانا اور کچھ یاد نہیں آتا۔“ اور یہ کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسا میں نے

اسے پہچانتے ہوئے کہا: ”ارے تو جیسی ہے،‘ دھتی‘؟“

”ہاں۔“

”مگر تو نے یہ سب کیا لگا رکھا ہے۔ تو تو امپیریل سکریٹریٹ میں آگیا تھا پھر

تجربے سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ یہاں کب آیا؟“

”میں نے پاکستان آپٹ کر لیا تھا۔ یہاں آکر دو ہی برس میں میگزینڈنٹ ہو گیا

تھا مگر...“

”ملازمت چھٹ گئی۔“

”ہاں مجھے بھی اس کمین بکرو یا گیا تھا۔ جڑی مشکل سے ایک سال گزر ا، کموشادی

نہیں کی تھی بچے نہیں تھے ورنہ ناتوں پر نوبت آجاتی؟“

”مگر اب ختم یہ کیا کر رہے ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس گندے ٹائیگ کٹے

بیساکھیوں پر چلتے ہوئے بھکاری کے بھیس میں تم ہی تھے؟“

”بھکاری کریپل بیگرا“ کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا: ”یہ میرا فنی سمجھو میری

برنس۔ میری شاپ۔ ہم تم کوئی چودہ برس کے بعد ملے ہیں۔ میں نے بارہا تمہیں دیکھا

مگر تم نے میری طرف رخ ہی نہیں کیا۔ آج جا کر متوجہ ہوئے۔ آتی ڈونٹ تاک فزید
اس کو چھوڑو۔ اب میں وہی ہوں جو تمہارا ہم جماعت تھا۔ کتنے برس ہو گئے۔
۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۶ء چودہ برس ہو گئے۔

”تم ۱۹۳۶ء ہی میں امیر پل سکریٹری میں آ گئے تھے اور دہائی چلے گئے تھے
اور ۱۹۴۶ء میں میں نے پاکستان آپٹ کیا اور ۱۹۴۸ء میں آسکر میں چم گیا۔
”اور پھر یہ بھکاری بن گیا۔ کیا تو ہی بھکاری ہے یا کوئی اور؟ یقین نہیں آتا۔
اتنی گندگی لاتا ہے۔ تجھے گھن بھی نہیں آتی؟“

”میں کہتا ہوں دماغ پر گندگی لاد لینے سے جسم پر گندگی لاد لینا بہتر ہے۔ کیا
بتاؤں تجھ سے پہلے پہلے یہاں محسوس ہوا کہ بہت اچھا ہوں مگر پھر لاق علی خاں
کے قتل کے بعد ہر مذہب پر ایسے ایسے احمق سوار مہ نے لگے۔ ایسی ایسی حماقت زدہ
باتیں کرنے لگے کہ دماغ بل ہل جاتا۔ اور ان۔ ان۔ سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ کوئی
احمق کے ماتحت آجاتے۔ سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ گدھوں کے ہاتھ میں آتھا
چلا جائے۔ کیا بتاؤں میں کیسا کھول کھول کر دبا۔ مگر برداشت کرتا رہا۔ اور پھر گدھوں
نے مجھے اسکرین کرا کے ہی چھوڑا۔“

”ہاں یہ تو میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ احمق کی ماتحتی میں کام کرنا کیسا جہنم ہے
مگر میں نے احمقوں کو چلانا بھی سیکھ لیا ہے۔“

”میں بھی سیکھ جاتا شاید۔ مگر اسکرین ہی ہو گیا۔ اس فلیٹ پر میں نے پہلے
ہی قبضہ کر لیا تھا۔ بس یہ میرے پاس تھا اور میں سڑکوں پر پھرنے لگا، کئی فرموں میں
ڈوگری کی مگر وہی احمق راج، حجاب رت کے لئے پیسے پاس نہ تھا۔ ایک دن رات گئے

اس گلی میں آیا تو دو آدمی باتیں کرنے سُنائی دیئے۔ ایک آواز آئی۔ ”میری تو مینا لیس کی رہی آج۔“ دوسری آواز آئی۔ ”مجھے پورے باون ملے۔“ میں ان کے قریب آیا تو دیکھا کہ دونوں بھکاری تھے۔ میں نے دل میں کہا، ”آئیں۔ ان بھکاریوں کو اوسطاً پچاس روز مل جاتے ہیں۔“ ٹر بڑھ ہزار روپیہ مہینہ اد میں ہوں کہ پانچ چھ سو کی نوکریوں کی تلاش میں پھرتا ہوں۔ چونے کھاتا ہوں، کھوتا ہوں۔“

”تو تو بھی بھکاری بن گیا۔“

”میرے دل میں بھی آئی کہ بھکاری بن جاؤں، تمہیں یاد ہے کہ ایک وہ محمود مختا نہیں اپنے ساتھ جوی۔ اسے کے بعد ساٹھ روپیہ کی نوکری پر گیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر سو روپیہ ماہوار پر سڑکوں پر جھاڑو دینے کی نوکری مل جائے تو اسے کروں مگر سڑکوں پر جھاڑو دینے والے کو اس وقت کوئی دس بارہ روپیہ ہی ملتا تھا۔ میں نے وہ ساٹھ روپیہ کا کلرک ہی رہا۔ ہمارے یہاں قیروں کو بھی زیادہ سے زیادہ آٹھ دس آنے روز مل جایا کرتے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہاں بڑا شہر ہے دو چار روز مل جاتے ہوں گے حد سے حد پانچ۔ مگر یہ سن کر کہ ان دو بھکاریوں کو چالیس سے پچاس کے درمیان ملے تھے میں سوچنے لگا کہ مارا مارا پھرنے کے بجائے اگر یہی کرنے لگوں تو کیا ہو مگر اس کام کے لئے مجھے اپنے کو اچھی طرح چھپانا ضروری تھا ورنہ پہچاننے والے بہت تھے۔ جی وقت ہوتی۔“

”تو تو نے یہ سب گندہ سامان اڈھ لیا اور اس میں چھپ گیا۔“

”نہیں یاد! یہ کام بھی اکدم سے نہیں ہو جاتا ہے اس کے لئے بھی تعلیم سیکھنا۔“

”استاد ٹیلنٹ سب ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور کافی دیر میں بیٹن آتا ہے۔“

میں کہتا ہوں کہ شاعری کے فن کی طرح یہ بھی ایک فن ہے۔
مگر شاعر بھیک منگا تو نہیں ہوتا۔

”بڑے شاعر اپنی خودداری پر قائم رہے مگر اصل میں وہ بھی دست نگرہی تھے۔ میر صاحب آصف الدولہ سے اکڑے۔ گمراہ آصف الدولہ بڑے نیک بادشاہ تھے نہیں تو بھوکوں مر جاتے۔ مگر اشد غیروہ کو دیکھو۔ دل چٹے بھیک منگے نہیں تھے تو کیا خیر ان سب کو جانے دو جن کے نام تار بن میں آگئے ہیں۔ میں اپنی طرف ہر تعلقہ دار کے میاں ایک شاعر بھی دیکھتا تھا جو کسی طرح بھیک منگوں سے حشک نہیں ہوا کرتا تھا۔ بہر حال میں نے پہلے خود کرنا شروع کیا کہ اس بچے کی ذات سے دل کو جو بھیک محسوس ہوتی تھی اس پر قابو کر لوں۔ سوچے سوچتے یہ سمجھ میں آیا کہ دنیا بھر میں اتنی فی صد لوگ بھیک منگوں کی ذہنیت رکھتے ہیں۔ ہر دھڑ ہر ادارے۔ ہر کام میں بھیک دینے والے اور بھیک لینے والے ہی نظر آئے۔ ہر ایک اپنے اوپر والے سے یہاں بھیک ہی مانگتا ہے اور اپنے سے نیچے کو بھیک دیتا ہے۔ اگر میری ذہنیت بھیک منگے کی ہوتی تو کبھی اسکرین نہ ہوتا۔“

”بات تو کو سچ ہی کہہ رہا ہے۔ مگر اس میں مبالغہ بھی شامل ہے۔“

”مبالغہ بالکل نہیں۔ یہاں قانون کا عدسے اور انصاف کا خیال نہ ہو دہاں سب یا تو ڈاکو ہو جاتے ہیں یا فقیر۔“

”تو تو مجھے فقیر کے ڈاکو بننا۔ اس میں لاکھوں کے دارے نیارے ہوتے۔“

”اس میں بڑی جلدی پکڑا جاتا۔ سب کھائی لنگ جاتی۔ ڈکیتی جرم ہے۔“

بھیک مانگنا جرم نہیں ہے۔ ڈکیت سے ہر شخص غٹ ہوتا ہے۔ فقیر پر ہر شخص تڑپ

کھاتا ہے۔ فرض ایک ہفتہ کے اندر ہی میں نے اپنے دل کو بھیک منگوانے پر راضی کر لیا۔ اب سوال آیا عمل کو تو میں اب برس اسٹاپ پر جا کر کھڑا ہوا اور وہاں سے گزرتے ہوئے ہر فیکر کو عبور دیکھا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ اسی فی صدی بنے ہوئے ہیں۔ اپنے کو گندہ بنا رکھا ہے تاکہ کوئی غور سے نہ دیکھے۔ مجھے بھی ان کی گند کی پر پہلے پہلے ہڑی گھس آئی مگر بعد میں محسوس ہوا کہ خوشامدی اپنے دھن اور دھن دھنوں کو پست یا گندہ بنائے رہتے ہیں تاکہ ان کو دینے والا ان سے خوش رہے۔ ہر قسم کی ذہنی کثافت اور جتنے ہیں تاکہ ان کے اندر چھپی ہوئی روح دکھائی نہ دے۔ پھر دوسری چیز یہ نظر آئی کہ جتنی ترس ناک صورت بنائی جائے گی اتنا ہی زیادہ بھیک ملنے کے امکان میں۔ میں نے اس سلسلے میں بھی خوشامدی لوگوں کا فقروں سے مقابلہ کیا۔ وہ بھی بوس کو خوش کر کے اپنا دوتا رونے لگتے ہیں اور اپنے کو ترس کے قابل ثابت کر دیتے ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے مگر تجھے یہ ظاہری سامان کہاں سے بلا؟

”خیر جب میں نے طے کر لیا کہ بھیک منگا ہی جنوں گا تو پھر ایک اُستاد کی ضرورت ہوئی اور وہ بھی مل گیا۔“

”کسی بھیک منگنے سے تجھے یہ سب سیکھا پڑا۔ خود نہیں کر سکتا تھا؟“

”مگر دلم ہوں تجھ سے کہ یہ فن ہے، فائن آرٹ ہے۔ ایسے ویسے ہی آجاتا؟ خیر سن تو مجھے اُستاد بھی کیسا ملا۔ تجھے بڑا تعجب ہو گا۔“

”تعجب کی کیا بات؟“

”وہ اُستاد نہیں اُستاد فی حق۔ مرد نہیں عورت تھی۔“

”عورت؟ عورت جب صاف ہو تو اس سے زیادہ صاف چیز ممکن نہیں۔ اور

جب گندی ہو تو اس سے زیادہ گندی تو کوئی گندی گرٹیا بھی نہیں ہوتی۔ کوئی بڑی گندی بڑی ہی گندی عورت ہوگی، اس کا ذکر نہ کر مجھے سوچ کر ہی گھسی اڑ ہی ہے۔
 "میں تو سہی۔ میری فن کاری تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک کہ میری آستانی کے فن کو نہ جانے۔ یہ لکھیہ تو ہم نے سانچہ پڑھا تھا تاکہ فنکار کی روایت کا مطالعہ ضروری ہے؟"

"اچھا خیر تاؤ۔ وہ کون تھی اور کیسی تھی؟
 "مجھے دکھا بھی دوں گا کہ کون ہے اور کیسی ہے؟
 "میں دیکھنے سے باز آیا۔ اپنا تھوڑا سا۔"

"جس دیکھ کا تو نے مجھے دیکھا بالکل اسی طرح کا ایک فقیر تھا اور اس کے ساتھ ایک عورت چھرتی تھی۔ سا نولا رنگ، منہ ہر قسم کے میلے دجے۔ ناک پر ایسا نشان، جیسے کسی نے ناک کاٹنے کی کوشش کی ہو، انکھیں چڑائی ہوئی اور پانی بہتا ہوا، بال بکھرے ہوئے اور ٹٹیں پڑی ہوئی جو منہ پر لٹکتی تھیں۔ کپڑے حد سے زیادہ سیلے۔ ناک بھی ہستی ہوئی تھی۔ اور بار بار اپنی حد سے زیادہ سیلی پیاد سے پونچھ لیتی تھی فقیر بہت بڑھا تھا۔ اور بس اسٹینڈ پر آکر گر جاتا تھا۔ فقیروں کا مطالعہ کرنے میں میں نے ان کو بار بار غور سے دیکھا۔ شاید اس لئے اور بھی ان کو ضرور دیکھا کہ ان سے زیادہ گندے ممکن ہی نہیں تھے۔ عورت کی حد سے زیادہ گندگی کے پیچھے مجھے کوئی پر اسرار بات نظر آئی۔ میں ان کو ہر پھر کر دیکھنے آتا۔ اور ایک دن جب وہ جانے لگے تو ان کے پیچھے ہولیا۔ بڑھا بڑی شکل سے چل پاتا تھا۔ عورت اسے سہارا دیتی تھی۔ آخر کو انہوں نے رکشہ کی۔ میں نے بھی ایک رکشہ کی

اور کہا کہ ان کے پیچھے پیچھے چلو۔ دونوں رکشے آگے پیچھے چلتے رہے اور ڈی سلواناؤن پہنچے۔ میری جیب میں کل پانچ روپیہ کا نوٹ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر رکشہ کا کرایہ زیادہ ہو گیا تو کہاں سے دوں گا اور پھر واپسی کیسے ہوئی۔ مگر میں نے دیکھا کہ آگے کا رکشہ ایک ادھ بنے بغیر پلاسٹر کے بنگلے پر جو سب سے اگلا تھا ڈکاوڑ دونوں اتر ہی رہے تھے کہ میں نے اپنا رکشہ بھی رکوا دیا۔ کرایہ کوئی چار کے قریب ہوا تھا۔ وہ میں نے ادا کیا اور لپکتا ہوا ان دونوں کی طرف بڑھا۔ وہ بنگلے میں چلے گئے۔ میں سسٹاپٹا کر رہ گیا۔ دہاں اس وقت تک بہت ہی کم آبادی تھی۔ اور بس لینے کے لئے کافی دور جانا پڑتا تھا۔ کچھ دیر میں سوچتا رہا کہ اگر ان لوگوں سے ملاقات نہ ہوئی تو پھر کوئی بات نہ ہوئی۔ مکان سے کچھ دور پر میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا پھر خیال آیا کہ بھیک مانگنے کا عمل شروع کرنے کے لئے اچھا موقع ہے۔ میں اٹھا کر اس ادھ بنے بغیر پلاسٹر کے گھر کی طرف بڑھا اور جدھر سے وہ دونوں گئے تھے وہاں پہنچ کر آواز لگانے کی کوشش کی مگر وہاں سے آواز نہیں نکلی۔ کئی دفعہ کوشش کر کے میں نے کہا: ”اٹھ کے نام پر...“ اور پھر آگے سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں خیر امتی ہی آواز کا گرہ نہ گئی۔ سامنے کی طرف ایک گھر کی تھی اس میں سے ایک جوان لڑکی سانولی رنگت کی جھانکی۔

”یہ وہی گسنولی عورت تھی؟“

”اس وقت بالکل یقین نہیں ہوا کہ وہی تھی۔ اس کی سانولی رنگت میں عجیب کیف تھا۔ چہرہ پر کہیں کوئی دھبہ یا نشان نہ تھا۔ ناک پر کٹے کا نشان بھی غائب تھا۔ آنکھیں کٹورا ایسی کھلی تھیں اور وہ ایک ہی جھلک میں مجھے صفائی اور

نفاس کا محسوس نظر آئی۔ میں پھر آواز لگانا بھول ہی گیا۔ وہ کھڑکی سے غائب ہو گئی۔ پھر اس جگہ سے آواز آئی جو مکان کا خاص دردناک ہونے والا تھا اور جس میں ابھی دردناک نہیں لگتا تھا۔ اوجڑ جائے بیٹیں اور گر گیا وہ دیوار کی آڑ میں رہی اور کہتی رہی۔

”میں اس وقت بڑی مشکل میں ہوں میرے والد کو دل کا دورہ ہو چکا ہے۔ دوا کی سخت ضرورت ہے۔ آپ پر میں اعتبار کر کے روپے اور نسخہ دیتی ہوں۔ جلد سے جلد جا کر دوا لائیجئے مجھے آپ کی صورت دیکھتے ہی آپ پر اعتبار ہو گیا اور آپ یہ کام ضرور کر دیں گے جلدی“ اور یہ کہہ کر اس نے نسخہ اور پچاس روپیہ کے نوٹ آڑ سے ہاتھ بڑھا کر مجھے دیئے۔

”تو وہ روپیہ لے بیٹھ رہتا تو وہ کیا کر لیتی؟“

”کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ مگر یا کچھ باتیں بڑی پر اسرار ہوتی ہیں اور انسان کو بڑی

طرح باندھ لیتی ہیں اس کے اعتبار نے میرے دل سے ہر خیال نکال دیا۔“

”اور یہ بھی تو کہہ کر اس کے حسن نے باندھ لیا۔“

”ایک حد تک یہ بھی ہو سکتا ہے مگر اس وقت میرے اندر وہ انسان جاگ

گیا جو اعتبار کرنے والے کو دھوکہ دینے سے گریز کرتا ہے اور پھر میرے اندر ایک

عزم بھی پیدا ہو گیا جس کے ماتحت میں لپکتا ہوا بیس اسٹینڈ کی طرف چلا۔ اتفاق

سے ایک رکشہ بھی جاتی دکھائی دی اور اس پر بیٹھ کر ناظم آباد تک پہنچا جہاں اُنٹر کورڈنگ

کی دکانوں پر میں نے نسخہ دکھایا چھتیس روپیہ کی دوا ملی اور میں اسے لے کر پھر

رکشہ پر روانہ ہوا اور اس گھوڑے پہنچ گیا۔ جب میری رکشہ اس گھر پہنچی تو وہ کھڑکی

پر آئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی مگر مجھے دیکھتے ہی وہ کھل کر بولی ”پہلے آئیے“

میں دو دانہ پیر پہنچا اور مرگ گیا۔ پھر آواز آئی، ”اندرا آجائے نا“ میں اندر گیا ایک ادھر بنے کمرے سے ہو کر دوسرے کمرے میں پہنچا جو ہر طرح مکمل تھا۔ یہاں مسری پر جس پر نہایت صاف بستر تھا ایک بڈھا پڑا بڑی لمبی لمبی سانس لے رہا تھا۔ دو این نے اس لشکی کو دے دی تھی۔ اس نے مجھے مسری کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود دوانا پنے لگی۔

”آپ انہیں سنبھال کر اٹھا لیجئے“ اس نے کہا

میں نے بڈھے کو پیٹھ کے نیچے ہاتھ لگا کر اٹھایا اور اس نے اس کے منہ میں دو ڈال دی۔ بڈھے نے کچھ منہ بنایا اس کے سانس میں کچھ فرق آیا۔ میں نے بے ٹاویا اور وہ سونے سا لگ گیا۔ ہم دونوں بستر کے پاس کھڑے ہوئے کافی دیر تک اس کی حالت کو دیکھتے رہے پھر وہ غافل ہو گیا اس نے پھر مجھے پیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ بڈھا خراٹے لینے لگا۔

”اب ٹھیک ہو گئے۔“ وہ اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بولی۔ میں نے قہر اٹھا کر دوا لینے کے لئے جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ آپ کی آواز آئی۔ آپ کیا چاہتے تھے۔ اب بتائیے“

”میں بھک منگا بننا چاہتا ہوں اور اس کی پہلی کوشش میں نے آپ کے دروازے پر کی“

”مگر ناکام رہے ہیں بڑی مشکل سے آتا ہے“ وہ مسکرا کر بولی اور اپنے سفید دوپٹے کو جو اس کے رنگ پر کھیل رہا تھا سر پر سنبھالا اور اور کہتی رہی۔ ”آپ کئی دن سے ہم لوگوں کے پاس آ کر جاتے رہے اور آج آپ نے ہمارا صاف ہیچا کیا۔“

میں نے ابا سے کہا کہ یہ مرد ہم لوگوں کے پیچھے لگا ہے۔ انہوں نے اپنے تجزیے سے کہا شاید وہ بھی ہمارے پیشے میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ اچھا اگر اور قریب آیا تو اسے راہ سے لگائیں گے۔ یوں باتیں کرتے کرتے ان پر دورہ پڑا۔ میں نے دوا کی پیشی دیکھی سب دوا ختم ہو چکی تھی میں نے برقعہ اٹھایا یہی تھا کہ آپ کی آواز آئی۔

”آپ کو یہ خیال نہیں ہو اگر میں پچاس روپیہ لے کر بھاگ جاؤں گا؟“

”ہرگز نہیں۔ آٹھ برس سے چہرے دیکھتے دیکھتے مجھے آدمی کی پہچان ہو گئی

ہے اور آپ کا پریشان چہرہ کھویا کھویا کسی تلاش میں۔ روز ہی دیکھا کرتی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آپ ہم لوگوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ کیوں ہے نہیں؟“

”میں نے کہا بات یہی ہے۔“

”اچھا تو پھر آپ میرے ان والد کی جگہ لے لیں۔ یہ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔

میں آپ کو ان کی طرح سجادوں کی، کل صبح تڑکے ہی آجائیے؟“

”میں نے سوچا کہ میری جیب میں قریب بارہ آنے ہی ہیں۔ اس وقت جہاں کل

پھر آنا پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ خیر گھر پر یعنی یہاں میرے پاس پیسے تھے اس نے

میں نے اس سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس نے خود کہا۔ پیسے نہ ہوں تو میں

دے دوں؟ مگر میں نے کہا۔ ابھی اس حد کو نہیں پہنچا ہوں۔ اور اس کے بعد میں

اس کے یہاں سے چلا آیا۔

”واہ میں تو سمجھا تھا کہ رات کو تو وہیں رہ گیا اور اس طرح سے اختلاط ہو گیا۔“

”اور کوئی تڑکی ہوتی تو یہ ممکن تھا۔ مگر وہ تڑکی عجیب چیز تھی اور اب بھی عجیب ہے

میں تجھے دکھاؤں گا۔ وہ بالکل آسانی ہے بالکل۔ آٹھ برس بھیک مانگنے نے

اسے بڑا پنگا کر دیا تھا۔ اور تو اس سے باتیں کر کے دیکھے گا کہ اس کا ذہن کس قدر بخت ہے۔ خیر دوسرے دن میں آگیا۔ بڑھا ٹھیک تھا۔ لڑکی گھناؤنی من چکی تھی۔ اور مجھے دیکھ کر ہنسی اس نے اپنے باپ کے فقیروں والے سب کپڑے مجھے پہنائے میری ٹانگ میٹھی کر کے اس پر قہما اور جعلی بانڈھی۔ بیساکھیاں دیں۔ غرض میں نے قیادام آئینے میں جو اس لڑکی کے کمرے میں رکھا تھا دیکھا تو میں بالکل فقیر معلوم ہوا تھا اپنے کو پہچان نہیں سکتا تھا۔“

”گھاس بٹھے کے چہرے پر ہجڑیاں ہوں گی اور تیرا چہرہ تو صاف ہے۔“
 ”وارھی مونچھوں، گندے دھبوں، ناک انگول، ماتھا سب ہی پر میل لگا لینے سے میرا خیال بھی اس طرف نہیں گیا کہ میرے چہرے پر ہجڑیاں ہیں بھی کہ نہیں۔ اور میٹیک دینے والوں میں چہرے کو کون غور سے دیکھتا ہے۔ اور میری دلچ دیکھ کر لوگ منہ بھی لیتے ہیں اور زیادہ تر منہ پھیر کر ہی پیسے پھینکتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ پہلے ہی دن مجھے چشمہ ٹن کا وہ قول یاد آیا جو میں نے اور کو نے ایک ساتھ بڑھا تھا کہ لوگ ایک سرے کو غور سے دیکھتے ہی نہیں اور خاص پیشیوں کے آدمیوں کی تو محض دردی ہی دیکھتے ہیں۔ یا نہ ہے نا تجھے وہ ناقد براؤن والا قصہ اور اس شخص کا کیا نام ہے اس کا جو ڈاکٹری دردی ہیں کھان نکل جاتا ہے اور کوئی اس پر شبہ بھی نہیں کرتا کہ یہ مجرم ہے۔“
 ”ٹھیک ہے میں تجھ سے بار بار ہلا کر کہی تجھے غور سے نہیں دیکھا۔“

”تو خیر کئی دن تک میں اور وہ لڑکی ساتھ ساتھ بھیک مانگتے رہے میں اسے یہاں بھی لایا۔ مجھے اس سے محبت ہو گئی اور میں نے اس کے باپ کی اجازت سے اس سے نکاح کر لیا۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ نہیں آئی۔ میں خود رہا ہوں گیا

ہل ہر صبح اٹھ بجے سے کام پڑاتا ہوں۔ دو بجے تک کم سے کم پچاس کما لیتا ہوں کبھی اس سے پہلے ہی پچاس ہو جاتے ہیں تو یہاں آکر وہ کپڑے اُتار دیتا ہوں اور گھر چلا جاتا ہوں۔ یہ فلیٹ میرا اسٹوڈیو سمجھو مگر وہی ہے چل میں تھے دکھاؤں؟

وہ فلیٹ کے اندر والے کمرے میں گیا۔ اور وہاں سے پورا آپ ٹوٹین جھٹکین بن کر آیا۔ ہم دونوں فلیٹ میں قفل ڈال کر باہر سرک پڑا۔ وہ ایک گراچ پرہنچا اور وہاں گراچ والوں کو پیسے دے کر ایک نہایت نفیس فوکس داگن کار میں بیٹھا۔ اور مجھے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ وہ بولا: "کار میں یہاں چھوڑ دیتا ہوں۔ ان سے حساب ہے کچھ پیسے اور دے دیتا ہوں فلیٹ پر پہنچ کر درج بدلتا ہوں اور کام ختم کر کے پھر یہاں آجاتا ہوں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں کسی بڑے دفتر میں ملازم ہوں۔ غرض ہم دونوں ٹوی سلواٹون پہنچے اور ایک مکمل سینگے پر اتارے اُس نے گراچ پر گاڑی کھڑی کی اور باہر آکر کہا: "یہ وہی سینگے ہے جس سے میرا قصہ شروع ہوتا ہے۔ اب ہم نے اسے مکمل کر لیا ہے۔ چار برس میں؟"

دسی نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اندر چلا گیا تھوڑی دیر کے

بعد وہ میرے پاس آکر بیٹھا اور آواز لگائی: "آج آنا سمینہ شرم کا ہے کی؟"

سمینہ داخل ہوئی اسے دیکھ کر مجھے اپنے ذہنات کی وہ لوکیاں یاد آئیں جن کا ناک نقشہ بس واجبی واجبی اچھا ہوتا تھا۔ مگر سائلی رنگت کا تنگ خاص طور پر جاذبِ نظر ہوا کرتا تھا۔ مگر سمینہ ان سب سے ان معنوں میں بہتر تھی کہ اس کے چہرے پر ایک خاص ذہانت معلوم ہوتی تھی کہ زندگی کے تجربے نے اس میں ایک بردباری اور ایک توازن پیدا کر دیا تھا جو دیکھتی پن کا بالکل متضاد تھا۔ وہ کھانے کی میز پر

کھانے کا سامان ٹھیک کرنے لگی اور میں نے دسی سے کہا: ”تو برا خوش قسمت ہے ایسی بیوی کہیں ڈھونڈنے نہ ملتی اور تجھے آسمان سے ٹپک کر مل گئی۔“

”بیوی نہیں، ہر بات میں میری آسانی ہے۔“

سمینہ کے ساتھ ہم مینو پر بیٹھے وہ مسکرائی اور بولی: ”جلد سے جلد میں ان سے یہ کام چھڑانے والی ہوں۔ ایک زمین اور لے لی ہے۔ اس پر مکان بن جائے بس اس کے کرایہ سے اس مکان میں رہا کریں گے۔ وہ فلیٹ بھی جو ان کا بچہ کام ختم کرنے پر یکجائے گا اس کے روپیہ سے بھی کوئی آمدنی کر لیں گے۔ انہوں نے موٹر لے لی تھی، ورنہ اب تک سب ٹھیک ہو جاتا، خیر اچھا ہوا موٹر بھی ضروری چیز ہو گئی ہے۔ آج کل۔“

”مگر فن کار اپنا فن کبھی چھوڑتا ہے۔ اس پر چلنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔

دسی نے کہا: ”مگر یہ فن ایسا نہیں ہے۔ ان کے والد نے یہاں آکر اختیار کیا۔ بور ہو گئے تھے۔ میں ان کا نمائندہ بنا۔ وہ ایک دن چل بیسے سمینہ بھی بور ہو گئی تھی کیوں سمینہ۔“

”ہاں جن کاموں کی عادت ہو جاتی ہے انہیں کرتے اچھا لگتا ہے مگر یہ کام ایسا ہے کہ عادت نہیں چڑتی اور طبیعت اس سے الگ ہو جانے کو چاہتی ہے اب مرحوم نے موقع ختم ہی چھوڑ دیا۔ میں نے بھی موقع ملتے ہی چھوڑ دیا اور ابھی دل پر جبر کر کے ہی کر رہے ہیں۔ جتنا ہم لوگ خرچ کرتے ہیں اتنی آمدنی کا جس دن مستقل سلسلہ ہوا۔ بس یہ کام چھوڑا۔ ادھر شریفوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگیں گے۔“

”تو یہ فن نہیں پیشہ ہے۔ ہر پیشے کے لوگ اپنا کام نبھاتے ہیں اور جب موقع ملتا ہے کام سے شکر و شکر ہو جاتے ہیں۔“

”نہیں! میں تو اسے فن ہی کہوں گا اور پھر ہر پیشے کو ٹھیک طور سے کرنے کے لئے فن درکار ہے۔ گو فن کے معنی پیدائشی فن کے لئے رہا ہے ان فنون میں یہ نہیں ہے مگر بغیر فن کے یہ چل نہیں سکتا۔ سمیٹنے کے والد نے اسے فن کی طرح برتا۔ اس نے بھی یہی کیا اور مجھے بھی فن کی طرح سکھایا اور میں فن ہی کی طرح برتا رہا ہوں۔“

* سیپ کراچی

مواد

پہنٹی اس وقت مویشیوں کو چارہ ڈال رہی تھی۔

میں بے پاؤں اُس کے قریب پہنچا اور اُسے اپنے بانوؤں میں بھنچ لیا۔
 مویشیوں کی بو میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک خوب صورت گائے عورت بن کر
 میرے سینے سے لگی ہے۔ میں نے پیادری سی گائے کے ہونٹ چوم لئے۔ شاید اس
 کے ہونٹ پہلی بار کسی کے ہونٹوں سے مس ہوئے تھے اور وہ نہیں جانتی تھی کہ
 چومنا کیا ہوتا ہے کیونکہ جب میں اُسے چوم رہا تھا تو اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔
 میری آنکھوں کے سامنے بدترین آگئی، جسے زندگی میں پہلی بار میں نے چوما
 تو اُس نے پیادری سے متنبہ ہوتے ہوئے کہا: ”تو برا جنگلی چومنا بھی نہیں آتا۔“
 — اور پھر دوسرے ہی دن اُس نے مجھے ایک کتاب دی تہہ نڈڈ ویرن کنگڈم
 — مگر اُس وقت خوب صورت گائے کو سینے سے لگائے سو طرفوں کے
 ایک ہی سیدھے سے طریقے نے ہونٹوں میں زندگی کی وہ میٹھی سی حرارت پیدا کر لی

جو سارے جسم میں پھیلنے لگی۔

یہ ایک جسم میں ایک ٹھنڈی سی ہوئی۔ آہٹ نہ جو نکال دیا۔ پلٹ کر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ ٹھنڈی سی کی چاپ قریب تر آئی گئی۔ یہاں تک کہ ماسی دودھ آدے سامنے آگئی۔ اس کے آنے سے پہلے ہی میں سنبھل چکا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں میں اپنے آپ کو اپنے ہی آپ میں چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے بے ساختہ بے ہنگم بچے میں کہا: دیکھا ماسی یہ پھٹی مجھے کلاڑی بنا کر نہیں دیتی؟

ماسی نے اپنی سب پر اتراتے ہوئے کہا: تمہاری ماں ٹھیک ہی کہتی تھی کہ ختم نہیں بدلتے۔۔۔ لو میں اپنے بیٹے کو ابھی کلاڑی کھاتی ہوں؟

یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی بسی کی مثل اٹھائی۔ ہمیں ساتھ چلنے کو کہا۔ آگے میں پہنچے تو میں چار پانی پر بیٹھ گیا اور پستی سمٹی سمٹی مویشیوں کو چارہ کھلانے کے بہانے وہاں سے کھسک گئی اور اس کے ساتھ ہی میرا دل بھی۔ خود ہی کھسکنا چاہتا تھا مگر ماسی آنکھوں کے سامنے تھی، اس نے کسی دنگی میں اٹھ لی اور دنگی پورے پورے چڑھا دی۔ یہ پورے ہمیشہ گرم ہی رہتا۔ پورے میں آگ نہ ہو تو خیال کیا جانا کہ گھر میں غوسہ ہے۔ پھوڑی ہی دیر میں ماسی نے کسی میں دودھ ملایا۔ دودھ کے چھٹ جانے پر پانی آگ ہوا تو اس سے ایک پوٹلی میں چھان لیا پوٹلی میں جو بچ رہا اس کی دھڑکی سی بنا دی یہی کلاڑی تھی، پیز سے ملتی جلتی۔

”لو بیٹے کھالو“ ماسی نے نام چینی کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ پلیٹ سامنے رکھ لی اور کلاڑی کھاتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ کلاڑی کھانے سے ماسی یہ سمجھتی ہے کہ میں نہیں بدلا۔ اسے کیا معلوم کہ میں اوروڈی کہتے بدل چکے ہیں۔ بالکل اسی طرح

جیسے دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ بدل چکا ہے۔ ہاں ایک امی ذرا ابھی تک ڈیڑھی میں تو کیا ہوا، ہم تو بدل چکے ہیں۔ ڈیڑھی مٹی کھنے والے یہاں سے گئے تو میں اپنے بابا اور امی کو امریکی بجے میں ڈیڑھی اور مٹی کھنے لگا۔ یہی لہجہ اختیار کرنے پر ڈیڑھی کی شان بڑھی۔ شان پیسے سے بڑھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی آن بھی۔ اسی آن بانی سے اپنے ڈیڑھی لیڈر بھی ہو گئے۔ آزادی کشمیر کی تحریک کے سرگرم مددگار شہدائے کشمیر کا یوم آنے یا آزاد کشمیر کا ڈیڑھی بھرے جلسے میں دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں۔ غاصبوں کے خلاف زہرا اٹھتے ہیں اور آخر میں ہمیشہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اپنی قریب آ رہا ہے جب فرزند ان نو حید قریب کا رکی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔۔۔۔۔ ڈیڑھی کی یہ تقریریں سننے سننے میں جوان ہو گیا۔ اس دوران میں نے ہی دیکھا کہ ایک ایک اینٹ جمع کر کے میرے ڈیڑھی نے پہلے آزاد کشمیر میں پھر راولپنڈی اور اب لاہور میں کئی کوٹھیاں کھڑی کر لی ہیں۔

میرے خالو کا کبیر بچا کتر کھا کرتے ہیں کہ تمہاری ہر کوٹھی نصیر گیار ہے تم کبھی نہیں چاہتے کہ کشمیر کو آزادی نصیب ہو تمہیں خطرہ ہے کہ کہیں تمہارے نصیب کا نہ بدل جائیں۔ یہاں کا کبیر بچو نہیں بدلے۔ ڈیڑھی ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ وہ نرس جذباتی آدمی ہیں کشمیر کی سرحد پر وہ کشمیر لینا چاہتے ہیں۔ اقوام متحدہ کا تقوُّلمک نہیں مسئلہ کشمیر وہیں ملے جو گا مگر وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ اٹا جیسے طعنہ دیتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر کی بدولت ہی تمہاری شان و شوکت ہے۔

ڈیڑھی ٹھیک ہی کہتے ہیں مگر جانے کیوں بھٹی کو دیکھ کر یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ کاکا کبیر بچو سچے اور خلص مفرد ہیں۔ اسی نے انھوں نے آزاد کشمیر کے

کچے کوٹھے ہی میں اپنے کردار کو چھتہ بنائے رکھا۔ آزاد کی کشمیر کے لئے جنگ ہوئی تو وہ اپنے جوان بیٹے نور الدین کے ساتھ محاذ پر لڑتے رہے۔ محاذ پر نور الدین شہید ہوا۔ وہ آج بھی بڑے فخر سے اُس کی شہادت کا واقعہ بیان کرتے ہیں تو دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا ہوں کہ میرے ڈیڈی نے جنگ کے دوران مجھے امیٹ آباد بھجوا دیا تھا اور خود خانہ بندی کے بعد بڑے شہروں میں تقریریں کرتے ہوئے سرحد پار سے آئے ہوئے صاحبزین کے لئے کپڑاٹا اور چندہ جمع کرتے رہے۔ اُس وقت ایک امیٹھیں جو ابھی تک کچھ دیسی ہی ہیں۔ مجھ سے کہا کرتیں "کاش تو بھی سُندا ہوتا؟" نور الدین کو پیار سے سُندا کہتے تھے۔

میں بھلا سُندا کیسے ہو سکتا تھا۔ کانٹ میں تعلیم پائی یسوع مسیح کا پیر و کار نہ بنا تو مسلمان بھی نہ رہا۔ سکول سے کالج تک ایسے ماحول میں رہا کہ اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گیا۔ نور الدین میری طرح نہیں بدلائو تھا۔ اُسے کا کاکیر جو ہمیشہ یہ کہتے کہ دیکھو بیٹے زندگی یہی ہے کہ اپنی سرزمین کو آزاد کرائیں! — اور میرے ڈیڈی مجھے قائل کر لیتے کہ دیکھو بیٹے جذباتی ہونے سے زندگی کسی کام کی نہیں رہتی۔ دیکھو تمہیں میری طرح اپنا اثر و سوز بڑھانا ہے۔ قوم کی راہنمائی کرنی ہے۔ بڑے لیڈروں کی تقریریں پڑھو — اور پھر ملکی اور غیر ملکی لیڈروں کی تقریروں پر اپنی کتابوں کا پھاٹا میرے سامنے کھرا ہو جاتا اسی پھاٹا کی اوٹ سے میں وادی کشمیر کے پہاڑوں پر نظر رکھتا لیکن سُندے کے سامنے کتابوں کا ایسا کوئی پہاڑ نہ تھا۔ سرحد اُس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ وادی کشمیر اور اس کے پہاڑ اُس کی آنکھوں میں سمائے ہوئے تھے۔ وہ غاصبوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھتا اور دل کی استغاثی گہرائیوں میں

اپنے بابا کی یہ آواز سننا رہتا یہ بیٹے زندگی یہی ہے کہ اپنی سرزمین کو آزاد کروائیں!“
 بن بھلا سندا کیسے بن سکنا تھا۔ اس کا باپ سپاہی بن کر مہاں آباد ہوا۔ اس
 نے تقریریں نہیں کیں۔ الاٹ منٹیس نہیں کرائیں۔ تجارت نہیں کی۔ وزارت نہیں کی
 صدارت نہیں کی۔ دولت جمع نہیں کی۔ کوٹھیاں تعمیر نہیں کیں۔ ایک ہی کچے کوٹھے
 میں رہ کر وہ اپنی بات کو پکا نکالا۔

مسی دُروانہ نے بات پکی کرنے کے لئے کا کا کبیر پو سے کہا۔ بہن پیغام لے کر
 آئی تھی تو کیوں نہ پھر.....“

کا کا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”بھتی کی شادی کی بجائے؟“

”ہاں تو اور کیا۔۔۔ آخر یہ بھی ایک فرض ہے!“

کا کا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ہمارا فرض تو بس یہی ہے کہ ہم آزادی کے لئے
 قربان ہو جائیں!“

مسی دُروانہ نے بے اختیار دونا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ ایسی
 باتیں کر دیں کہ کا کا کبیر پو نے اس فرض کو بھی محسوس کر لیا اور شاید اسی احساس پر
 وہ کہنے لگے ”جائے کیوں مجھے یوں لگتا ہے کہ۔۔۔ اپنے ہو کر بھی اپنے نہیں رہے۔ وہ
 تو اپنے ہی سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔۔۔ مگر تم کہتی ہو۔۔۔!“

کا کا کبیر پو رگ گئے اور اس کے ساتھ ہی دروازے کی اوٹ میں کھڑے
 کھڑے مجھے یوں محسوس ہوا کہ اپنے دل کی دھڑکن بھی غم گئی ہے مگر پھر آواز آئی ”نہم
 کنتی ہو کہ بھتی خوش رہے گی۔۔۔ اچھا تو یوں ہی سہی۔۔۔ پر سوچ لو تمہارے بہنوئی

بڑے لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں۔ بڑے نام والے ہیں۔ دولت عزت بھی کچھ سمیٹ کر بیٹھ گئے۔ اور ہمارے پاس کیا ہے؟
 کا کا کبیر جو گری خاموشی میں کھو گئے۔ اسی خاموشی میں جیسے کسی نے مجھ سے یوں کہا کہ اصول پرستوں کے پاس پیسہ نہ ہو تو وہ ایمان کی بدولت سمیٹ کر دکھستے ہیں۔

دکھ ستنے ستنے ہی پھپھتی جوان ہو گئی تھی کسی چٹان میں سے ترشی جوتی پلوں لگتا تھا کہ بنانے والے سنگ مرمر کو ٹھکالی پھولوں میں گوندھ کر اس کا توانا جسم تیار کیا۔ صحت مند، سرخ و سپید اور ہلکا ہوا میرادل چاہتا تھا کہ وہ بادلوں میں تحلیل ہو کر شہر شہر برس پڑے اور وہاں کی نوجوان بر زمین اس بارش میں نہا کر صحت مند، حسین، بھفکاش اور سادہ ہو جائیں۔

پھپھتی اور میں کوئی بارہ ہزار فٹ کی بلندی سے شیشہ ٹکلی کی چوٹی پر سرحد پار وادی کشمیر کو دیکھ رہے تھے کہ آن کی آن میں کالے بادل اندکڑ گئے اور چھا چھم برسے لگے پھپھتی نے میرا ہتھ پکڑا اور بارش سے بچانے کے لئے قریب ہی ایک غار میں لے گئی پہلی بار دم دونوں کو مکمل تنہائی نصیب ہوئی تھی۔ دونوں ایک پتھر پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں جذب کرنے لگے۔ یکایک بھلی کڑکی تو میں بے اختیار اس سے پٹ گیا۔ وہ مسکرائی تو میں آپ ہی آپ شرمایا۔

پردہ بین کے سامنے بھی فرزندہ ہوا تھا اپنے جنگلی پن کے احساس پر اورد میں دھنکا
کبھی نہیں بھول سکتا جب سینہ دیکھ کر کانٹنی نیشل گئے۔ کچھ پیا، کچھ کھایا۔ گھر لوٹے ویڈی
اورد مئی آنا د کشمیر میں تھے۔ گھر میں فقط میلا راج تھا۔ پردہ بین نے گھر میں قدم رکھا تو ایک
خاص ادا سے انگڑائی لیتے ہوئے کہا: ”اے سچی میں خفا گئی ہوں یہ منہ دار امیڈوم۔
کہاں ہے؟“

— اورد ہم دونوں آخر اُس منزل پر آ گئے جس تک پہنچنے کے لئے میں نے
کئی موڈ کاٹے تھے۔ کسی نہ کسی موڈ پر تنہائی میں موقع پاتے ہی بوس و کنارے دونوں
کے جسم غائبانہ طور پر ایک دوسرے سے متعلق ہو چکے تھے مگر یہ مکمل تعارف تو نہیں تھا۔
امیڈوم میں داخل ہوتے ہی پردہ بین نے خود ہی وہ کوٹ اُتار دھپکا جو اُس نے
فرمائش پر سال روڈ کے اُس درزی سے سلوایا تھا جس نے کوٹ پہناتے ہوئے اُس
کے کان میں آہستہ سے چھونکا تھا: ”ماشا اللہ کوٹ کیسافٹ آیا ہے۔ کتنی سہاٹ لگتی
ہیں آپ!“

یہ کہتے ہوئے وہ کوٹ پردہ بین پر یوں بُرش پھیرنے لگا کہ اُس کا اپنا سارا جسم بُرش کے
ہر مال میں سمٹ آیا اور اس طرح وہ بُرش بن کر کوٹ کو صاف کرتے دسے تسکین حاصل
کرنے لگا۔

کوٹ ایک طرف پھینکتے ہوئے پردہ بین نے اپنے آپ کو میڈ پر گرایا اور پھر پھل
کر بیٹھ گئی۔ اُس کی چُپت قیص نے اُسے بھینچ رکھا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر اُس نے
انگڑائی لی اور شادی اورد مہنی حون کی باتیں کرنے لگی بھوائی ہو نو لو لو نبیا گرا مال اور
ڈنڈنی لبڈ میں کھو کر وہ میرے بازوؤں میں یوں بھیل گئی جیسے عورت کی بجائے مرد

”میں سر سے پاؤں تک سب ہو گیا مجھے بت کی طرح بے جس پاکر وہ بولی تو بنگلا

”تم بارش میں بھیگ گئے ہو تمہارے ہاتھ ٹھنڈے ہیں یا پتھری نے مجھے چوکھوایا۔
وہ بہت پیاری لگ رہی تھی میں نے اس کے سر سے کسبے کی ٹوپی اتاری تو
اُس کی بینڈھیاں اُس کے شانوں پر بکھر گئیں میں نے اس سے کہا: یہ سانپ اُٹو نے
ٹوپی میں ٹھپا رکھے تھے۔“

اُس نے ساوگی سے کہا: یہ تو بینڈھیاں ہیں۔ سانپ تیرے دل میں ہے!“
یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا دی تو میں نے اُس کے چمکیلے سفید دانت دیکھ کر پرجھل
”کون سی پیٹ استعمال کرتی ہو؟“

اُس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تو کہنے لگی: کیا کہا؟

”یہی کہ تمہارے دانت پچھے موتی ہیں!“

یہ سننے ہی اُس کے گلابی رخسار سُرخ ہو گئے۔ اُس کے گلابی رخسار اور ہاتھ
ہونٹ دیکھ کر اگر میں یہ پوچھ لیتا کہ تم کون سی رومج اور کون سی لپ بشک استعمال کرتی
ہو تو وہ شاید گونگی اور بھری لڑکی کی طرح میرا منہ بگھتی رہ جاتی۔

یہی گونگی اور بھری لڑکی میری بیوی ہے۔

اور میں —

— میں اپنی دوسری بیوی پر تہذیب کے ساتھ سوسائٹی میں مود کرتا ہوں۔

تہذیب نے مجھے قائل کر لیا تھا کہ پتھری سے تمہاری شادی تمہاری ماں کی مرضی اور قوی

خدمت کے جذبے سے ہوئی مگر تم موسائی کے ایک محرز فرد ہو۔ اپنا اثر و رسوخ بڑھانے اور موسائی میں موہ کرنے کے لئے تمہیں سوئی صد بولتی پروین کی ضرورت ہے اور جب میں دو لہا بن کر پروین کو لینے آگیا تو براتیوں کی محفل میں ایک بھانڈے دوسرے بھانڈے کے نیگے شانے پر چڑھا اس مارتے ہوئے پرچھا "تو کیا فیصلہ ہوا؟"

"بس ہو گیا؟"

"اور میں — آ کر ہوا کیا؟"

"بس ہو گیا کشمیر کا فیصلہ؟"

"کس نے کیا؟ — ہندوستان نے؟"

"نہیں — ہندوستان کہتا ہے کہ کشمیر بھارت کا نہیں بھارت کشمیر کا لنگ ہے؟"

"تو پھر یہ فیصلہ پاکستان نے کیا؟"

"نہیں — پاکستان کہتا ہے کہ کشمیر کا فیصلہ کشمیری عوام کریں گے؟"

"تو یہ فیصلہ کشمیری عوام نے کیا؟"

"انہیں موقع نہیں دیا گیا؟"

"اور میں — تو پھر یہ فیصلہ کس نے کیا؟"

"امریکہ اور روس — دونوں نے مل کر کیا ہے؟"

"کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"فیصلہ یہ کیا ہے کہ کشمیر ہندوستان کو اور کشمیری پاکستان کو ملیں

گئے؟"

— محفل کا ہر فرد مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گیا۔

میرے ڈیڈی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔
 قصہ گوکار کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے اُن کو نئی تقریر کا سولا
 مل گیا تھا۔

”فنون“ لاہور

واپسی

جیل کی نضا بالکل خاموش تھی۔

یہ سکوت اور بھی گہرا ہو گیا۔ جب اُس نے سنا کہ اُس کی پریل نامعلوم ہو گئی ہے اور
 پچاسی کی سزا کی توثیق ہو گئی ہے مگر یہ سکوت اس کے دل کے اندر تھا۔ باہر زندگی
 حسب معمول تھی سامنے والے درخت کے پتے اب بھی ہوا سے ہلکا شہر کر رہے تھے۔
 دُور سے لگن کی آواز آج بھی سُنانی دے رہی تھی۔ سلاخوں والے دروازے پر چڑیا
 آج بھی کسی وقت بیٹھ کر چوں چوں کر دیتی تھی مگر یہ سب آوازیں آج عجیب رنگ لئے
 ہوئے تھیں۔ ان کا شل ہوتا ہوا دماغ ان آوازوں میں عجیب سی اجنبیت محسوس کر رہا
 تھا۔ جیسے نئے بدلتے موسم کی سہ پہر ہو، دھوپ کا انداز بھی بدلا ہوا اور سائے بھی اپنی
 جگہ سے کھسکے ہوئے۔

دس مرتبہ فٹ کی اس کو ٹھٹھری میں وہ اس روز آیا تھا۔ جب میڈن جج نے پچاسی
 کی سزا سُنائی تھی۔ اب پچھلے تین ماہ سے اپریل کے فیصلے کے انتظار میں یہاں

گھڑیاں گن رہا تھا۔

موت کی سزا پانے والوں کی کوٹھڑیاں جیل میں علیحدہ تھیں جہاں کڑی نگرانی اور زیادہ دیر انداز تھا۔ دوسرا فرق یہ تھا کہ یہاں قیدیوں کو ایک قرآن مجید دیا جاتا۔ جو وہ سارا دن پڑھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ کئی دفعہ پڑھتے پڑھتے اس نے سوچا کہ اسی کمرے میں اس سے پہلے کئی لوگ بھی قرآن پاک پڑھ چکے ہیں، جواب اس دُنیا میں نہیں تھے۔ کئی صفحوں پر اُسے آنسوؤں کے نشان نظر آئے۔ کون جانتا ہے کہ یہ آخری وقت کے آنسو تھے یا چند روز پہلے کے۔ کیا پتہ یہ مجرم پر پھٹا دے کے آنسو تھے یا کسی بے قصور کی بے کسی کے۔

قرآن کریم اس کے سامنے ہوتا اور وہ ایسے خیالات میں کھو جاتا کہ کبھی یہ سوچتا کہ یہ مقدمہ کتاب تو دُنیا میں زندگی گزارنے کے ڈھنگ بتاتی ہے تو اب ایسے دقت اسے کیوں دی جا رہی ہے جب دُنیا کے دروازے اس پر بند ہو رہے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے اس کے دل میں کوئی خیال سر اٹھاتا تو وہ سوچنے لگتا کہ کیا ان لوگوں کے احساسات بھی ایسے ہی تھے، جو اس سے پہلے اس کوٹھڑی میں رہے اور چند روز بعد پھانسی پا گئے۔

خود اسے اپنے مجرم پر کبھی افسوس نہیں ہوا تھا۔

اُس نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا۔ دن دہاڑے اجمع عام میں۔ اور وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ بہت سلیبھا تھا اور نیک جس کی زندگی میں کبھی کوئی جذباتی طوفان نہیں آیا تھا۔ اس لئے کہ اس نے اخلاق اور اقدار کی تیسوڑ توڑنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی بلکہ بچپن میں اچھا بچہ بننے کے جو اصول اُسے سکھائے گئے

تھے وہ زندگی بھر ان پر قائم رہا۔ اور بائیس سالہ جوانی میں اچھا بچہ بنا رہا۔
گڈوں سے دسویں پاس کو کے وہ شہر میں ملازمت کرتا تھا کئی دفعہ شہر کی
رہنمائیوں نے اُسے اُکسایا تھا لیکن اُس کی تربیت اُسے روک لیتی۔ اور یہ خیال ستا
کہ ماں کو پتہ چل گیا تو وہ کیا کہے گی۔ ماں جو اُسے دنیا میں ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی۔
اور جس کا دل دکھانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

وہ تین ماہ سے موت کے دینگ روم میں پڑا ہوا زندگی کے متعلق سوچتا رہا
گزدی ہوئی زندگی کے متعلق اس کو ٹھٹھری کے دیران دور و دیوار اُداس تھے جو
دامخ کو سکون دینے کی بجائے گھٹس دیتے تھے اس کی فضا میں دھیرے دھیرے اپنے
والی موت کی سرسراہٹ تھی اور اس کے سلائخ دار دروازے سے نظر آنے والے
بھگی جیل اسٹاف نگہری پڑیا اور چوڑے گردی ہوئی زندگی کی یادوں کے پت کھولتے
جاتے۔ اس وقت اس کی سابقہ محرومیاں کھل کر ڈھنسنے لگیں لیکن پائی مٹی جڑیں
قندیکر رہ جاتیں، دفن شدہ دلہرانے لگتے۔ مزید زندگی کی خواہش ترپنے لگتی اور
قسمت کے خلاف لگے شکوکے قطار اندر قطار اُٹھنے لگتے۔

اس کو ٹھٹھری میں قرآن کے صفحوں پر خالی فوٹی نظر میں جائے اس دی میں کئی
کئی دفعہ وہ سارے واقعات ذہن میں دہرائے تھے جو قتل سے متعلق تھے۔
سب سے پہلے اُسے ماں کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ اب اس کا باپ جھنگرٹا
رہتا ہے۔ خط میں نہ کوئی خاص وجہ لکھی تھی اور نہ جھنگرٹے کی نوعیت بتائی تھی۔ اس
نے یہی سوچا کہ ماں کے پاس خط لکھنے کو اور کچھ نہ تھا۔ اس لئے اس نے اس غیر فکری
چیز کا ذکر کر دیا ہے ورنہ ماں باپ میں جھگڑے کہاں نہیں ہوتے۔

اگلے ایک دو خطوں میں خاموشی تھی۔ اس نے جب باپ اسے ملنے آیا تو اس نے یہ موضوع نہ چھیڑا۔

چند روز بعد وہ گھر گیا تو ماں باپ کے پڑچڑے پن کا سرسری سا ذکر کیا اور بس۔ اس کے اپنے مشاہدے میں کوئی پریشان کن چیز نہ آئی۔

پھر ایک دن اُسے ماں کا مفصل خط ملا۔ جس میں اُس نے لکھا تھا، کہ اس کا والد پچھلے کئی دنوں سے اُسے نزد و کو بکرا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ نئے قانون کے تحت میں اسے دوسری شادی کی اجازت دے دوں۔ اور دوسری شادی میں بددعویٰ کروں پھر ماں نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ دوسری شادی سکینہ سے کرنا چاہتا ہے جو ماں کی خال زاد بہن تھی اور اپنے باپ کے مرنے کے بعد بہت سی زمین کی اکھوتی وارث تھی۔ ماں نے لکھا تھا "تمہارا باپ جائیداد کی حرص میں اتنا دیوانہ ہو گیا ہے کہ اپنے سے آدمی عمر کی لڑکی سے شادی رچانے پر تیار ہوا ہے۔ وہ مجھ سے تحریری اجازت بھی چاہتا ہے اور یہ بھی کہ میں ان لوگوں پر زور ڈالوں کہ وہ یہ رشتہ دے دیں۔"

وہ یہ خط پڑھ کر بھونچکا رہ گیا۔ میرا باپ اور شادی؟ اس کا سر جھک گیا۔ باپ کی عمر پچاس کے قریب تھی اور ماں کوئی چالیس کی تھی اب سے بیس اکیس سالہ لڑکی سے شادی؟ اُسے ایسے لگے جیسے وہ خواب یا نشے کی حالت میں ہو اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو لیکن جب بار بار خط دیکھتا تھا تو اس کا دل ڈوبتا ہی جاتا۔

اسے اپنی ماں سے بے پناہ محبت تھی اور ماں کا دکھ کچھ پہلے ہوئی آگ بن کر رہا

کے لگ وپے میں گھٹنے لگا اس نے حالات کا تجربہ کرنے کی کوشش نہ کی اور اس نے ساری بات کو جس انداز سے لکھا تھا اس نے من و عن قبول کر لیا۔ ماں کی ذات اس کی نظر میں اتنی بلند تھی کہ اس کا سارا غصہ باپ کی طرف منتقل ہو گیا۔

یہ کیسا باپ ہے؟ جو گھرتا ہوا کرنے پڑتا ہوا ہے ہمارے اپنے گھر میں کس چیز کی کمی تھی جو وہ مال و دولت کی حرص میں اندھا ہو رہا تھا۔ اکھوتے بیٹے کے لئے کیا یہ ساری زمینیں کافی نہ تھیں؟ جو وہ گھر کا ٹھہرا ہوا پٹکوں، ماحول کم سے اڑانا چاہتا تھا۔ اور وہ باپ ہی کیا ہو یہ نہ دیکھ سکے کہ نیلے پیلے آنچل تو اس کے بائیس سالہ جوان بیٹے کے خیالوں میں لہرا رہے ہیں اس کا فرض تو بیٹے کے خیالوں میں بھاگتا تھا لیکن وہ خود ہی ان آنچلوں کے پیچھے بھاگنے لگ گیا۔ اٹھتے بیٹھے وہ جتنا ہی سوچتا اس کے دل میں باپ کے خلاف نفرت بڑھتی جاتی۔ اس باپ کے خلاف جسے اس نے ساری عمر پیار کیا تھا اور غالباً اسی وجہ سے اسے باپ کے طرز عمل سے صد پرہیز تھا۔ چنانچہ وہ ساری محبت اب مکمل طور پر مظلوم ماں کی طرف منتقل ہو گئی اور باپ کے لئے سوائے نفرت کے اور کوئی جذبہ باقی نہ رہا۔

جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوا تو غم اور غصے سے نیم پاگل ہو رہا تھا۔ وہ خوب اندازہ کر سکتا تھا کہ معاملہ یونین کو نسل تک جانے سے ان کی کتنی جگ ہنسائی ہو گی خصوصاً جب کہ یونین کو نسل کا چیرہ میں ان کی مخالف پارٹی کا تھا اس سے انصاف کی توقع تو بالکل نہ تھی۔ البتہ یہ یقین تھا کہ وہ اس معاملے کو بلاوجہ اچھالے گا مگر کما ذریعہ بنائے گا اور ان کو روک دے گا کہ یہ سچا کر مزہ لے گا۔

جیسے جیسے گاؤں قریب آتا گیا وہ سوچنے لگا کہ میں گاؤں میں کیسے داخل

ہوں گا! میں لوگوں کا سامنا کیسے کر سکوں گا۔ پہلے تو بھونگی پر ہی دو چار خیر صلہ پہنچنے والے ہوں گے۔ آگے اڑے پر بھی دکھنا اور خواہنے والے جانتے ہیں اس سے آگے مسجد کے مولوی صاحب بچے پڑھانے کے ساتھ ساتھ باہر جھانکتے رہتے ہیں جن سے بات کئے بغیر آگے جا نکلنا ممکن نہیں اور پھر اس کے بعد تو بازار ہے جہاں سونے والے ہوں گے۔ وہ ان سب کی طنزیہ نظروں کا مقابلہ کیسے کر سکے گا۔ اور نہ معلوم گھر کا کیا حال ہوگا۔ ماں کس حال میں ہوگی اصحاب کا مود کیا ہوگا۔

باپ کا خیال اتنے ہی اس کے خون میں نفرت کے اُبال اُٹھنے لگے۔ آخر بابا کو کیا پڑی تھی بیٹھے بھائے بھٹس میں تیلی پھینکے کی۔

اور پھر گاؤں آگیا۔ بھرموں کی طرح نیچے دیکھتے ہوئے وہ چلتا رہا۔ کسی سے نہیں بچائے کسی سے جسم چرائے۔ بازار سے گزرنے کی بجائے اس نے پچھلے قبرستان سے لہا راستہ اختیار کیا۔

گھر کا دروازہ نظر آیا تو نہ خوشی سے اس کا دل مچلا نہ یہ خواہش ہوئی کہ گھر والے باہر ہی بل جائیں۔ بلکہ اس کا دل بھاری بوجھ سے بیٹھنے لگا۔ نہ معلوم گھر میں کیا نظر آئے گا۔

دلہیز پر وہ لمحہ بھر کو ٹھٹھا... اور پھر اندھ داخل ہو گیا۔

صحن خالی تھا۔ ماں ہمیشہ کی طرح شہتوت کے نیچے بیٹھ کر سبزی نہیں کاٹ رہی تھی۔

وہ بڑے کمرے میں گیا۔ وہ بھی خالی تھا۔ صند قوں کو تالے لگے تھے جو باں کے باہر جانے کی نشانی تھی۔

”باورچی خانے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اندر سے میرا شن بجلی۔ اُسے دیکھا اور
ٹھٹک گئی۔ پھر گڑبڑا کر سلام داغ دیا۔

گھر خالی دیکھ کر اس کا ذہن تتاؤ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ سلام کا جواب دینا
اور حال احوال پوچھنا بالکل بھول گیا۔ قریب جمع کر بولا۔

”ماں کدھر ہے؟“

میرا شن نے اسے غور سے دیکھا۔ اور بولی ”یونین کونسل کے دفتر میں سوہا
طلاق کے مقدمے کی تاریخ ہے۔“

اس نے جست لگائی۔ زن سے باہر نکلا اور تھپٹا بھاگتا ہوا دفتر کو چلا۔
میں کسی نے آواز بھی دی مگر وہ رکا نہیں اور پلکتا چلا گیا۔

دفتر کے باہر میدان میں مقدمہ پیش تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ جب وہ ان کے
قریب آ رہا تھا تو اسے بالکل ایسا لگا جیسے عاری کا تماشہ ہو رہا ہے اور اوگروگ
جمع ہوں۔ شرح اور خفت نے ایک دفعہ پھر پاؤں پکڑ لئے اور وہ مجمع کو چیر کر آگے بڑھنے کی
 بجائے دم سادھ کر پیچھے سے جھانکنے لگا۔

چیرمین اور صاحبی کشی کے دو ممبران کرسیوں پر بیٹھے تھے، سامنے اس کی با
ہوار پائی پر بیٹھی تھی اور چہرے پر پتھر رکھے زار و تظار رو رہی تھی ماں کو برسہا مہلزموں کی
طرح روتا دیکھ کر وہ غصے سے نیم پاگل ہو گیا۔ اس کا باپ بلند آواز سے بول رہا تھا۔
”میں اسے اتنے عرصہ سے سمجھا رہا ہوں مگر یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی نہ باپ
بھی سمجھایا، جھگڑا بھی کیا۔ مارا بھی، مگر اس کی حرکتیں بڑھتی ہی گئیں۔ میں بہت پریشان
کر سکتا ہوں مگر چلنی بدداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے فصل

کے ساتھ بد فعل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر یہ بھاگ نہ جاتے تو میں وہیں قہر...
 ”بابا! وہ لوگوں کو چیر کر آگے بڑھا اور اس کی جینجھوڑ اسرائیل کی طرح سب
 کے کانوں میں گھنسی گئی۔

اسے دیکھ کر مجمع میں ہنستا ہٹ سس ہوئی۔ ایک آدھ طنز یہ آواز آئی۔ ”توتہ پتہ
 آگیا۔ اور پھر ہر شخص سکت ہو گیا۔ اس کی ماں نے سُرٹھا کر اسے دیکھا اور پھر جینجھوڑ
 مار کر اس کی طرف پھینچی۔ اسے اپنے ساتھ لٹایا۔ اور پلک پلک کر رونے لگی۔ ماں کو
 بانوؤں میں تھا تا تو اس کے دماغ سے سب خیالات محو ہو گئے۔ سوائے اس کے کہ
 ہر قیمت پر اپنی ماں کی حفاظت کرے۔

ماں جھکیوں کے ریلے میں بولی۔ یہ سب بہتان ہے... جھوٹ ہے... اپنے
 مقصد کے لئے یہ بھجھوڑ لیل کر رہا ہے۔

اس نے غصے سے باپ کی طرف دیکھا تو وہ جیسے سن کر ہرکڑیے کو دیکھ رہا تھا۔
 نظریں ملتے ہی اس نے بیٹے کی طرف ہاتھ پھیلائے۔ یہ بچ ہے بیٹا۔

باپ کے چہرے سے اپنی پھٹی پھٹی نظریں مٹا کر اس نے عجیب بڑنگاہ دوڑائی...
 حیرانی... دلچسپی... تسخیر... طنز... احساس برتری... یہ سب اس کا
 محاصرہ کئے ہوئے تھے... مخالفت بھرے جینجھوڑ کے چہرے پر شیطانی دارنگائی تھی۔
 جیسے جی ادھ موئے ہوئے کو اچھال اچھال کر مزہ لیتی ہے۔

اسکو سنہ بھی نہ چلا کہ کب اس نے ماں کو چھوڑا اور کب لپک کر مجمع میں سے
 ایک آدمی کے کندھے سے کھنڈی بھینچی اسے تو تب ہوش آیا جب کھنڈی کے پے
 درپے دار کھانے کے بعد اس کا باپ اپنے خون میں لت پت اس کے قدموں میں

گھر پر۔ ماں کی چھینٹیں سُسن کس نے کلباڑی پھینک دی۔ اور کئی بازوؤں نے اُسے جھکڑا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہ کی۔ جب وہ افسوس تھا تو اُس نے چیرمین کی طرف دیکھ کر تھوکا اور تحارت سے بولا۔

”ج صاحب! میلا فیصلہ تمہارے فیصلے سے زیادہ باعزت ہے“

اس لمحے سے لے کر آج تک اسے اپنے جرم پر ذرہ بھر بھی ندامت نہ ہوئی تھی۔ مندر چلا پھانسی کی سزا ہوئی، اپیل کی گئی وہ نامنظر بھی ہو گئی اس میں کافی دقت لگا لیکن اس دوران وہ لمحہ بھر بھی نہیں بچتا یا۔ آج اسے بتایا گیا تھا کہ دونوں کے بعد اسے پھانسی دی جائے گی اور پچھلے دو گھنٹوں سے وہ ان سارے واقعات کو یاد کر رہا تھا۔ جن سے گزر کر وہ یہاں پہنچا تھا۔ مگر اس ساری یاد میں باپ کے لئے کوئی ہمدردی نہ تھی جس نے اس کی ماں پر محض اس لئے بہتان لگا یا کہ وہ اپنے مقاصد کو چھپا سکے۔ وہ اس کی نظر میں بدترین ریاکار تھا۔ اس کے منہ سے نہ ایک گالیاں اُبھریں بھر وہ سنبھلا اور بل پل کر قرآن مجید پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ سو یا نہیں تھا۔ ویسے ہی آنکھیں بند کر کے رات کے اندھیرے میں گم تھا اور سوج رہا تھا کہ پھانسی میں کس قسم کی اذیت ہوگی جب اسے کوٹھڑی سے نکال کر لے جائیں گے تو اس کا رد عمل کیا ہوگا۔ کیا وہ ڈرے گا؟ لرزے گا؟ پھر اس کے چہرے پر تو برہنہ چڑھا دیا جائے گا اور گلے میں پھنڈا ڈالا جائے گا۔ سب چہرے چھپ جائیں گے۔ اندھیرا چھپ جائے گا۔ کیا دل نہیں گبرائے گا۔ تب تو ایک ہی انتظار رہ جائے گا کہ کب تختے زور سے آکر گردن پر ٹکراتے ہیں۔ زندگی اور موت کے درمیان

تکٹے والے وہ آخری لمے کیسے گزریں گے؟ اور جب وہ مر جائے گا۔

”مگر کیا واقعی میں مر جاؤں گا؟؟؟ اس نے ہنسنے لگا۔ ”مگر اگر انکھیں کھول دیں مگر نظر اندھیرے سے مگر اگر کندہ ہو گئی۔ کوٹھڑی کا دبیز اندھیرا بھی، اسے موت کا پرہ محسوس ہوا۔ گھبراہٹ سے ایک دم جی متلانے لگا۔ کہیں سے روشنی کی ایک ہی کرن مل جائے۔ اس نے تڑپ کر چلو بدلا۔ سلاخوں والے دروازے کے پار چاند کی روشنی میں دیواروں اور درختوں کے نقوش دیکھ کر اس کی ہمت بندھی اس کا سانس بند ہو گیا۔ چل رہا تھا مگر وہ ٹوڑا ہوا تھا اور جس طرح پیاسا جانور پانی پر ٹوٹ پڑتا ہے وہی طرح وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاندنی کو ٹھنڈا رہا جیسے یہی اس کی زندگی کا واحد ثبوت تھا اور جوں ہی وہ آنکھ بند کرے گا تو پچاسنی کے تختے زل سے گردن پر اڑیں گے۔

ہاتھ پر سے سرسبز ہٹ چلتی ہوئی رخسار تک آئی۔ وہ من سے ذرا نیچے گڑا۔ سے ہوتی ہوئی کندھے میں گھس گئی اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ اٹھایا۔ انگلی سے کندھے کو چھوا تو وہ گیلی ہو گئی۔

”پسینہ“ وہ زریب بڑبڑایا، ”اللہ سے اعتماد سے چہرے پر ہاتھ ملا

”اللہ خدا“ وہ ٹھنڈے پسینے میں شرابید تھا۔ بغیر محسوس کے۔ اس کی تپن گیلی ہو کر کر کے ساتھ جپک گئی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور جسم سے چپکے ہوئے کپڑے دست کرنے لگا تو ایک دم اس کا ہاتھ گرم نمی میں جا۔ خون زدہ ہو کر اس نے ٹھوٹا تو ٹھنڈی آہ بے اختیار اس کے ہون سے نکل گئی۔

اُس کا ہاتھ پریشاب سے تر تھا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دروازے کے قریب ہوا تاکہ وہاں میں کپڑے سوکھ جائیں۔ تب اس نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ وہ سوکھے پتے کی طرح کھڑکھڑا کر رہا ہے۔

اس نے چند لمحوں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر بے سود جسم کا ہر حصہ علیحدہ انداز میں دھڑک رہا تھا اور وہ بے بس ہو کر دوبارہ لیٹ گیا۔ چاندنی کو کھینے کی خواہش کے باوجود اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں۔ غیب سے نہیں بلکہ نقاب سے۔

ایک دم اُسے کسی نے جھنجھوڑ ڈالا مگر بڑا کروہ اُٹھنے لگا تو جیسے کسی نے تختی دی تھی اور وہ چکر اکر سلاخوں والے دروازے سے جا لگا۔ تنکے بھہرا رہنے کے انداز میں اس نے سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ادھر چپ چاپ کھڑے رہا۔ لیکن ابھی بمشکل کھڑا ہی ہوا تھا کہ ایک دم زور کا جھٹکا آیا اور دروازہ ایسی جھکٹ سے نکل کر باہر کی طرف گرا۔ وہ بھی سلاخوں سے چپکا ہوا مشہور چکریل گرا اور سنبھلنے سے پہلے ٹانگوں پر دو چار اینٹیں آن پڑیں۔ وہ اندر سے کراہا۔ اور سر کو سلاخ پر ڈھیلا جھنجھوڑ دیا۔ اس کے نکتوں اور رختی میں گرو کے بادل گھٹنے لگے۔

”بھونچال“ وہ بڑبڑایا۔

اور بے ہوش ہو گیا۔

جب اُسے دوبارہ ہوش آیا تو چاندنی میں سائے پہلے جیسے ہی تھے۔ فضا میں گرو اور دھول بھی بدستور تھی اور چیل کے دوسرے حصے سے شوق کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ اس نے اندازہ کیا کہ وہ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا۔

اس نے گردن ہلاتی۔

پھر باری باری بازوؤں کو حرکت دی۔

ڈرتے ڈرتے "ٹانگیں ہلائیں۔"

کہیں کوئی دردِ اعضاء نہ محسوس کر دیکھا تو ایٹھیں جسم سے لگ کر پورے گریز پڑی تھیں۔ وہ اچھ کر بیٹھ گیا مگر میں خدا سا درد و محسوس ہوا مگر جب جسم کو ادھر ادھر دھرا دھرا لایا تو وہ معمولی چوٹ لگی۔

اب اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔

موت کی سزا پانے والوں کی قربت ابھی کی کوٹھڑیاں گری پڑی تھیں۔ ساتھ دلوں کے کمرے کا قریبی سراپڑ اٹھا۔ مجھے میں اس کا بھیجا پیک گیا تھا باقی چیزیں واضح اور صاف نہ تھیں کیونکہ گرد کا بادل بھیگی چاندنی کو چاٹ گیا تھا۔ جیل کے دوسرے حصوں سے چیخ بکراؤ آ رہا تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال گوندا۔ اس کی زندگی کے دو دن باقی ہیں۔ اگر وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے تو شاید اسے دوسری زندگی مل جائے۔ دوسری سوچ کے بغیر وہاں سے چل دیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی پکڑا جاؤں گا تو کیا فرق پڑے گا۔ وہی تو دن ہیں زندگی کے۔ اور وہ بھی قید تنہائی میں۔ پکڑ کے قید کریں یا گولی ماریں۔ پھانسی سے بڑی سزا تو کوئی نہیں۔ وہ بھی سوچنا چلا گیا۔

جیل میں افراتفری تھی۔ ایک دو بارکیں گرجھکی تھیں۔ اور سبھی لوگ زنجیروں کو کھینچ رہے تھے۔ کچھ لوگ ادھر ادھر سے جاگ رہے تھے کسی کی مدد کے لئے۔ کسی کو بلانے کے

لئے کوئی چیز اٹھانے کے لئے۔ ان میں سے اکثر گارڈ کو پکار رہے تھے۔ وہ بھی ان میں خلط ملط ہو گیا اور کہیں رکتا، کہیں بھاگتا کہیں دوسروں کو پکارتا اُن تک پہنچ جاتی تھی کہیں تار رہا۔ اور ایک دفع موقع پا کر جیل کی بڑی دیوار تک جا پہنچا۔ جہاں تھوڑی سی تلاش کے بعد گرہا حصہ نظر آیا۔ اس نے رک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا نیز نہ چلتا ہوا وہ باہر نکلا اور بگٹ بھاگنے لگا۔

شہزادہ کا حال بالکل بدل گیا تھا مگر یہی ہونی عمارتیں۔ بیڑے میڑے بجلی کے کبھے ٹوٹی ہوئی تاریں کہیں درخت سرنگوں کہیں مڑک میں دریا میں فضا میں گرد ہی گرد گلیاں اور راستے پہچانے ہی نہ جاتے تھے۔ لوگ بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے کہیں زخمیوں کے کراہنے کی آواز میں خفیں کہیں ادا دیوں کو بلانے کا شہر تھا بالکل حشر کا سماں تھا اور زنا نفسی کا عالم تھا چاند کی بھیگی گرد آلود روشنی میں اور بھی ہراساں لگتا تھا۔

وہ اب ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اس قتل کے علاوہ اس نے کبھی کوئی اور جرم نہ کیا تھا مگر اب مجرموں کی صحبت میں رہتے رہتے اس نے کافی سیکھ لیا تھا اور اب قسمت نے موقع بھی دیا تھا۔ کیونکہ اس نے جیل میں سنا تھا کہ ہرگز نہ کی تواریخ بتاتی ہے کہ اس کے فوراً بعد جرائم میں ایک دم اضافہ ہو جاتا ہے اور زلزلہ زدہ لوگ اپنے نقصان کو بحال کرانے ہی جیسے مصیبت زدہ لوگوں کو ٹوٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے پر تڑپ گیا۔

ایک آدمی کی ٹانگ بے میں دب گئی تھی اس کا اوپر والا دھڑکی میں تھا۔ اور وہ بے ہوش تھا۔ یہ بظاہر اس پر سے طے پاتا رہا لیکن دراصل اس کی قمیض نامردم تھ

تھوڑی ہی دیر بعد وہ کامیاب ہو گیا۔ اپنی قیدیوں والی قمیض اتار کر تار تار کر دی اور دوسری پہن لی۔ اپنے لئے دوسری زندگی لینے کی محنت میں وہ زخمی کی زندگی خطرے میں ہی چھوڑ کر چل دیا۔ ایک اور جگہ سے اس نے صندوق اٹھایا جس میں کچھ کپڑے اور نقدی تھی۔ اس کی اسکیم مکمل ہو چکی تھی اور وہ شہر سے باہر والی سڑک پر ہوا۔

نئی زندگی واقعی مختلف تھی۔ اس نے اپنا نام تبدیل کر لیا۔ دارحیٰی بڑھالی چہرے پر خود ہی استرے سے زخم لگا کر بڑا سا نشان بنالیا۔ بصر کے بال جو بھا کر پٹے بنائے۔ لوگوں سے الگ تھلک رہتا۔ نہ کوئی دوست تھا نہ ہمارا۔ وہ کہیں ایک جگہ جم کر کام نہ کرنا۔ چند روز ایک جگہ مزدوری کر لی۔ پھر کہیں اور خواجہ گانے لگایا کسی ٹیکسٹ کے پاس ایک جانا۔

یہ بہت ہی بے اور اکتا دینے والی زندگی تھی تنہائی اور خوف اس کے احساب کو ہر وقت بھاری بوجھ کی طرح دباتے رہتے زندگی کے میلے اپنی چوڑی آن بان سے رونق کے خباہٹ اٹھاتے مگر وہ شرکت سے قاصر تھا کیا معلوم کس جگہ قسمت کیا گل کھلا دے اور وہ پہچانا جانے وہ کھل کر قہقہہ لگانے کو ترستا تھا۔ اس کا دل کسی ہمارا سے بے نگہانانہ بے حجابانہ باتیں کرنا چاہتا مگر مجبور تھا۔ دوسروں کو سنتے دیکھ کر وہ اہجی بھرتا اور شاداں و فرحان لوگوں کی آنکھوں میں مارے دیکھ کر اس کی اپنی آنکھیں جھپکنے لگتیں۔

تین چار ماہ میں وہ تنگ آ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ خاموشی سے جا کر اپنی ماں کو کال لائے اور دونوں کسی دور کے علاقے میں جا کر کھل کر زندگی گزاریں۔

سہ پہر کے سات بجے ہو رہے تھے جب وہ گھاؤں کے قبرستان پہنچا اس کا راز

تھا کہ اندھیرا ہونے لگا وہیں چھپا رہے اور رات کو جا کر ماں سے ملے۔ ماں کے لئے کے خیال سے ہی اس کی آنکھیں ٹوٹ دیا آئیں اور اس نے فر سے سوچا کہ میں نے مشکل وقت میں اپنی جان پر کھیل کر ماں کی حفاظت کی ہے۔

جہاں چھپا ہوا تھا اس سے کچھ دُور باپ کی قبر تھی۔ لیکن وہ ادھر نہیں گیا۔ اس نے فاتحہ بھی نہیں پڑھی۔ وہ ابھی تک اسے معاف نہیں کر سکا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے ان کا پورا گھر اذیتا ہوا۔ اسے پچھانسی کی منرا ملی اور اگر خدا یہ عذاب سے نہ بھیجتا تو وہ اب تک مرجھا ہوتا۔ اس کی نیک دل اور فرشتہ سیرت ماں کو گناہوں میں شرمناک قسمت کی ذلت اُٹھانا پڑی اور ان کے اذلی دشمن جیسے ہیں کو ان پر جہنم کا موقع مل گیا۔ وہ سوچنے لگا سال بھر پہلے بھی وہ گناؤں آیا تھا اور محفوزی ہی دیر بعد کس ذلت سے گیا تھا۔ ہاتھوں میں منتکڑی جسم پر خونی کے پھینٹے چھپے لوگوں کا ہجوم۔ ساتھ ساتھ اس کی ماں روتی چلاتی بین کرتی۔ بچے اس کی ہتھکڑیوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گر تے ہوئے۔ اور وہ نامہوار قدموں سے چلتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ باپ کی ہوس نے اسے کہاں پہنچا دیا ہے۔ آج وہ پھر اپنے گناؤں میں آیا ہے لیکن چوروں کی طرح چھپ کر وہ بچپن کے ساتھیوں سے گئے نہ مل سکتا تھا۔ وہ ہر گھر کے سامنے ٹک کر گھر والی بوڑھی سے دعائیں نہ لے سکتا تھا۔ وہ کسی مہمانے کے بچے کے سر پر پیار کے ساتھ ہاتھ نہ پھیر سکتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ہی گھر کھلے بندوں نہ جاسکتا تھا۔

حسروں کا گولہ اس کے سلق میں پھنسنے لگا۔ اس کی آنکھیں ٹوٹ دیا آئیں اور غیلی آنکھوں میں نفرت بھر کے اس نے اپنے باپ کی قبر پر بڑی ہی کڑی نگاہ ڈالی

اور پھر اس کے خیالوں میں ماں آگئی۔ نہ معلوم وہ کس حال میں ہوگی۔ روتے روتے اس کا صلیب بگڑ گیا ہوگا۔ لوگوں کے طعنوں کے تیروں نے اس کا سینہ چھلنی کر دیا ہوگا۔ پیسے کی وجہ سے بھی تنگ ہو سکتی ہے۔ معلوم نہیں خوشیاں مزاح اسے حصہ دیتا ہے یا نہیں۔ نہ معلوم گاؤں والوں کا سلوک اس کے ساتھ کیسا ہے۔ اس کے ذہن میں ماں کی جو تصویر بھری تھی وہ انتہائی سوگوار اور لاغر تھی۔

شام ہونے لگی۔ ادھر ادھر سے فاختہ کی آواز آئی۔ بابا حاکم کے کنوئیں کی ریل میں سنائی دی۔ جہاں وہ اکثر شام کو نہایا کرتا تھا۔ طوطوں کے غول کے غول نہیں کرتے اس کے اوپر سے گزرنے لگے۔ بیزاری دور کرنے کو۔ ادھر ادھر مڑتے لگا۔ ایک جگہ وہ دیوار خدا لٹوٹی ہوئی تھی۔ اس نے جھانکا تو گاؤں سے آنے والا اجاڑ راستہ صاف نظر آتا تھا۔ اپنے آپ کو اوٹ میں رکھنے کا مناسب انتظام کرنے کے بعد وہ وہیں بیٹھ کر رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

یہ راستہ ہمیشہ کی طرح آج بھی سسنا تھا کیونکہ یہ صرف گاؤں سے قبرستان آتا تھا اور پری سڑک دوسری طرف تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اس نے دیکھا کہ کما کی فصلیں تیار ہونے کو تھیں جہاں کسانوں کو گندم کی کاشت کا تھی وہ کھیت خالی تھے کہیں کہیں کیا کاشت تھی مگر باقی سب گتا ہی تھا۔ ابھی فصل میں کچھ دیر تھی اس نے لوگوں نے رس نکالنے والے پیلے نہیں لگائے تھے ورنہ تو شام کو اس رستے پر غیب رونق ہوتی تھی۔ وہ کافی دیر خالی سڑک کو دیکھتا رہا۔ کئی دفعہ کما کے بے جان کھیتوں پر نظر ڈالی اور بالآخر اٹھا گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پیسے کا آرام کرے کہ دود سے اسے ایک شخص آتا دکھائی دے۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک اور شخص نمودار ہو گیا۔ تماشے سے نیکو

خوف زندہ ہو کر وہ انہیں دیکھنے لگا۔ کیونکہ ادھر آنے والا یقیناً قبرستان آئے گا۔ اور اس کی موجودگی بھی نہ رہ سکے گی۔ جلدی سے ادھر ادھر چکر لگا کر اس نے چھپنے کی جگہ تلاش کی اور پھر گردن نکال کر دیکھنے لگا۔

چند ہی ثانیوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ عورت نے دیہاتی لوگوں کی مخصوص دھواں بھنی ہوئی متھی جو نیل میں بار بار رنگنے سے کالی ہو جاتی ہے مگر اس کا کنارہ سُرخ تھا اور دُسیا ہی کرتہ تھا اور سر پر کُھٹے ہوئے سُرخ رنگ کی چادر تھی۔ وہ کون ہو سکتے ہیں؟ اس نے کتے ہی اندازے لگائے۔

وہ سوچتا کہ یہ فلاں لوگ ہونگے یا کس ان کی کوئی حرکت یا چال دیکھ کر، خیال بدل لیتا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے مگر تنہا دیر میں نزدیک آگئے اور آتے گئے۔

وہ ایک دم ہڑچکا کر اٹھ بیٹھا۔ جیسے اُسے بجلی کا جھکا لگا ہو۔ حفاظتی حدود سے اندر ہی اندر وہ جتنا اُگے جھک سکتا تھا جھک کر باہر آگیا اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ چال پر غور کیا۔ جسم کے حجم کو دیکھا۔ کپڑوں کا اسٹائل پرکھا۔ اس نے کبھی دیوار کو اتنے زندہ سے پکڑا کہ انگلیاں مٹی میں دھنسے لگیں اور اس کے منہ سے دلی گھٹیا مٹی نکل گئی۔

شماں! اُ!

اس کی آنکھیں گریبا ہر آہی سنیں۔

چلتے چلتے دونوں بالکل قریب آ گئے۔ ہوا کے جھونکے ان کی گھٹکوں کے اُونچے
الفاظ اٹھا کر اس تک لاتے مگر دُوری کی وجہ سے وہ سمجھ نہ سکتا تھا۔ ایک جھونکا
ماں کی ہنسی اٹھا لایا۔ مانوس تازہ اپنائیت کا انداز لے۔ وہ تھوڑا مستعجب ہوا۔
کیونکہ اس میں سوگاری کی جھلک تک نہ تھی بلکہ کھلتی ہوئی بھرپور ہنسی تھی۔
مگر اس کے ساتھ کون تھا؟

اس نے خود سے دیکھا اور اس کے جسم سے جان نکلنے لگی۔ وہ فضل ماشکی تھا۔
حیرت اور غصے سے اس کے پیٹ میں مردِ ڈراٹھنے لگا۔
”فضل ماشکی“ وہ بڑبڑایا ”فضل ماشکی؟“

اس کے دلخ میں بدترین دوسوں نے سنا تھا یا۔ مگر اب بھی تک قبل کرنے
کو تیار نہ تھا اور بالکل سچتر کابت بنا انھیں دیکھ رہا تھا جو قدم بہ قدم بڑھے آ رہے تھے۔
وہ بھول چکا تھا کہ اسے اپنے آپ کو چھپانا ہے اسے کوئی ہوش نہ تھا کہ دیو
کا سہارا لیا ہے یا نہیں۔ اس کی ساری حیات آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں اور
وہ منہ کھولے دیکھے جا رہا تھا۔

اب وہ دونوں اس سے چار کھیت دُور تھے پہلا کما دکا تھا۔ دوسرا خالی تھا
اور ساتھ ہی ایک دامنہ اندر کو مڑنا تھا۔ اگلے در کھیت کساو کے تھے۔

وہ آگے چلتے آئے۔ پہلا کھیت ختم ہو گیا۔ دوسرے کے ساتھ چلتے چلتے ان کے
قدم رکنے لگے انھوں نے دے انداز میں مشورہ کیا اور پھر اسے اپنی آنکھوں پر
یقین نہ آیا۔ مگر وہ کیا کرتا۔

فضل ماشکی نے عورت کا ہاتھ پکڑا۔ دونوں نے ادا حرا دھری دیکھا اور کھیتیں

کے اندر جانے والے کچے راستے پر مڑ گئے۔

اب وہ کساد کی اوٹ میں تھے اور وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔

سب کچھ بھول کر اس نے ایک جست لگائی۔ دیوار پھلانگ کر سڑک پر لگ گیا۔ سڑک دوڑتا ہوا وہ کیفیت کی ٹکڑ ٹکڑ کیا اور رک کر جھانکا۔ دونوں کساد والے کیفیت میں گھس رہے تھے۔

بغیر سوچے سمجھے اس نے بے پاؤں چکر کاٹا اور دوسری طرف سے اسی کیفیت میں داخل ہو گیا۔ پھر بتلی کی سی ہوشیاری سے آگے بڑھا۔ قدم قدم چپ چپ ایک ایک اپنچ۔

ایک دم ماں کی سنہری کی آواز آئی اور وہ وہیں دبک گیا۔ کساد ہٹنے سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ ان سے دو ہی تین گز دور ہوں گے۔ وہ دونوں سرگوشی میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ اور کان کھڑے کر کے سننے کی کوشش کرنے لگا۔

.....

فضل کی آواز میں تندہی اور بے صبری تھی یہ فکر نہیں۔ اور لے دوں گا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ اور وہ دم سادھے پڑا تھا۔

اچانک فضل بولا۔

”تو ابھی ادھر ہی“ میں چلا جاؤں تو تو دوسری طرف سے نکل جانا“

اور کساد ہٹنے لگا۔

”دم سادھے پڑا رہا۔ تیز دھاروں والے تلوں سے اس کے چہرے اوڑھ

بازوؤں پر کئی خراشیں آئیں مگر اندر سے دل جیسے کسی نے تیز چھری سے چھیدا تھا۔ اس کے ذہن میں حشر مہیا تھا۔ یہ سب کچھ کیا تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ لیکن اس اندر دنی طوفان کے باوجود اس کے بازو شل تھے اور قوتِ عمل غائب تھی۔ اس نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ ابھی اٹھ کر ان دونوں کو دو بچ لے کر اس کا جسم دار کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے احصاب قابو میں نہیں ہیں۔ گمنوں کی اس کمیں گاہ میں بخوڑی دُور اس کی ماں بیٹھی تھی اور اس تمام سانچے سے بے خبر تھی جو اس کے جوان لڑکے پر گزر چکا تھا۔ بخوڑی درپردہ باہر نکلی ہوئے ہوئے بنے پڑ گئی اور جھک کر نہر کی چھوٹی تالی میں منہ ہانڈ دھونے لگی۔

”ماں!“

وہ تڑپ کر مڑی۔ اور اس اجنبی کو حیرت سے دیکھنے لگی جو ابھی یہاں تھا اسے ماں کہہ کر پکا رتا تھا اور اب اپنی شعلہ باز آنکھیں کسی جلاؤ کی طرح اس پر جھانکتے تھیں۔

دارھی۔ چہرے پر زخم کا داغ۔ پگڑی

یہ کون تھا۔ ؟؟؟

گمراہکھوں کی بناوٹ۔

اور ناک کا خم۔

ماں کی آواز۔

وہ پہچان گئی۔

پھر وہ دونوں ان بھاری لمحوں کی گرفت میں آگئے جہاں وقت ٹرک جتا ہے۔

دوسرے پاؤں تک لہڑا رہا تھا۔ جیسے آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کو بہا
 ٹھکنے کا راستہ نہ ملے۔

وہ کہتے ہیں تھی۔ مرا ہوا بیٹا زندہ۔ اور میاں فضل ہاشمی۔ بیٹا؟
 لاوا پھٹ پڑا "ماں!!! میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔" دونوں مٹھیاں بھینچ
 کر اس نے ہوا میں لہرائیں اور زور سے رانوں پر دو ہتھڑا مارتے ہوئے چکر اکر
 بیٹھ گیا۔ پھر دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک دیئے اور زار و قطار رونے لگا۔

عورت کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے۔ نہ معلوم کس کن خیالات کے زیر اثر
 جہاں جنسی خیالات کا معاملہ ہو وہاں عورت کے دل کا راز پانا قطعی ناممکن ہے۔
 ایسے وقت اس کا چہرہ آئینہ منس۔ بلکہ پردہ بن جاتا ہے۔ گریٹے گواں کی طرف
 دیکھنے کا کوئی ہوش نہ تھا وہ کلینے اپنے جذبات سے مغلوب تھا۔

"بیٹا، دل نہ خراب کرو چند لمحے بعد وہ بولی "میں تمہیں سب بات سمجھا دوں گی"
 بیٹے نے زور سے انکار میں سر ملایا۔ وہ آنسو روکنے کی شدید کوشش کر رہا
 تھا۔ جو اسے بولنے نہیں دیتے تھے۔ مگر وہ کچھ کہنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔
 عورت اسے گونگی حالت میں دیکھتی رہی۔

"بابا... ٹھیک...." وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا اور سخت بایوسی کے عالم میں
 دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھک لیا۔

ماں اسے دیکھتی رہی۔ اسے سمجھ نہ آتی تھی کہ کیا کہے۔
 ایک دم اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور ماں کی طرف ہاتھ پھیلا کر بولا۔
 "ماں تم نے بابا کو مجھ سے مروا ڈالا۔ تم نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟"

عورت اب سنبھل چکی تھی۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا؟
تو یہ فضل ماشکی.... وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

یہ تمہارے باپ کا ختہ ہے بیٹے۔ عورت سنبھل چکی تھی جس عورت پر میرا زور
تمہمت لگائی جاتے اور وہ بھی خاندان کی طرف سے اور میرا اس کا کوئی سہارا نہ رہے
نہ لوگ۔ نہ خاوند۔ نہ بیٹ۔ تو وہ پھر اس تمہمت کا ہی سہارا لے سکتی ہے اور
کون اسے منہ لگائے گا۔ میں نے تو فضل کا کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ مگر وہ مڑ گیا۔
تم لاپتہ ہو گئے جیل والوں نے کہا کہ زلزلے میں مر گئے ہو۔ لوگوں نے ہر وقت
فضل کا نام میرے منہ پر مارا تو میں اسی کی پناہ نہ لیتی تو کہاں جاتی؟
اس نے اپنے ہاتھ بیٹے کی طرف پھیلا دیئے۔

بیٹے نے چند لمحوں کو خور سے دیکھا۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھا اپنی
ماں کو زور سے دھکا دیا۔ اور خود بھاگتا ہوا کھیت کا موڑ مڑ گیا۔
اس نے پیچھے سے ماں کی پکار سنی مگر وہ سر پٹ بھاگ گیا۔

بھاگتے بھاگتے اس کے ذہن میں باپ کا وہ چہرہ ابھرا جو بیٹے کی کھلاڑی
کا پہلا وار روکنے کے لئے دو ٹوٹے بازوؤں میں پناہ لے رہا تھا۔ اس چہرے پر
حیرت تھی۔ استعجاب تھا۔ خوف تھا۔ اور معصومیت تھی۔ وہاں دیا کاری نہ تھی۔
قبرستان کے پاس پہنچ کر دیوار پھلانگی۔ تیر کی طرح باپ کی قبر پر گیا۔ اس
پر اوندھے منہ گر پڑا اور اس کا اندرونی کرب ایک چنچ بن کر نکلا۔

”بابا!!! مجھے بتاؤ کون سچا ہے؟“

پھر نرم مٹی میں ناخن کھینچتا ہوا وہ بلب بلب کر دیا کہ ارد گرد کے درختوں

سچے بھائی اڑ گئے۔

تین دن اور تین راتیں وہ پاگلوں کی طرح گھومتا رہا۔ اور اس سوال کا جواب
سنان نہ کر سکا، اندھیری گندھی نالیوں، نیلے آسمان، چاند سورج اور پرندوں سے
پوچھتا رہا۔ مگر کسی انسان سے نہ پوچھا۔ جو قابل اعتبار مخلوق نہ تھی۔
چوتھے روز صبح وہ پولیس اسٹیشن میں تھانے دار کے سامنے کھڑا تھا اور بڑے
ہی غیر جذباتی سپاٹ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”میں جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہوں مجھے پچاسی کی سزا ہوئی تھی۔“

”ادراک“ لاہور

گشتی

پُرودہ ہٹاؤ۔ چم سے اندھا گئی۔ نیک سائیں باہر تکیے میں بیٹھا دیکھتا ہی رہ گیا، ایک ایک شعلہ لپکا اور آنکھوں میں دھول جھونک کر سامنے سے گزر گیا۔ جتنی چہنی شعلہ ہی تو تھی لیکن اس وقت اُس کے دیکھتے ہوئے چہرے پر گرو کی مہین سی تہہ چڑھی تھی۔ نیم پریشان سنہری بالوں میں راتے کی مچلتی ہوئی دھول نکل رہی تھی اور اب عُنس میں ابھام کی کیفیت، گنگنی تھی جس نے خدا پر دے میں ہوا تو اس کا جاؤد اور بڑھا۔

جس گھر کو ٹھکر اگر گئی اس نے پھر فرم قدم کیا۔ میز پر ریڈیو کے قریب اس کی تصویر پر ہار پڑا تھا۔ خالیچے کے رنگ اسی طرح چمک رہے تھے۔ اور اس میں نما کا سلوٹ نہ تھا۔ الماری میں کراکری قرینے سے دھری تھی۔ کمرے میں کیسں سالہ تھا نہ مٹی تھی۔ کاٹھ کے چوکھٹے پر چڑھا ہوا آئینہ بالکل صاف تھا اور جب برقعہ اندر کے مقابل کھڑی ہوئی تو وہ اس کے بھر پور بدن کے جاؤد سے جگمگا اٹھا۔ بڑی

بڑی پھیلیاں آنکھوں سے افق تا افق اُجالے پھیل رہے تھے۔ پھر جب اس نے
 نکلنے دُور کرنے کو ننگی باہیں سر سے اُپر اٹھائیں اور اٹھکیوں میں انگلیاں
 اکھائیں تو آئینے کی حدیں پھلانگ گئی۔ اسے اپنے بدن کی دھکتی ہوئی شان
 دیکھنے کے لئے کچھ پیچھے ہٹنا پڑا۔ انگ انگ میں چمکتا ہوا آئینے کی رنگوں میں
 نکلا۔ اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ جان گئی کہ نیک سائیں اس کے لمو
 کی مار سہ نہ سکے گا لیکن فارم میں آتے آتے تھوڑا بہت وقت ضرور گئے گا۔
 وہ چپکے سے بستر پر راز ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں مسج لیں، کان کھلے رکھے۔

نیک سائیں سُکرایا۔ وہ تکیے کا بادشاہ تھا۔ اس کی رعیت میں چند تھاباز
 چند فوسریاز، چند گرہ کٹ، چند کوجان، گاڑیاں، چند گویے، ایک سنار، ایک لوباز
 ایک پھیرا، ایک بڑھئی اور چند شاگرد پیشہ رو کے شامل تھے۔ ان میں کچھ سولوگ
 کی منزلیں ملے کر کے ملنگ بن گئے، کچھ ملنگ کا مقام پانے کی آرزو لئے رہے
 اور کچھ کے نزدیک تکیے کو کلب سے زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔

بادشاہ سُکرایا۔ اپنی نیم جہان رعایا کو تکیے کے کشادہ آنگن میں چادوں پر
 دیکھ کر شوکتِ شاہانہ دو بالا ہوئی اور جیت کے احساس نے اُسے زمین سے بلشت
 بھر اُٹھا کر دیا۔ حالانکہ نیتی پیرنی کی آمد سے پہلے وہ بھنگ کی ترنگ میں زمیں سے
 بالشت بھر نیچے چلا گیا تھا۔ ویسے وہ راج سنگھاسن پر براجمان تھا۔ بھنگ کی
 مستی نے حکم کر دیا تو وہ اور موتی شاہ دونوں ہنسنے لگے اور جوں جوں ہنسنے مستی
 سوا ہوئی اور کچھ دیر کے بعد بے طوہر ہو گئے۔ وہ بھول ہی گیا کہ نیتی پیرنی آنگن
 پیر کر اس کے سامنے سے کمرے میں گئی ہے شکست کی ندامت نے اُسے بدوہ

لیا ہے۔ یہی ندامت ٹچپ کی صہرین کراس کی زبان پر لگ گئی۔ ہوا چلی تو اس کی شان سکندری میں کچھ اور جھلکا پن آیا۔ بکھرے ہوئے حواس جمع کئے۔ اس نے کھانسن کھٹکار کر گئے کا ساز شیک کیا اور بدن کو بھجھوڑا تاکہ چست ہو جائے۔ اور فاتحانہ انداز میں مکالمہ ادا کر سکے۔ اب اس نے اپنا راج سنگھاسن محسوس کر لیا وہ اُد پنے جو تڑپے پر اپنے وزیر باتدیر — موتی شاہ کے ہمراہ بیٹھا تھا نیچے رعایا اوندھے مونہہ پڑی تھی۔ جو ہوش میں تھے اُن کی آنکھوں میں خوابوں کے حسین جزیرے بیکل تھے، جو بے ہوش تھے۔ تکیے کا کُٹا بولی اُن کے نیلے سانس کی بڑا سونگھتا پھرتا تھا۔ سدہ دری میں اس کا سکھا یا سدھایا ہوا قادی بچی مار جوا کھیل رہا تھا۔ دتہن لڑکے جو خنڈوں کا کیرئیر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے تربیت کی پہلی منزل طے کر رہے یعنی ڈنٹر پیل رہے تھے۔ بادشاہ تکیے کی ایک سمت سے گردن گھٹاتا گھٹاتا دوسری سمت لے گیا۔ یوں اعتماد اور توانائی بڑھتا گیا۔ اس نے قہقہہ لگایا اور پھر اپنے وزیر باتدیر سے کہا: "جستوں دی کھوتی ادر تھے آن کھوتی"

کانوں کے پردوں پر ضرب پڑی اور غصے پیرنی تھملائی۔ گالوں پر خشتاک سرخی پھیل گئی لیکن شنی اُن شنی کر گئی۔ اندر سے جواب نہ آیا تو بادشاہ کا حوصلہ ٹرھا۔ اُس نے پھر وزیر باتدیر سے کہا: "موتی شاہ! دیکھا ہے پھر گئی۔ اُسے شکوہ کی روٹی اچھی نہیں لگتی۔ یہاں اُبرد سے رہنا پسند نہیں۔ کوئی بوجھے میری بادشاہت میں کس شے کی کمی ہے۔ میری تدو نہیں اُسے۔ بارڈر قدموں میں ہے۔ وہاں جاکے پوچھے کس پاتے کا اسمگلر ہوں۔"

جب نیک سائیں کی بیلیخ گوئی کا سلسلہ طرہانی ہوتا نظر آیا تو منتی کے چہرے کی خشناک سُرخ شعلہ بنی، شعلہ اُچک کر زبان پر آیا۔ جلال میں آئی کچھ دیر کے لئے دُ عورت بن گئی تھی اور اب جو صورت حال پیدا ہوئی تھی۔ اس سے عورت نمٹ سکتی تھی۔ وہ آپے میں آئی۔ عورت چمک کر رنڈی بن گئی اور چمک کر بولی، بکو اس بند کرے گا کہ یونہی شروع رہے گا۔ خیرین کی طرح گھبرا گئی ہوں تو کیسے کا دماغ ہی چل گیا جانے کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو؟

عورت کو دیکھ کر وہ پچ پچ بادشاہ اور تاج بن گیا اور اس کا دماغ چل گیا تھا۔ لیکن جب رنڈی سامنے آئی تو بھاگ کی طرح پیٹھ گیا، بلکہ تھا ہوا نکل گئی اور ختم ہوا۔ یہ جمیلہ نہیں تھی جیسے ڈانٹ لیتا، مار پیٹ لیتا اور وہ منہ دھو کر ہی احتجاج کی رسم پوری کر لیتی جمیلہ عورت تھی اور عورت کے پاس آفسو سے آگے کوئی ہتھیار نہیں ہوتا۔ نیک سائیں بہتہ جھوٹ تھا لیکن جمیلہ کے بجائے جب چمکتی دکتی رنڈی سے مقابلہ ہوا تو بادشاہ کے سارے کس بل نکل گئے تھے جتن اٹھا کر کھرنے ہوئے بالوں کے سنہری جلال اور پرشکوہ چال سے باہر آئی تو وزیرِ باندہیر روم و باکر ایک طرف چلا گیا۔ نیک سائیں نے سمجھنے کے لئے سرگرمی کا لمبا کش لیا اور پھر جب رنڈی نے دودھ سے چلا کر کہا: اٹھ وہاں سے اٹھ چل! تو بادشاہ سلامت کو دھرتی کے ٹھیلے پلہ باندھا مشکل ہوئے بلوٹا تو بلکہ ڈھیر ہی ہو گیا۔

”ابھی لے سو بیٹے تو تو یونہی تھا جوتی ہے“

بادشاہ مکرے میں چلا گیا۔ اب وہ ایک پری کے حضور میں تھا جسے شیشے

میں اتارنے کے لئے قد آدم شیشہ سامنے ہی دھرا تھا اور لٹڈی کوتل سے کمر
سج سنور رہا تھا۔

”یہ باہر بیٹھ کر کپکنے کی تجھے کیا عادت ہے؟ تیری زر خرید لٹڈی تو نہیں،
تیری میا بہتا تو نہیں۔ نخرے دکھا جا کے جمیلہ کو! رو رہی ہے تیری جان کو، میں
تیری میا بہتا نہیں؟“ پری نے بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے کہا۔

”ارے اپنے نصیب میں میا بہتا کہاں؟“ ٹیکے کی زندگی ہے اور سوسو
ویداریاں ہیں۔ کیسے کوئی میا کرے ہم سے؟“

”میا تو تیری ماں نے بھی نہیں کیا، تو کیا کرے گا؟ جمیلہ نے میا کا
مزا چکھ لیا۔“

”چل چھوڑ خستے کی باتیں بھاگ بھرے!“

سامنے کی الماری کے پٹ جو پٹ تھے اور وائٹ ہاؤس کی بوتل کے پیچ
میں شراب چمک رہی تھی نیتی نیت پٹی گئی، مستی نیتی پیرنی کی آنکھوں میں آئی
اور دل نیک سائیں کا ڈولنے ڈوبنے لگا۔

وہ چن اٹھا کر باہر نکلی۔ وزیر باتدیر پھر چوتھے پر آ بیٹھا اور جاہلیاں
لینے لگا۔ وزیر باتدیر سے رجوع کرتے ہوئے بولی، ”کتنی دے پترا! بازو سے
تیرا باپ سودا لاکر دے گا۔“

”ہی ہی ہی سرکار! باپ تو میری ماں کو ہی سودا لاکر دے سکتا ہے۔
تیرا سودا تو میں لاکر دوں گا۔“

اور پھر وہ لٹکھڑانا لٹکھڑانا بیس گز کے فاصلے پر تیس بار گرتا پرتا آگیا۔

وہ بولی ”گنجر بنگ بھی پینا ہے تو تاجے کی پٹھ والی۔ پھر منجھلا بھی نہیں جاتا۔“ گنجر ہی ہی کرتا رہا۔ اس نے لات ماری تو وہ اوندھے مونہہ گرا اور پھر گھٹنے سہلاتا سہلاتا اٹھا۔ اس کا نوٹ لایا اور بازار چلا گیا۔

غسل کے بعد وہ صیقل کی ہوئی تلوار تھی۔ ایک انگ سے تھکن نکل گئی۔ اب وہ گھر کی مکد تھی بلکہ یہ گھر اسی کے لئے بنایا سجا یا گیا تھا۔ نیک سائیں کو اسی کی معرفت اس گھر سے دلچسپی تھی اور نیتی پرانی کو اسی گھر کی معرفت نیک سائیں سے دلچسپی تھی جمید کو ترک کرنے میں اس گھر کا بھی ہاتھ تھا۔ دراصل لندی کوٹا نکمہ اور اس گھر نے بل کو جمید کا گھر بنا دیا۔

نیک سائیں نے میز پر بوتل دھری اور دونوں نے بل کو سرگرت سٹکیا۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے۔

”کیا حال ہے بھتی کا؟“ نیک سائیں نے بوتل گھاس میں اُندھتے ہوئے پوچھا۔
 ”اڑکیاں اور رنڈیاں ایک ہو گئی ہیں۔ سب ٹیڈی بن گئی ہیں۔“

”اب تو پیہ بھی ٹیڈی ہو گیا ہے۔ جیسی تو قدر نہیں رہی کسی چیز کی؟“
 ”خاک قدر ہے کسی چیز کی؟“ یہ چودھویں صدی ہے۔ چودھویں صدی۔
 ”جی اجڑ رہی ہے لیکن ہٹل کھل رہے ہیں۔ گھر گرسٹیں نہ چگاتا

سیکھ رہی ہیں۔“

”مطلب یہ کہ شریف اور بد معاش ایک گھات پانی پینے لگے ہیں۔“
 ”سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو گیا ہے زمانے کو، کھاتے پیتے گھروں کی یہ لڑکیاں! یہ رنڈیوں کی اولاد خنڈی ہیں لیکن ان کے اندر کسی باگی رنڈیا

جاگ اٹھی ہیں؟

نیک سائیں حقیقت حال سے آگاہ تھا اور ٹیڈی اِزم کا حامی۔ جب سے عورت ٹیڈی ہوئی اسمگلنگ کا دھندا بڑھا اور پھر ہر عورت رنڈی تھی، رنڈی عورت۔ کوئی عورت کم ہوتی ہے رنڈی زیادہ، کوئی رنڈی کم ہوتی ہے عورت زیادہ۔ موقعے موقعے کی بات ہے لیکن عورت سے زیادہ ٹیڈی رنڈی کے قریب ہے اور قرب قیامت کی یہ بھی ایک علامت ہے۔

نیتی پیرنی نے ایک پیگ چڑھایا اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”سہرے رنگ نہیں، اُستاد نہیں۔ اب ان ٹیڈیوں کو کون نکیل دے؟“

”جیتے اِزمانہ تو دیکھ کون سا آن لگا ہے۔ اب تو عورتیں مردوں کو نکیل

دیئے پھرتی ہیں۔“

عورت گھر سے باہر نکل آئی ہے۔ ہر طرف تماشا ہونے لگا ہے۔ اب وہ

کیا خالی گھر میں رہے؟

”جہاں عورت وہاں مرد۔“

”گھر خالی ہوا ہے میں، ہوٹل آباد ہو رہے ہیں۔ جتنے زیادہ ہوٹل بڑھتے

ہیں اتنے ہی گھر خالی ہوتے ہیں۔ ہوٹلوں میں دل سہلا دے کے کھلونے مل جاتے ہیں مردوں کو۔“

”بہن کا تو خواہ مخواہ نام بدنام ہے۔ اسے سرکار تو ڈھی دے تو اچھا ہے۔“

”بہن تو ت رہی ہے۔“

”بہن تو تنے کی خبر مرنیک سائیں کو دلی طور پر خوشی ہوئی۔ اس کی تو

اگر زوہی یہ تھی کہ تہی کی اینٹ توٹ کر اس کے چوبارے میں لگ جائے اور پھر
نیتی پیرنی ہیں کی ہو رہے۔ اس نے تو منت مانی تھی کہ جس دن تہی توٹی وہ چلیں
چڑھائے گا۔

ایک مدت تک تکیے کا خوشناکرہ مسنان چارہا لیکن نیتی پیرنی کے قدم
دھرتے ہی ٹسکرانے، جھلکانے لگا۔
رات انتہائی دلغز ہی سے آئی۔

رات آئی، رات جب کچھ لوگوں کے دل بیدار ہوتے ہیں، جو سو جاتے ہیں
اُن کی روحیں دیرانوں میں بھٹکتی پھرتیں یا پھر اُردانوں کے جزیروں میں نیتی
پیرنی کا بدن بیدار تھا اور اس کے لہو کی حرارت شراب کے شعلوں کی لپک
سے ہم آہنگ تھی بھٹکتی ہوئی، اس کے پٹے کی چراند کمرے میں جذب
ہونے لگی اور پھر نیک سائیں کے جذبات نے بھی ٹوٹ پڑی۔ دونوں شراب
کے نشے میں چلنے لگے۔ رات بھر چتا جلتی رہی۔ چراند اُڑتی رہی۔ صبح ہوئی تو
چتا بجھ گئی اور دیرِ بختہ بدن قالین پر ادھ موٹے پائے گئے۔ قریب ہی
شراب کے برتن پڑے تھے۔

باہر تکیے میں نصر و حسب معمول ڈنٹر پینے کے بعد ہاتھوں سے اپنی جھکیلی
رانیں آہستہ آہستہ گھور زور سے مسل رہا تھا۔ اُس کی پیشانی پر سینے کے
قطرے آدھڑاں تھے۔ بدن پر جوانی چمک رہی تھی۔ وہ ہر روز بڑے خضر و خضر
سے پڑتے آکر پہلے بدن کی مالش کرتا، پھر کسرت کرتا اور آخر میں رانیں مسلتا
یہ اس کی عبادت تھی۔ اسے یہ نکتہ اپنی طرح معلوم تھا کہ صفرِ اول کا غنڈہ

جنے کیلئے بدن کمانا پڑتا ہے۔ البتہ یہ کہیں اسے معلوم نہ تھا کہ بدن کا بائیس لاکھ کلو کویت کرتا ہے۔

اس کی ساری سوچ ایک ہی نقطے پر سمٹ آئی اور وہ گرو پیش کی دنیا سے بے خبر اپنے بدن کی فسادابی اور لہو کی تابانی کے نظارے سے آپ ہی جیت ہونے لگا۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ نیتی پیرنی اسے تک رہی ہے۔ بل بھر کو اس کی نگاہیں اس کے بدن سے نہ نہیں۔

نیتی پیرنی خوش ذوق تھی۔ وہ بھی جن جوانی کی نگہداشت کے راز سے آگاہ تھی۔ قدرت نے اُسے اچھا بدن دیا تھا، اچھی شکل و صورت عطا کی تھی۔ اس کے نزدیک اسے نکھار سنوار کر رکھنا اور ثواب تھا اور کارساز کی منشا کے مطابق انہیں بگاڑنا گناہ تھا۔

نصرو کو دندش کرتے دیکھ کر نیک سائیں بھی مسرور ہوا کبھی نصرو مریم ساڑ کا تھا۔ اس کی ہڈیوں پر گوشت کے بغیر ہی پھڑہ مڑھا تھا۔ نیک سائیں کے زیر ہدایت نصرو نے گوشت پوست کو ترقی دی۔ یوں نئے نصرو نے جنم لیا۔ نصرو درحقیقت نیک سائیں کی تخلیق تھا۔

نیک سائیں کے بدن پر صرف لنگوٹ تھا۔ ہاتھ میں پیرز سوپ کی ٹکیہ تھی جو جاندی کے سوپ کپس میں دھری تھی۔ نیک سائیں کا لنگوٹ ویسی وضع کا تھا لیکن مزاج بالکل دلائی تھا اور یہ دلائی مزاج اسے لنڈی کوتل سے جو تھا۔ لنڈی کوتل اس کے قدموں میں تھا۔

موتی شاہ نے بھی حسرت بھری نظروں سے نصرو کا بدن دیکھا۔ اس کے

دل میں اُمنگوں کا طوفان چل گیا اور اس طوفان کے گرد ماضی کے دھڑکے لپٹ گئے۔ نضرو کے بدن میں بھلیاں ترپ رہی تھیں اور ان سے پھوٹتی ہوئی جوت اس کا مستقبل جگمگا رہی تھی۔ موتی شاہ بھی کبھی یوں ہی جوان تھا اور اس کے بدن نے بھی کبھی جوانی کے سیل بے پناہ کو پناہ دی تھی لیکن پھر جو بھی مر گیا اور اسے نکمہ کھا گیا۔ رنڈی کو چوبارہ کھا جاتا ہے۔ غنڈے کو نکمہ۔ رنڈی چوبارہ نہیں چھوڑتی۔ غنڈہ نکمہ نہیں چھوڑتا۔ انھیں بیٹھنے کو تو ضرور جگہ چاہیے تھی۔

جو جی حسین اور نازک مزاج تھا۔ لانا قدا پتلا جسم بڑی بڑی آنکھیں داشت چمبے کی کلیاں۔ ہر وقت منہ سارہتا۔ موتی شاہ اسی ادا پر فریفتہ تھا۔ جو جی کو اختیار تھا کہ بازار کی جس دکان سے چاہے سودا لے۔ جو چیر چاہے اٹھا لے۔ جسے گالی دے وہ ٹپ چپا پٹس لے۔ جسے میٹھا چاہے وہ شرافت سے پٹ جائے۔ اس کی پٹائی میں موتی شاہ کی صرف وجاہت ہی شامل نہ تھی۔ اس کے کمائی دار چاقو کا دبدبہ اور خوف بھی شامل تھا۔ جو جی کبھی جلال میں آتا تو اس کا گلابی چہرہ تمنا کر لال گلاب بن جاتا اور پھر دیکھنے والا اسے گلے لگنا چاہتا تھا اور یہ جلال تو بس گھڑی دو گھڑی ہی کا ہوتا، پھر وہی لال شعلہ گلابی تاؤ بر آ جاتا۔ جو جی کیا مرا، بازار مر گیا۔ موتی شاہ مر گیا۔ اس کا جنازہ اس دھوم سے نکلا جیسے کسی ہیرو کا جنازہ ہو۔ موتی شاہ دل شکستہ ہو گیا، ہاتھوں میں سکت نہ رہی۔ اس نے کمائی دار چاقو پھینک دیا۔ نیکی کی مٹی میں مل کر مٹی ہوا آج جو اُس نے نضرو کا سمجھو بدن دیکھا تو وہ تلوار تھا۔ اس کے بدن میں نضرو کا بدن ہلکورے بیٹھ لگا۔ اس کے بدن میں لعل سی مچی۔ اس نے ہوا میں باندھ لیا

کھڑے کھڑے دوڑ لگائی۔ نضر اس حرکت پر ہنسا اور پھر اس کی ہنسی قصوں میں بدل گئی۔ ان قصوں کی پوٹ موتی شاہ کے دل پر لگی جو اس نے نوٹ کر لی۔

نیتی پیرنی کے بال کھلے تھے۔ برچھکتی تو میں تھلا اٹھتیں۔ سامنے سے گریبا کھلا تھا اور ویسے تو سارا بدن ہی کھلا تھا۔ وائل کی قمیض سے کیا ڈھکتا چھینتا۔ کپڑے تو جیسے اسے چھپتے تھے۔ یوں تو کھلے گریبان پر ہر کسی کی نگاہیں جاسکتی تھیں لیکن اس تک پہنچنے والا تلکے کی حدود میں کہیں نہ تھا۔ یہ تو ٹیک سائیں ہی کو شرف حاصل تھا۔ اس کے شاواہب رشیں پنڈے کو چھو سکے۔

نیتی پیرنی موت تھی۔ قریب آنے والے کے لئے! نہ جانے ہر کسی کو ڈس لیتی نضر کو قہقہہ لگاتے دیکھا تو اس نے گریبان کچھ ادا کھول دیا اور پورے تلکے کو فیر کی زد میں لے لیا، موتی شاہ پر قہر آلود نظریں ڈالتی ہوئی نضر کے پاس چلی گئی اس کے حضور میں ایسا بھرپور بدن تھا جس کا انگ انگ جوانی سے لبریز تھا۔ ایک خفیف سی خراش زخم کا مہولی سا نشان بھی نہ تھا کہیں پنڈا ڈھلا ہوا چاند۔

”یونہی ہنسا رہ کر قہقہے لاتا رہ کر ہڑا اچھا لگتا ہے تو“ نیتی پیرنی نے پاؤں تلے سگریٹ مسلتے ہوئے کہا۔

پیرنی بی موتی شاہ کیوں جلا ہے مجھ سے ۱۹ سے میری ہنسی اچھی لگتی ہے، نہ قہقہے اچھے لگتے ہیں؟

”اس کا جو جی جو سر گیا۔ وہ تو پاگل ہے، پاگل۔ جو جی کی یاد میں گھل گھل کر مٹو کا ہو گیا ہے۔ اس کے اندر کچھ نہیں رہا۔ بڈیوں میں سے گودا بھی نکل چکا ہے۔ جوانی اور جو جی کو یاد کرتا رہتا ہے۔“

”جوانی کے لئے بڑی جان ماری پڑتی ہے بی بی! جان بنانا کھیل نہیں۔“
”ٹھیک کہتا ہے تو نصرو!“

ادھر مکالمہ ہو رہا تھا، ادھر کنویں پر مولا ملنگ بوکے نکال نکال کر نیک سائیں پر چینیک رہا تھا۔ نیک سائیں نہانا کم اور نیستی پیرنی کو دیکھتا زیادہ تھا۔ نصرو بھی اس کی نگاہ میں تھا اور کیسے نہ ہوتا؟ نیک سائیں اس کا خالق تھا اور اب اسے اپنے منصوبوں کا معیار سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں بھی نصرو کے چالو ہونے اور اس کے کام کی رسم اقتلاح کا وقت نہ آیا تھا۔

نیستی پیرنی نے ایک بار پھر نصرو کا بھڑوڈ جائزہ لیا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلی گئی

نیک سائیں نہا کر وزیر بادشہ کے پاس چلا گیا۔ نصرو کنویں پر چلا گیا۔
نیستی پیرنی نے اندر سے موئے ملنگ کے ہاتھ حلوے پوری کا طباغ بھیجا۔
چائے کی چینیک خان کی دکان سے آگئی۔

نیک سائیں پر ابھی تک فاتحانہ کیفیت سوار تھی۔ اس نے موتی شاہ کی راہ پر ہاتھ مار کر کہا، ”مولا جانے! عورت کو جوتی تلے دبا کر رکھتا ہوں۔ کیا مجال ہے! جانے اور لوٹ نہ آئے۔“

”اوہ! آہو بادشاہ! نیستی پیرنی کی کیا ہستی ہے جو تجھ سے مقابلہ کرے؟“
”مقابلہ! تو بہ کر کے کہتا ہوں، غرور کی بات نہیں، جس عورت کا ایک دھڑکلا وہ بھرا ہے۔ وہ دوبارہ کسی دوسرے کے پاس نہیں جاتی۔“

”کیا کہنے وزیر بادشاہ؟“

”قسم ہے مولا کی ارستم کی بھی عورت ہوتی سے لڑائی بنا لوں۔ اللہ مدد فرما
ماں کا یار ہوں، ماں کا یار!“

”مجھے خبر ہے تیری بادشاہ انگلی کی عورتیں تجھ سے پناہ مانگتی تھیں۔“
”گلی کو تو بھگن کر دیا تھا۔ میں نے قسم پروردگار کی! ابھی منڈے کے
پاس جوتا تھا تو گلی کو میری خبر ہو جاتی تھی اور پھر ادھر رنڈیوں نے میری شکل
دیکھی۔ ادھر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔“
”تجھ سے ڈرتی تھیں بادشاہ!“

”موتی شاہ! ابھی مفت بری نہیں لڑائی۔ پہلے ناک پر دھا کا رکھنا تھا
پھر رنڈی کی دلیں پھاؤں دھرتا تھا۔
”بڑی بڑی رنڈیاں پاؤں پکڑتی تھیں۔“
”نیتی پیرنی گھٹ تھی کسی سے؟“

”جواب نہیں اس کا۔ خدا کی قسم ناک پر کھتی نہیں بیٹھے دیتی تھی۔ بڑی مزہ
زور تھی۔ دس روپے روز دیتی تھی کرایہ چوبارے کا۔ بڑی سچ سنو کر بیٹھتی تھی۔
ابے مفت بر کو چا تو مار دیا تھا اس نے اتنی تو سہتہ چھوٹ تھی بمغورہ اتنی تھی
کہ آنکھ بھر کر نہیں دیکھتی تھی تماش میں کو۔ لیکن دیکھ لے! رام کر لیا ہے اسے!“
”اوسے نہیں جواب تیرا بادشاہ!“

”مولا جانے باندھ دیا ہے پیرنی کو۔ ہل نہیں سکتی۔ دو دفعہ بھاگی ہے لیکن
آپ ہی واپس بھی آگئی ہے۔ میرے یار اس کی کیا ہستی ہے کہ یہاں سے جلتا؟
عورت تو میری مٹھی میں ہوتی ہے!“

پوری جلوہ ختم ہوا تو باتیں بھی ختم ہوئیں۔ مولانا ملک طباقی نے کہا نہ گیا۔
تو نیک سائیں کی باتیں بھی اندر لے گیا۔ طباقی رکھتے ہی اس نے ساری باتیں
اُگل دیں۔ ایک ایک بات زہر میں بھجھا ہوا تیر تھی۔ ہر بات دل میں جھنجھکی پیرنی
نے اسے بالوں سے گھسیٹا اور دکھتی میں دو چار لاتیں جڑیں۔

”بدختم، نمک حرام! تیرے سے میری حمایت میں کوئی بات نہ نکلی تو نے
وہیں دتے کا مونہہ نہیں توڑا جب وہ میرے خلاف زہرا گُل رہا تھا؟“
مولے ملک نے روتے روتے کہا: ”بی بی دلا بھرا حیر دستا ہے۔“
”جانتی ہوں اسے۔ بتا پھرتا ہے زبردست خجھہ ایسے کے لئے!“
”بی بی وہ کسی سے ولا نہیں جاتا۔“

”رندی کے! نیت پیرنی اسے دل دکھائے گی۔ دیکھنا کیسے شر رگ دباتی
ہوں۔ ٹوٹے چھتر کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔“
مولانا ملک ایک جانب ڈرسم کر بیٹھ گیا اور دیکھنے لگا کہ شعلوں بھری یہ
آندھی کب ختمے گی۔

وہ سچ پنج آندھی ہی تھی لیکن اس کی رفتار زیادہ نہ تھی کیونکہ جس قالین
پر آندھی چل رہی تھی وہ بہت ملائم تھا، بالوں کی گھچاؤں سے ریشمیں دلدل
ہو گئی تھی۔ اس میں آندھی کے پاؤں دھنس دھنس جاتے یہی ریشمیں دلدل
نیک سائیں کی حمایت میں خاموش آواز بن کر اس کے دل و دماغ میں اتر گئی۔
وہ غصے کے مارے قالین کو کھوندتی رہی۔ اپنی دانست میں نیک سائیں کو تھوڑے
تکے روندتی رہی جس نے کمرے میں اس کے حضور سارا لندھی کو تل رکھ دیا

تھا۔ کوچ پر دم سے گری تو اسے ہلکے ہلکے نرم نرم جھٹکے لگے جیسے نیک سائیں نے اسے جھولا جھلایا ہو۔ اس کی آنکھوں میں گلی کا وہ چوہا بارہ گھوم گیا جو بڑا بجا گو ان تھا اور جہاں شام کو روشنی کے پھول کھلتے ہیں تماش بین کی آرزوئیں اس کے گرد ہالہ بنا لیتیں۔ وہ اُجالے کے قلعے میں رانی بنی رہتی اور لوگ جھروکے درشن کے لئے بار بار چکر کاٹتے رہتے۔ دہلیز پر وہی پاؤں دھرتا جو راجہ ہوتا۔ دوسرے تو بس دُور ہی سے آنکھ مار کر جی خوش کریتے اور اس کی دہلیز پر پاؤں دھرنے کی تمنا کر کے چلے جاتے لیکن اب سبھی اُبڑ رہی تھی تلخ برباد ہونے کو بھلا ہر صبح تباہی کی خبر لاتی اور اُسے نیک سائیں سے قریب تر کر دیتی۔

سگرٹ پیالہ پیالہ پیا۔ کچھ جی ملکا ہوا پھر صندوق میں سے دس دس کے نوٹ نکال کر مولے ملنگ کے ہاتھ حید کو بھجوائے۔ مولے ملنگ نے جاتے جاتے کہا: بڑی نیکی کراتی ہے تو بی بی! جیلاں بچاری کا اس دُنیا میں کون ہے؟ ابھی تو اس کے بچے بھی جوان نہیں ہوئے۔

چاند بھڑ نور عنافی کے سانفد طلوع ہوا۔ ملنگ سرور میں آئے۔ چاندانیں محبوب تھا، ہجر و فراق کا سانفد تھا، خوب صورتی کی علامت اور بس اس کی کرن کلیوں سے زمیں و آسمان جگمگا رہے تھے۔ یہ کرن کلیاں تو ملنگوں کی محفل سجا رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر قوالوں نے بارہا اتھائی جوش و خروش سے نعرے لگائے اور ملنگ بھنگ کا پیالہ پی خیال کی سیڑھی لگا، آسمان پر چڑھے اور ستاروں پر کند ڈال آئے۔ بھنگ کا پیالہ پی کر وہ تھکے جاتے اور ان کے خیال سپرنگ بن جاتے۔

رات کو ملنگ سرور میں آئے اور قوالی کی محفل جمی۔ وہ ملنگ لڑکھڑا کھڑا کر رقص کرنے لگے۔ ویسے ہر ملنگ جھوم رہا تھا۔ سر بول اور گھڑے کی بہرہ جیسے روح میں جھوم رہی تھی اور پھر پوری کائنات گھوم رہی تھی۔ موتی شاہ کے گلے میں نور تھا۔ اس کی آواز نے جاؤ و جگایا اور مڑھیلی آواز نے سب کو مر مست کر دیا۔ مستی و مرستی میں بدل گئی۔ ٹیک سائیں کی آواز بھی کم و بیش نہ تھی۔ مرستی نے رقص کرنے والے ملنگوں کا انگ انگ ٹوڑ دیا۔ وہ گر گئے اور فرش ہو گئے۔ ملنگ ہی تو تھے۔ افریقہ کے جاؤ پرست تو نہ تھے جو چاندنی میں دیوتا کو زیر کرنے اور کھیتیاں لعلہانے کے لئے رات رات بھر ناچتے اور ٹھکنے کا نام نہ لیتے۔ یہ تو بھنگا پی کر خود ہی زیر ہو جاتے دنیا کو کیا زیر کرتے۔

نغمہ عروج پر تھا تو نغمہ بھی آگیا۔ دو گھوڑا بوسکی کی بے داغ بے سلوٹ چمکیلی قیس پہنے ہوئے تھا۔ ہر سے بلو والا ریشمی لاپا باز دھڑکھاتا تھا چاندنی رات میں بھی اس کے چہرے پر تمازت تھی۔ ہوا سے دھوئی مڑھتی تو اس کی پیٹلیوں کا شکار ڈور ڈور پڑتا اب تو نیچی بیرنی بھی باہر آکر چوتھرے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظر میں وہ رہ کر نضرہ کی تنی ہوئی گردن اور چوڑی چمکی چھاتی پر جاتیں۔

یہ سحر اجملا بھر پور بدن جس پر کوئی داغ دھبہ نہ پڑا تھا۔ اس کے دل میں پرست ہو گیا۔ کھٹکتی ہوئی جوانی کے اس چمکتے ہوئے ساز کو ابھی کسی نے بیدار نہیں کیا تھا۔ نضرہ ایک تیز خواہش میں کڑیتی بیرنی کے بدن میں تیر گیا۔ اس نے نضرہ کو ٹپکے کا آم سمجھ لیا جو ٹوٹا تو اس کی جھولی میں گرے گا۔

نضرہ مستوں اور مرستوں کے حلقے میں بیٹھ گیا۔ موتی شاہ اور ٹیک سائیں

کی آواز کا جھانڈا اس پر بھی چل گیا۔ وہ بھی مرستی میں جھومنے لگا۔ موتی شاہ نے ذرا دم دبا کر سگریٹ میں چرس بھری۔ سٹلنگا کر چار کش لئے اور نورو کے کان میں کچھ کہہ کر سگریٹ اسے تنہا دیا۔ نورو نے کش لیا ہی تھا کہ وہ لپک کر آئی جھپٹ کر اس نے سگریٹ چھین لیا اور جوتی سے مسل دیا۔ اس وقت نیستی پیرنی کا چہرہ چنگاری تنہا اور دل کی دھڑکن تیز تھی کیلئے پر ہاتھ رکھ کر دو چار گھڑی گھڑی رہی اور پھر اس کا سارا غصہ اس کی دائیں مٹھیلی میں کھینچ آیا۔ آگ سے لبریز لپٹے موتی شاہ پر بے تحاشہ برسے گئے۔ نیک سائیں ہاتھ پکڑتا تو جانے کہاں نیک مشق جاری رہتی۔ نیک سائیں بڑی مشکل سے اسے حلقے میں سے لے گیا۔ کمرے میں جا کر اسے کوہج پر بٹھا دیا۔ غصے کے مارے اس کا بدن پھر پھر کانپ رہا تھا۔

”بھروسہ عورت تھی، رنڈی تھی۔ رنڈی کا غصہ عورت کے غصے سے زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ اندر سمٹنے کی بجائے باہر چھٹک آتا ہے۔“

نیک سائیں نے غصہ اٹھوانے اور اسے ہلکے تاڑ پر لانے کے لئے بات چھیڑی۔ دلبر جانی! نورو کو بھی چار ہاتھ لگا دیئے ہوتے؟

”اس کے تو میں بال فوج لیتی وہ تو وہاں سے کسک ہی گیا۔“

”موتی شاہ چنگاندا دیکھتا ہی نہیں، ہر کسی کو چرس پر لگا دیتا ہے؟“

”کمینہ سونے سی جوانی کو داغ لگانا چاہتا ہے۔ وہ معصوم لڑکا، اناختی

جوانی۔ اسے کیا خبر یہ زہر ہے؟“

”نورو تو میری آس ہے رانی! جوان ہے! جیدار ہے۔ ایک دن اپنا

سارا خندا اس پر چھوڑ دوں گا؟“

”اور تو چہین کی بنسری بجائے گا۔ نیکی میں بھنگیوں، پرسلیوں کے ساتھ پڑا رہے گا۔“

”وہ کیوں جب کبھی ڈھیر سا رامال لانا ہوگا۔ میں آپ جاؤں گا۔“
”ہوں۔“

نصرو کے بارے میں نیتی پیرنی کونیک سائیں کی نیت کا پتہ چل گیا۔ اگلے روز اجنبیوں کی ایک ٹولی آئی اور نیک سائیں کو اپنے ساتھ لے گئی۔ کام خطرناک اور چونکے سودے کا تھا۔ اس میں فقط دلیری کام نہ آتی، عقل، رش، تجربے اور حاضر و ماضی کی ضرورت تھی۔ یہ علم دوسرا تھا جس کی تربیت نیک سائیں نے زندگی کے خارزار میں پائی تھی۔

تکلیف خالی خالی تھا۔ موتی شاہ بھی ہم پر گیا تھا اور نصرو حسب معمول کسرت کر رہا تھا۔

نیتی پیرنی اس کے پاس چلی آئی۔ سر دست اس نے اس کے بال نوچے۔ نہ سگریٹ والی بات چھیڑی۔ اس وقت وہ کیسے غصے میں آئی۔ نصرو تو اس کے دل میں محل رہا تھا۔ بولی اڑیا اور امیرے ساتھ تو چلا، کام ہے مجھے۔“
نصرو کی آنکھیں جھٹک گئیں اور اس پر شرم کا بوجھ پڑ گیا۔ وہ تو اس کے سائے تلے دب ہی گیا۔ شرم تو چیز ہی ایسی ہے کہ جوانی کی صبح اولیں بن جاتی ہے اور پھر عورت کے سانسوں کی گرمی سے ایک دن چمک جاتی ہے۔ تب شرم بونہ کے اڑتی ہے۔ وہ شرم کے مارے اودھ موا ہو کر رہ گیا۔ اس کی زبان سے صرف ”اچھا“ نکلا اور وہ بھی بڑی دھیمی آواز میں۔

نیتی پیرنی پھول تھی، پھول سُکرایا۔ اس نے اپنی دو انگلیوں سے اس کی
 ٹھوڑی اُدبھی کی اور اس کی بھکی ہوئی آنکھوں کو اپنی آنکھوں کے متوازی لے
 آئی۔ ٹھوڑی تھامے رہی۔ مبادا پھر آنکھیں جھبک جائیں۔ اس کے بدن میں جھجک
 سی آئی اور چہرے پر سُرخ سمٹ آئی۔ وہ سُکرایا اور اس نے نیتی پیرنی کی نظروں
 سے نظریں ملائیں۔ جلو سے سرور سے لہریز ہو گئے۔

”کیوں رے نصو! اس ماں کے یار سے سگرٹ کیوں لیا تھا؟“

”اس ماں کے یار نے کہا تھا، چرس کا سگرٹ پیتے ہی سودگ تیرا منہ جالیگا۔“

”سو نہ، کیونکہ کم ذات نے بات بھی کی تو کیسی۔ حرامی سودگ میں پہنچ جائیگا۔“

”سودگ میں پہنچاؤں گی بئی؟“

”ہج؟“

”ہج؟“

”کب؟“

”آج لیکن قسم کھا میری جان کی کہ کبھی سگرٹ نہیں پے گا، چرس والا زخا۔“

”تیری جان کی قسم! سگرٹ نہیں پیوں گا۔ نہ چرس والا ذ خالی۔“

”بس اب سودگ تیرا ہو گیا۔ جھٹ سے منالے۔ بازار ہوا میں؟“

”نصو بدن کی حرارت کم کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔“

نیتی پیرنی کمرے میں چلی گئی تاکہ اپنے رانچھے پر جادو کرنے کے لئے میرے

بھی زیادہ خوبصورت بن جائے۔ اس نے غسل کیا اور نئی شادابی سے طلوع

ہوئی۔ اپنے آپ کو خوشبوؤں میں بسایا۔

اس کے اندر بدن بول رہا تھا۔ چاروں طرف خوشبو کے مجھورتیاں رہے تھے۔ کپڑے پہن کر وہ بیس سال کی تفتی بن گئی۔ نصرو نے اس میں جوانی کا احساس جگا دیا۔ ہاتھوں کی رگیں چھپ تو نہ سکیں لیکن اس کے ہونٹوں پر کھلے ہوئے پھولوں اور دانتوں کی چمپا کلی نے اسے سجا کر دیا۔

دونوں بازار چلے گئے۔ اس کے بدن کی جھک سرور بخش تھی نصرو صبح پہلے سورگ میں پہنچ گیا۔ سورگ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے پاؤں تو جیسے زمین پر ٹپکتے ہی نہ تھے۔ اس کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ نینتی پیرنی ایسی ذی شان عورت اسے شرفِ رفاقت بخشے گی۔ وہ کب جانتا تھا کہ جوانی ایک غرور لاتی ہے، ایک کا غرور توڑتی ہے۔ وہ بار بار گردن تان کر نکلیں اور بھی کرتا لیکن گرل اپنے آپ جھجک جاتی، لگاؤ نہیں پہنچا ہو جاتیں نینتی پیرنی کی بڑی بڑی آنکھوں سے چمکتی ہوئی گرلین اکبر سے ہمیں نقاب میں سے چھپ چھپ کر باہر آ رہی تھیں اور دیکھنے والا ان کے نقاب میں تھا۔ بسے حلوائی کے تھڑے پر خیرا جھرنی والا اور اس کے دوسرے بیٹھے ہوئے تھے۔ اکھٹوں نے نصرو کو عورت کے ساتھ جاتے دیکھا تو حیران ہوئے۔ انہیں امید نہ تھی کہ نصرو اتنی جلدی پیر پرزے نکال لے گا۔ خیرے جھرنی والے نے کھانس کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا "معتوق خبروں ہے؟"

نصرو نے سنا تو اس کا چہرہ تھمتا اٹھا۔

پھر اس نے کہا "اس معشوق کے لئے جان بھی دینی پڑے تو پروا نہیں؟" نصرو کا چہرہ اور بھی تھمتا یا لیکن "چپ رہا۔ دراصل اتنی جلدی پیر پرزے

لکھنے پر جھنپ سا گیا تھا۔ نیستی پیرنی پر دو پاؤں میں ہوئیں اور دو چپ رہا۔ اس نے،
نقاب اُٹا اور نضرو سے کہا۔

”کیچھ کینے بد ذات کی کھال، دیکھتا کیا ہے؟“

یہ جذبہ بھلی کا بھالا تھا جو اسے جا چھا۔ وہ بھلی کا بھالا بن گیا اور بھلی کا
بھالا اس نے خیرے جھرنی والے کو چھو دیا۔ وہی چاقو جو انٹریاں کاٹ چھینکا
خیرے جھرنی والے کے سینے پر اس کی مان چیر گیا۔ اس کی دھوئی خون سے
لخت ہو گئی۔ چاقو تو خیرے جھرنی والے کے پاس بھی تھا لیکن ڈب ہی میں رہا۔
نضرو کی کلائی کا زور دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ نضرو کا بازو اس تیزی سے حرکت میں
آیا کہ سب دنگ رہ گئے۔ اس کی کلائی میں نیا کس بل تھا اور اسکی انگلیوں کی حرکت
اتنی زبردست تھی جیسے وہ آدمی کو نہیں ساندھ کو مارنے چلا تھا۔ ٹیڈی بائی ٹیک
نے آنکھ ماری پھر گالی دی۔ پھر دھکا دیا اور خیرا جھرنی والا بھاگ گیا۔

نضرو نے چاقو ہوا میں لہرا کر کہا ”اڑ بھگل“

بھگل نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ گلی میں مڑ کر غائب ہو گیا۔ نضرو نے سینہ تات
کر کہا ”عورتوں کی کمائی کھانے والے یہ کیا لڑیں گے مجھ سے؟“
ٹیڈی بائی ٹیک نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اس نے ہوا کا بدلتا ہوا رخ
دیکھ لیا تھا۔

نیستی پیرنی نے نضرو سے چاقو لیا اور اسے لے کر چلی گئی۔

خیرے جھرنی والے کے بڑے کور تھے بہت ب کا بد معاش بہت الفاف
ترقی پانے کے لئے بے تاب تھا۔ لیکن نضرو نے کرکری کر کے اس کی ترقی کھا

راستے بند کر دیئے اور اس کا مستقبل تاریک کر دیا۔ علاقے کے وہ لڑکے جو اس کے شاہزادہ مستقبل، بڑھتے ہوئے رسوخ اور پھلتے ہوئے کاروبار سے متاثر ہو کر دھڑا دھڑا اس کے حلقہ احباب میں داخل ہوئے اور اس کے حکم سے وارنٹیں کرنے لگے تھے بدظن اور بد دل ہو گئے۔ اس کا تو سارا طہسم ہی ٹوٹ گیا۔ ادھر یقینی پیرنی کے دل پر ضرور کی دھاک کچھ اور بیٹھ گئی۔ اب وہ اکثر نصرو کو لے کر بازار میں سے گزرتی کسی کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے اور آوازہ کنے کی جرأت نہ ہوتی۔ یقینی پیرنی نے ایک اور نگہبان پالیا۔ وہ اسے ہر وقت خوش رکھتی۔

سورگ میں رہتے رہتے اس میں اکنا ہٹ آگئی۔ آدمی سورگ سے بھی اکنا جاتا ہے۔ اس میں امیری کا احساس بھی شامل تھا۔ آخر ایک دن اُس نے کہا ”میں فس کلاس پشوری مانگہ لوں گا۔“

”مال ہے“ یقینی پیرنی نے پوچھا۔

”چاچے سے لے لوں گا۔ گھوڑی اس کے پاس ہے۔ منبری مانگہ وہ لے دے گا۔ تجھے مانگے میں پٹھا کر بچوں کا تو مزا آجاتے گا۔“
 ”مانگے گھوڑے کے اب دن نہ گئے۔ سکوڑے لے لے۔“
 ”سکوڑے لئے چاچا دھیلا نہیں دے گا۔“

”رام نیک سائیں سے لے دوں گی۔ پہلے کہیں سے سکوڑ چلا نا سیکھو۔“
 پھر میں تجھے آپ پل کے سکوڑ خرید دوں گی۔

”بس؟“

”بس!“

نصرہ کے لئے سکوتر تو بہت بڑی نعمت تھا۔ آدمی کو کار اور کوٹھی پاکستانی اور خوشی کی کیفیت حاصل ہوتی ہے لڑکے کو سکوتر پا کر حاصل ہوتی ہے۔ وہ فرزند فرما لے کے ڈرائیونگ سکول میں سکوتر چلانے کی تربیت پانے لگا۔ سکوتر اس کا خواب تھا، دلفریب خواب اور وہ سوچنے لگا۔ جب وہ بخت پورنی کر بیٹھے بیٹھائے گا، نیستی پورنی اپنی باہیں اس کی کمر میں ڈال دے گی اور وہ سکوتر اڑاتا جائے گا تو نکستی اُنہی ہواؤں میں اڑنے لگے گا۔ بالکل سدرگ میں ہو گا۔ سکوتر پر پوی اڑائے گا اور فٹ پاتھ پر چلنے والی دنیا اسے رشک کی نگاہ سے دیکھے گی۔

نیک سائیں کو گئے کئی دن ہو گئے تھے۔ لیکن اس میں تشویش کی کوئی بات نہ تھی۔ وہ لنڈی کوتل سے سیدھا کراچی چلا گیا ہو گا، وہاں سے اور کہیں نکل گیا ہو گا۔ بڑا اکٹا تھا۔ اس کے پاس ہم چوٹی کے لئے عقل، تجربے اور حاضر دماغی ایسے تینوں حربے تھے۔ یوں ہی تو روپے کی ریل پیل نہ تھی، نیستی اس کے گنوں سے خوب اٹکا، تھی، وہ اس کی فکر کرتی تھی۔ وہ اس کی تھی اور نصرہ، نصرہ اسکے بے پیاں غرور اور حکمت کو سنبھالا دینے والا، اس کی آرزوؤں میں کھٹکنے والا جو اس تھا اس نے ایک خانے میں عقل، تجربے اور حاضر دماغی کو جگہ دی، دوسرے میں بھر بھر کر کو۔ وہ اپنے وقت کی دو روپے تھی۔ اگر دو روپے نوکھا پنے دل و دماغ اور بدن میں رکھ سکتی تھی تو وہ دو کو بھی سنبھالنے کی مجاہد نہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی تکمیل اور شب و روز کی مرگرمیوں کے لئے دو کو ضروری سمجھا اور اب تیسرا بھی آدمی کا، بالکل محصور صورت کا پیدا پایا سمجھ لا سکا۔ یہ حیلہ کار کا بولی تھا۔

بالکل باپ پر گیا تھا۔ ہلکی ہلکی مسکراہٹ لئے چپ چاپ کمرے میں داخل ہوا۔ نیتنی
پیرنی سنگھار مینڈو بیٹھی بال سفار رہی تھی۔ اس نے اسے آئینے میں سے دیکھا
تو تڑپ آنے کو کہا۔ بولی: ”ذرا پیچھے سے چولی کا بند تو کھول دے۔“

بولی جھینپا۔ آگے تو بڑھا لیکن قدم پھر پیچھے ہی رہا۔ وہ ٹرٹش زد ہو کر بولی
”رندھی کے! دم گھٹ رہا ہے جلد ہی کھول!“
رندھی کو آگے بڑھا اور اس نے بند کھول دیا۔

”کیسے آیا ہے رے بولی؟“

”اتنی! اتنی کی مشین ٹوٹ گئی ہے۔ سلائی کے لئے ڈھیر سارے کپڑے اُتے
ہیں مشین ٹھیک کروانے کو پیسے نہیں۔“
”پھر میں کیا کروں کھجرا؟“

کھجرا چپ رہا۔ نیتنی پیرنی نے کنگھی رکھی اور ہاتھ مونہہ دھونے چلی گئی۔
کھجرا ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔

نیتنی پیرنی نے ہاتھ مونہہ دھو کر بدی سجایا، چولی بدلی۔ پھر اس نے
سارھی پہنی۔ تیار ہو کر بولی: ”چل پترا!“

وہ رات گئے تک جمیلہ کے گھر میں رہی۔ لوثی تو نصرود کمرے کے باہر ٹھل
رہا تھا۔ مارے خستے کے شکل تھا۔ وہ نصرود کو دیکھتے ہی مسکرائی۔ نصرود نے اس
مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہیں دیا۔ پھر جب اس نے کنگھی تھمائی تو نصرود نے
خاموشی سے تھل کھول دیا۔ وہ تو کپڑے بدلنے لگی اور نصرود چپ چاپ بیٹھ گیا
اب تو اسے نصرود کی سنجیدگی کشتی۔ بولی: ”تو چپ چپ کیوں ہے نصرود؟“

”گیارہ بجے ہیں میری گھڑی ہیں اتنی دیر کہاں رہی؟“
 ”بہتہ، تو بھی بس دہی ہی نکلا۔ جمیلہ کے گھر گئی تھی۔ آپ بھی بیدار ہے۔ اس
 کی مشین بھی بیدار ہے۔ دونوں کو ٹھیک کر دایا ہے میں نے!“
 ”لیکن جمیلہ سے نیرا کیا واسطہ بنتی؟“

نیتنی پیرنی برہم ہوئی اور تندرے جلال میں آکر بولی: ”اگر میرا واسطہ نہ ہو تو وہ
 چار دن میں مرنے جاتے۔ اس کھرنے تو اسے چھوڑ ہی دیا ہے۔ اب وہ بال بچوں کو کیسے
 پالے! میں خرچ نہ دوں تو اور کون خرچ دے؟ کون ہے اس کا اس دنیا میں؟“
 اس کے جلال میں صداقت تھی، سچ کی آگ تھی۔ وہ پھر بولی: ”لوگ جانتے ہی
 نہیں۔ کھری کھری ہوتی ہے اور عورت بھی!“

نصرو کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ جمیلہ کو مرنے نہ چاہئے۔ اسے بھی اس دنیا میں زندگی
 رہنے اور بال بچوں کو پالنے کا حق حاصل ہے اور یہ کارِ خیر نیتنی پیرنی کے ذریعے ہو تو
 کیا مضائقہ ہے؟
 رات سوہگ میں گزری۔

کلی بھوئی، صبح کھلی، زمیں جھلگائی۔ ایک دنیا بیدار ہوئی لیکن شکیبہ نیک سنگھ
 کے جھنگلی چرسے ہوش میں نہ آئے۔ دراصل انہیں رات بھر سونے جا گئے کاہور
 پڑتا رہتا۔ فجر کے وقت ذرا اٹھیں ہو جاتے۔ نیتنی پیرنی بھی کمرے میں بے سُدھ پڑی
 تھی۔ بال بھرے ہوئے تھے پکھونے کے سلوٹ وہ ساری کروٹیں گنوا رہے تھے
 جو رات بھر بدن نے لیں۔ خاکدان میں سگریٹوں کے بچھے ہوئے ٹکڑے پڑے
 تھے۔ گلاس میں ننھوڑی سی شراب رہ گئی تھی۔ چاقنی جوئی پلنگ تلے دھری تھی

اور جوتی والا باہر کیے میں پڑتے ڈسٹر بیل رہا تھا۔ اس نے خیرے جھرنی والے کو بھگت کیا تھا اور پھر کیوں نہ بھگت کرتا؟ وہ خیرے جھرنی والے کی طرح عورتوں کی کمائی تو نہ کھاتا تھا۔ وہ تو عورت کا یار تھا۔

موتی شاہ کمرے میں داخل ہوا تو پہلے اس کی نظر نیتی پرینی کے بدوہ پڑی جو منہ سکرٹ پہننے والیوں کو مات کر رہا تھا۔ پھر اس کی نظر شراب والے گلاس پر پڑی۔ اس نے دو گھونٹ میں گلاس کی شراب تمام کی پھر کمرے کے ماحول کا جائزہ لیا۔ چکیلی بھڑکیلی چاشنی جوتی نیک سائیں کا منہ چڑا رہی تھی جو اس وقت یہاں نہ تھا لیکن موتی شاہ تو چاشنی جوتی سے بھی زیادہ نشوونشا کی خبر لایا تھا۔ اس نے نیتی پرینی کے شانے ہلائے اور کہا، بی بی!

بی بی نے ”وے دفع ہو“ کہا اور دوبارہ غنبد میں کھوجانا چاہا لیکن موتی شاہ کے پاس اس کی غنبد سے کہیں زیادہ توجہ طلب خبر تھی۔ اس نے پھر شاہ جھنجھوڑا اور چلا کر کہا، نیک سائیں پکڑا گیا ہے بی بی!

موتی شاہ نے توشا نہ ہی جھنجھوڑا تھا۔ خبر نے اس کا دماغ جھنجھوڑ دیا۔ جوش میں آئی تو موتی شاہ پھر بولا، نیک سائیں! نیک سائیں پکڑا گیا ہے۔

”نیک سائیں پکڑا گیا ہے؟ کیسے، کہاں؟“

”ہمک کے پل پر ہی دھریا گیا چرس اور افیون سے بدوہ بھری ہوئی تھی۔“

”تو کونسا تھا خزانہ تھا۔ اتنا سیانا تھا۔ بوری پھینک دیتا دریا میں ڈگا۔“

وے دیتا، معافی مانگ لیتا۔

”بی بی! قسمت اٹ جائے، بھاگ کھوڑا ہو جائے تو بڑے سے بڑا کانا۔“

بڑے سے بڑا خزانہ، بڑے سے بڑا سیانا موندہ کے بل آگیا ہے۔
 نیکی پیرنی کے ہاتھ میں سگریٹ سلگتا رہا۔ انگلیاں جلنے لگیں تو اس نے
 سگریٹ پھینکا۔

”بی بی! وہ کہتا تھا اب کے آٹا مال ہاتھ لگے گا کہ تیرے لئے کوٹھی بنوا دے گی۔
 بی بی اور بھی غلگلیں جو گئی، کوٹھی کا نام سنتے ہی اُسے نیک سائیں کا خم لگ گیا۔
 ”کہتا اچھا تھا وہ، کتنا خیال تھا اسے میرا!“

موتی شاہ نے یہ جملہ سنا اور اپنی آنکھوں کے سامنے پچانسی جونی کو چمکتے
 بھی دیکھا۔ اس نے زیر لب کہا، ”رندھی“ اور رندھی تک یہ حرف شیریں نہ پہنچا
 وہ دلدوز انداز میں بولی، ”پھر اب کیا ہو گا؟“
 ”مقدمہ چلے گا۔“

”اس کے لئے تو پیسہ چاہئے۔“

”ہاں، پیسہ چاہئے، پیروی یونہی تو نہ ہو گی۔“

وہ سر کچڑ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑا بہت پیسہ اس کے پاس تھا لیکن مقدمے
 میں تو پیسہ پانی کی طرح بہانا پڑے گا۔ نیک سائیں ایسا وار داتیا روز روز تو
 پیدا نہیں ہوتا۔ لاکھوں میں ایک ہوتا ہے مائی کا لال۔ اس نے نیکی پیرنی کے
 سارے حق حقوق پورے کئے اور اب گریبا نہیں ادا کرنے کا وقت آگیا تھا لیکن
 پیسہ چاہئے تھا۔ مقدمے کے لئے، اس کے لئے، جیل اور جیل کے بچوں کے
 لئے، انصاف کے سکوتر کے لئے اور پیسہ دینے والا اندر تھا۔ دوسہاروں میں سے
 ایک سہارا تو تھا تو وہ مضطرب ہوئی اس کا دل بھج گیا۔ بیٹیس دانتوں میں سے

نکلنے والی ہریات پوری کرنے والے کو وہ کیسے بھول جاتی؟ اس نے تو عقل و ہنر کی بدولت تکیے کو اول درجے کا کاروباری مرکز بنا دیا اور اس کا نظم و نسق نہایت خوش اسلوبی سے چلایا۔ کس و صوم سے قوالی کی محفلیں جیتیں۔ کس باقاعدگی سے جوا ہوتا، بھنگ گھٹتی، چرس پی جاتی اور اندر خانے ہر قسم کی نشہ آور چیزیں پرچون اور تھوک کے بھادڑیک جانتیں۔

دن بھر وہ مقدمے کا، اپنا، جیلہ کا، جیلہ کے بچوں کا، نصرہ کے سکوتر کا خیال کرتی رہی۔ اس نے سگرٹ پر سگرٹ پھونکے، کمرے میں دھواں بھر گیا۔ اسے بیٹی کا خیال آیا لیکن اب وہاں کیا دھڑکتا تھا؟ وہاں تو دل ڈوب رہے تھے، امیدیں بھٹک رہی تھیں، بیٹی ابڑ رہی تھی، بیٹی اب کسی کی اس پوری نہ کر سکتی تھی۔ نصرہ آیا تو وہ ٹمکنی باندھے چست سے آویزاں فافوس دیکھ رہی تھی جس میں نئے نئے رنگ برنگی لٹھے گندھے تھے جلتے تو روشنی کے پھول کھل جاتے۔ کیسے کیسے پھول کھلائے تھے۔ پھول سائیں نے! پھر جب بیوی میں جلتیں تو رات میں دن طلوع ہو جاتا۔

نیتھی سیرنی کو محویت کے عالم میں دیکھ کر نصرہ دروازے پر ہی رُک گیا۔ او! جب دیر تک اس کی توجہ اپنی جانب نہ کیجئے سکا تو کھانا نیتھی پیرنی نے پیچھا کر کے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر پہلے ہی فطریہ نظریں لے آئی۔

”بیٹھ جانا نصرہ!“

اس آواز میں گرجوخی کی بجائے دردمندی تھی، دھیما پن تھا۔ نصرہ بیٹھ گیا اور بولا۔ ”مجھے آج کیا ہو گیا ہے، بی بی؟“

”نیک سائیں پکڑا گیا ہے۔“

”اچھا۔“

”ہاں۔“

پھر ہوں کہہ کر چپ ہو گیا۔ دل میں خوش تھا کہ اب نیک سائیں کی جبت اسی کی جو رہے گی لیکن آج جنت افسردہ تھی۔ اس نے دلجوئی کے لئے کہا بُرا ہوا بی بی! پر تو غم نہ کر۔“

”کوئی اپنے آپ بھی غم کرتا ہے؟ غم تو آپ ہی اندر سے پھوٹ پڑتا ہے۔“

”چل دنیا کی سیر کرائیں جی ہلکا ہو جائے گا۔“

”نہیں اڑیا! آج سیر کو جی نہیں چاہتا۔“

”جیسے تیری مرضی۔“

نصرد چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ بولی ”نصرو! تو تاکہ گھوڑا خریدے!“

”کیوں سکوتر نہیں لینا؟“

جس کے بھرد سے پرسکوتر لینا تھا وہ تو اندر ہو گیا۔ میرا تو خرچ ہی اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کے سوا، وہ سراپورا نہیں کر سکتا۔“

”دھتور ابست خرچ تو میں بھی چلا دوں گا لیکن گھوڑے مانگے کا قرض بھی تو اٹانا ہو گا۔“

”مجھ سے یہ خرچ پورا نہیں ہو سکتا، بلی! مخمری کیسل کے سگرٹ پیتی ہوں کہیں ویسی نہیں بی۔ یہ خرچ تو دھڑوری کرنا تھا۔“

”ہوں۔“

رات بھر تدبیریں سوچتی رہی۔ تکیے کا کاروبار بڑا مشکل تھا۔ پولیس کی زد سے بچنا، جواریوں سے نمٹنا، چرس کا اسٹاک چھپا کر رکھنا، اثر و رسوخ سے کام لینا آسان نہ تھا۔ لمے دسے کے موتی شاہ اور مولانا گروہ گئے تھے۔ نیک سائیں کے جانشین لیکن تکیے کا نظام سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ وقت آن پڑا تھا اور اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔

نصرو نے گھوڑا مانگ لے لیا۔ چاہا نے مشکلی دسے دی۔ مشکلی بھی ایسی جیسے پری۔ پورے اڈے پر سب سے الگ نظر آتی اور دوڑنے میں بھلی تھی۔ ہنسناتی تو گردن تھن باتی اور لانی لانی ایال ہوا میں لہراتی۔ پھر تانگہ؟ وہ تو قوس قزح تھا۔ ساتوں رنگ اس پر اتار دیئے تھے کاریگر نے۔ نہایت فصاحت پسند اور شوقین مزاج اس پر بیٹھے۔ معمولی گاڑی سے تو نصرو سیدھے سونہرے بنا نہ کرتا۔ جو بھی آتا سالم تانگہ کرتا۔

ایک دن مینہ پڑا اور آسمان پر قوس قزح نکھری۔ رنگوں کی موجیں اس میں آکر ٹھہر گئیں۔ ایک گوشے میں چاند ترازو ہو گیا تھا۔ بادلوں کے جزیرے جگہ جگہ ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ مینہ پڑا تو ہوا میں خشکی آگئی۔ نصرو کے عین سامنے قوس قزح کا پل کھڑا تھا۔ طبیعت چھلی! جی میں آئی چل کر بی بی کو لائے اور قوس قزح پر نکل آئے۔ پان سات روپے کم کمائے تو کیا ہوا؟ ابھی خیال کی گروہ شغلی نہیں تھی۔ اور وہ باگیں تمام کر مشکلی کو اسٹارٹ کرنے ہی کو تھا کہ پیچھے سے ایک لڑکے کی آواز آئی۔ ”تانگہ! یہ آواز بُو بی کی تھی۔ اور کسی کی آواز ہوتی تو وہ کان بھی نہ دھرتی۔ لیکن بُو بی کی آواز ہر کیسے سُنی ان سُنی کرتا؟ اس نے اظہر لگائی۔ وہ اور تلگے آواز

کے کندھے پر لپکے۔ نصرہ کی مشکلی نراٹے بھر کمر آئی اور اگلی ٹانگوں پر ناپچنے لگی۔ بھو اور بوٹی کے ٹانگے بھی بلا کے خوبصورت تھے۔ ان کے گھوڑے بھی بڑے بانکے تھے لیکن نصرہ کی مشکلی کے چمکتے ہوئے ریشمی پنڈے کی شان ہی اور تھی۔ شاہی دروازے کے باہر والے دروازے پر جگمگاتے جھللاتے ہوئے یمن ٹانگے اکھڑے ہوئے جن کے جانور بڑے میل تھے۔ سواری بڑے خرنے سے برآمد ہوئی۔ بوبی کے ہمراہ کبوتری رنگ کے تے برقعے میں ایک عورت اندر بارغ میں سے شاہی دروازے کی جانب آئی۔ چال میں پھرتی تھی۔ برقعہ اوچک رہا تھا۔ اور پٹانگے ایسے ہی چمکتے دکھتے ہوئے برقعوں کے لئے مخصوص تھے انگلیوں میں بڑاؤ انگوتھیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ عورت نے نقاب اٹھائے بغیر بوبی کے کان میں کچھ کہا۔ بوبی اور عورت ٹانگے میں بیٹھ گئے۔ نصرہ نے بوبی کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ جمیلہ کس نیت سے ٹانگے میں بیٹھی ہے۔ جانتا تھا کہ عیسیٰ پیرنی کے پاس اب اتنا روپیہ نہیں کہ جمیلہ اور جمیلہ کے بچوں کا خرچ بھی پورا کرے۔ اب تو یہ خرچ خود اسی کو پورا کرنا تھا۔

عورت نے دونوں نقاب گرا رکھے تھے لیکن ٹانگے پاؤں کی وہ بار بار مسلاتن کرتی۔ نصرہ نے جمیلہ کو دیکھا تو نہ تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ نیک سائیں بڑا خوش قسمت ہے۔ اس کا انتخاب ضرور دلاؤ بیڑ ہو گا۔

لاہی لاہی مریض انگلیوں نے اشارہ کیا اور نصرہ نے مشکلی کا رخ اشارے پر پھیر دیا۔ ہوا میں سناٹا لہرایا، مشکلی بجلی ہو گئی۔ بڑی شرک پر نکل آیا تو مشکلی رکمتی ٹھنسی ہوئی دھنک کے متوازی دوڑ رہی تھی۔ ایک بار مریض انگلیوں نے

اشارہ کیا تو نضر نے پیچھے کو ذرا گردی مڑی اور اس کی نظر پورے ننگے بازو پر پھسل گئی۔ اس کی مضبوط انگلیاں چمک گئیں اور وہ چمکنے چمکیلے، ملائم گداز بازو کو دبانے کے لئے تڑپا۔ اسے اندازہ ہوا کہ معشوق بے نظیر ہے۔ جو ہوسو ہونٹیں پیرنی سے بے وفائی ہوتی ہو تو ہو، وہ کون اس کی بیوی تھی اس سے کا ہے کی وفا کا ہے کی بے وفائی، آج وہ موقع مہتمد سے نہ جانے دے گا۔ اس نے پھر چابک ہوا میں لہرایا، مشکلی اور بھی جھڑکی اور وہ آپ معشوق بے نظیر کے حسن کے خط و خال مرتب کر کے پھر کی اٹھا۔ رگ دپے میں حرارت دوڑ گئی اور لمبو میں مستی کو ندنے لگی۔ اس نے بالو کا نغمہ چھیڑا۔

ہتھ جوڑا اسے پکیاں دیا
 مائے ساڈا ماہی لگدا

مائے چائن اکسیاں دا

بوی پیک کرا اگلی سیٹ پر جا بیٹھا اور گاہے گاہے دو انگلیاں ہونٹوں میں رکھ کر زور سے سیٹیاں بجانے لگا۔ مشکلی بار بار جھڑکتی۔ نضر بھی سیٹیاں بجانے لگا اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔ مشکلی اب بڑے ہوٹل کی سمت جا رہی تھی اور نضر کے چہرے نے کہہ رکھا تھا، بڑے ہوٹل کی سواریاں لینا۔ مومنہ مانگا گرایہ ملے گا اور قرض جھٹ پٹ اترے گا۔ لیکن نضر تو سودو دریاں کی منزل ملے کر کے عقل و خود سے دُور جنونِ سنہنی کے سرب میں آگیا تھا جہاں آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔

بچھل شہست پر عورت بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی اس کی زلفیں ہوا میں لہراتی تھیں۔ جنہیں وہ مرضع انگلیوں سے سیٹ لیتی۔ اس پر ایک کار کی روشنی پڑی اور

اس نے نقاب اُلٹ لئے۔ کار کی رفتار سُست پڑ گئی۔ وہ مسکرائی۔ روشن کار اور روشن چہرے میں سمجھوتہ ہو گیا کار رُک گئی۔ مرصع انگلیوں نے اشارہ کیا، مشکلی رُک گئی۔ انگلیوں نے بوبی کے چٹکی بھری۔ بوبی اور مرصع انگلیاں نیچے اتر گئیں۔ نصر نے جنونِ دستی کے مراب سے پٹنے کی کوشش کی لیکن اسے دیر ہو گئی۔ اور عورت کار میں جبا بیٹھی۔ بے نقاب عورت نے کار والے کو دس کا نوٹ نکالنے کو کہا۔ سوسو کے نوٹوں میں پانچ پانچ کے دو نوٹ تھے عورت نے نوٹ لے کر بوبی کو دیئے اور نصر کو کہتھا اُٹنے کو کہا۔ اب نصر و جنونِ دستی کے مراب سے پلٹ آیا تھا۔ عورت کا جانا پہچانا ہوا تاب دار چہرہ اس پر بجلی بن کر گر گیا۔ بوبی ہانگے میں ایک نوٹ پھینک کر کار میں آ بیٹھا جو غلطہ دار گزند گئی۔ نصر و کا سارا غصہ اس کے صلق میں سمٹ آیا اور اس نے پوری قوت سے چلا کر کہا: "گشتی"

= اُداق "لاہور

بڑیاں

وہ بڑیاں مے کب بڑیاں بنیں کسی کو یاد نہیں۔ ان کی عمر کا بھی کسی کو اندازہ نہیں۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا وہ لاشوں لاشوں تو نہیں مگر ہاں صحت کی لہجہ تھیں اور پھر برسوں ان میں ذرا سی تبدیلی بھی نہیں آئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ جیسی ہیں سدا ایسی ہی رہیں گی۔ سالہا سال سے وہ کسی نامرخی عمارت کی طرح قائم و دائم تھیں جس کے نہ ہونے کا کبھی کوئی تصور بھی نہیں کرتا۔

آنکھوں دیکھی نہیں کانوں سنی ہے کہ جب اولاد نہ ہونے کے بہانے میاں نے دوسری شادی کی تو یہ ماتھے پر بل نہ لائیں۔ چھوٹی کی ساری اولاد کو یہ پیدائش کے بعد سیٹ لیتیں جیسے قدرت نے تقسیم کار کر رکھی ہو کہ وہ جنیں اور یہ پالیں۔ چھوٹی کے سارے بچے انہیں بڑیاں کہتے اور یوں چست رہتے۔ جیسے گڑ پر چوئیاں۔ ریڈیو پر فلمی گانوں کی فرمائش کی طرح ان کی فرمائشوں

کا کوئی اختتام نہ تھا۔ ہاتھوں کا میل اتارنے کے انداز میں روٹیاں مل مل کر
ملید و بنا تیں اور خوب شکر گھی ڈال کر ان کو ٹھونس تیں۔ میدہ بھون کر اس میں
آم اور چھنی ملا کر گڑسا پکاتا بچے بھاگ بھاگ کر کام کرتے۔ اسی مہر پر ہیں
چھوٹی کو خیر جو حاتی وہ آن کر بڑھرائیں۔

”اے بڑی کیا ہو گیا ہے تمہیں، بیٹے کا گھئی دو دن میں لڑھا دو گی اے وا:
روز حلوے روز پر اسٹے“

بڑی تھپھنا کر کہتیں: ”اے رہنے دو تمہیں گھی بچوں سے پیارا ہو گا مولا، کون
سے حلوے کچے ہیں، ایک ذرا لپٹا بنا کر دے دیا تو قیامت آگئی، جادو تمہارا یہاں کیا
کام ہے۔ اپنے سیاں کے کولنے سے لگ کر بیٹھو میں جانوں میرے بچے۔“ یہ سب بول
ہونا جیسے رو بہنوں میں لاگ لپیٹ ہو رہی ہو میاں اجاتے تو کہتے: ”ہاں ہاں بچے
ہیں کھانے وہ بڑی ہیں بھی چکھانا“

”اے خاک! یہ موا حلوہ ہے؟ نہ خشک میوا، نہ کیوڑ نہ الا پچی، یونہی بچوں
کو ہلانے کو بنا دیا ہے تمہارے حلق سے کہاں اترے گا؟“

میاں چستے، چھوٹی بڑ بڑاتی چلا جاتیں اور بڑیاں غرے بچوں کو بٹا کر دیتیں۔
”لے چو تو اور لے لے“ ایسے ٹیکن تو بھی چکھ“ بچوں کے دو دسرے الگ رہ کر چھوٹی
کو کٹن سکون تھا اور چھوٹی سے بچوں کو چھین کر اپنا لینے میں بڑی کے جذبہ رقابت کو
کتنی تسکین ملتی تھی یہ تو وہ جانیں یا اُن کا خدا گم یہ ضرور ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ
مطمن تھیں۔ رات کو کبھی بڑیاں اٹھتیں اور میاں کے شہباز کا دروازہ بند کھین
دل پر گھونس سا پڑتا مگر جلد ہی وہ جی ہلانے کو بچوں میں گم ہو جاتیں۔ کبھی کبھی سیاں

جگنو بنے اُن کی اندھیری کوٹھری کو جگنو نے بھی آتے مگر اب انھیں خود ہی سمجھنے سبھانے کا شوق نہیں رہا تھا۔ دل کے نازک شیشے پر بال توڑ پڑھی چکا تھا۔ اُدھر ہٹاؤ۔۔۔ یہ کیا بڑھبھس ہے دائیں بائیں بچے سو رہے ہیں وہ عذر پیش کرتیں۔

خدا ایک دُور بند کرتا ہے تو مشرود کھول دیتا ہے۔ بڑیاں پر محبت کا ایک دُور بند ہوا تھا تو واقعی مشرود کھل گئے تھے جس کو دیکھو مارے محبت اور ضرورت کے بھیا جارہا ہے۔ خاندان میں کوئی شادی بڑیاں کے انتظام کے بغیر نہیں ہوئی۔ کتنی ہی شادیاں بڑیاں کی بیماریوں کی وجہ سے ٹل گئی تھیں۔ نہ بھیا بڑیاں ہمارے خاندان کی بزرگ ہیں ان کی حرکت کے بغیر یہ شادی نہ ہو گی۔ وہ چھلنے پھرنے نہیں تو تاریخ مقرر ہو گئی۔ شادیوں میں وہ کئی کئی بدل ادا کرتیں۔ شادی کا حساب کتاب کھانے کا انتظام اور پل پل پر ضرورت پڑنے والی ہر چیز کا خیال۔ اسے غلام نے بھرا ہمارے ہو تو دلہن کی کتھ کے لئے دوسری مرنی اور ایک کتھ لیتے آنا۔ یہ چیزیں دلوں کے گھر کی ہو رہی ہیں۔ موقع پڑتا تو جاکر سودھیا نے سے بھی بھر دیتیں۔ اسے سہل دلوں کے ہاں یہ رواج ہو گا۔ ہمارے یہاں یہ دستور نہیں۔ غرضیکہ بڑیاں کیا انھیں اچھی خاصی امرت و صارا تھیں کہ سر میں درد ہو تو ماتھے پر شوق لو پیٹ میں درد ہو تو پانی میں ڈال کر پی لو، اگر ٹھنکیاں ہوں تو چھنی میں دو قطرے ڈال کر چٹاؤ۔

دیور کے ہاں بھایا ہونے لگتا تو وہ دیلیز کی مٹی لے ڈالتے، بھابی کے بھائے وہ بھی بڑیاں ہی کہتے۔ ارے چلو بڑیاں تمہاری دلیں تمہیں بہت یاد کر رہی ہے۔ کچھ دن تو وہ ٹالینیں پھر آخر ارے موت کے اپنی پٹلی میں اٹرم مشرم باہر نکلتی۔ اور دو چار چھوٹی منجھلی لونڈیاں چھوٹی کی ناں ناں کر کے ان کے ساتھ ہول دیتیں۔

”اے جانے دو تم سے باقی ہی نہ سنبھلیں گے۔ وہ چھوٹی کیچڑ پڑیں کاہلی اور ملا
تذکرہ کرتیں۔ بات ٹھیک تھی۔ یہ تو وہاں جا کر نواز سیدہ کے پوتے کے کھونے باز رہے
اور اٹھواریسے سٹھواریسے میں لگ جاتیں یہاں باقی بچے چھوٹی اماں کو ناک چنے
چھوادیے۔ بچے جن جن کر کچھ ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ یہ جان لیوا کام اب ان کے
باتیں ہاتھ کا کھیل ہو گیا تھا مگر بڑی کے جانے کے بعد ان کی جانوں کو سمیٹنا
اور ان کی جٹوں کو پورا کرنا ان کے بس کا نہیں تھا۔ ان کو گئے دو چار روپیہ ہوتے
کہ یہ ہاتھ پر چھوڑ بیٹھتیں مشکل سے کچھ اردو صبر کرتیں پھر ڈولی لے کر پہنچ جاتیں
”اے ہے تم تو آکر بیٹھ رہیں کچھ گھر کی بھی خبر ہے، بچوں نے میل ناک میں دم کر
دیا ہے“

”لو اور سنو! ابھی کچی کو چھوڑ کر کیسے آجھاؤں جمعہ بعد آئندہ ان کو ہونے ہیں
مجھے آئے“

”میں کیا جانوں، منجھلے کو کالی کھانسی ہو گئی ہے۔ کھانسی کھانسی کرم دے
وے ہے“

”اے ہے یہ کیا ہوا، میں تو اچھا بھلا چھوڑ کے آئی تھی، خستہ کے پتے
اور شہد چٹایا؟“

”سب کچھ کر لیا“ چھوٹی یوں کہنتیں جیسے اب دواؤں سے گزر کے دوا
کی کسر رہ گئی ہو۔

”لو تو سنبھالو اپنا بٹوہ میں چلی جانے میرے بچے کو کیا کروا۔“ اب لاکھ
کوئی روکے وہ نہ رکیں گی، گھر اکدم لیں گی اور منجھلے کی پتی سے پتی لگا کر رات

بھر جائیں گی، معمول میں آلا بلا بھون کر اسے دیں گی اور چھوٹی یوں الگ ہو جائیں گی جیسے کسی کو مانت لوٹا کر پخت ہو گئی ہوں۔

بھائیوں کے گھر کوئی بیمار ہو، بچہ ہونے والا ہو یا کسی بچے کی روزہ کشائی ہو کوئی نہ کوئی بڑیاں کو لینے آپہنچتے۔ وہ تھوڑا بہت عذر کرتیں پھر اصرار کے آگے ہتھیار ڈال دیتیں۔ بھائیوں کی ضرورت پر مٹی کا جانا بھی ضرور اور چھوٹی کا یہ کہنا بھی ہے: اب جا کر بیٹھ نہ رہنا، جلدی آجانا، تمہارے پیچھے یہ بچے مجھے کھاجائی گئے، تمہارے لاڈلے رو کوڑی کا کر دیا ہے انہیں؟ ہاں ماں میں نے تو سب کو بٹا رہا ہے، چلو تم اچھی ہر کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتیں۔“ اور یہ کہ تمہارے کوئی بچہ بیمار ہو، جوٹ لگ جائے یا چل جائے روتا بھینکتا سیدھا بڑیاں کے پاس آتا چھوٹی مارے مامسا کے درمیان میں کہتی رہ جاتیں۔ اسے ہے کیا ہوا، ادھر؟ میں دیکھوں، بچہ پلٹ کے دیکھے بغیر سیدھا اس اندھیری کو کٹھری میں پہنچتا جو بڑیاں کا ٹھکانہ تھا۔

گرمیوں کی روز چروس میں سارا زمانہ سو جاتا، ستوں تو بڑیاں اور ان کے چیلے چانٹے۔ وہ بیٹھی چھوٹی چھوٹی کتروں سے بٹوے بستی رہتیں اور بچے لڑتے رہتے۔ یہ میرا ہے۔“

”واہ تمہارا کہاں سے آیا، اُس دی بھی تم نے لے لیا تھا، یہ میرا ہے، بڑیاں؟ وہ بڑیاں کو میکوٹ میں ملاتا۔

”اسے ہے بننے تو دو، پہلے ہی اسے ہا کے ڈال دی، لے بڑو جاکر کھڑا ہوا، بننے، بٹوے اور تلے دانیوں بتیں اور بتیں۔ قرآن شریف کے ٹکڑے غلام کوٹے

لپکے لپک کر تیار ہو گئے۔ اس سے دل اکتاتا یا بچے فرمائش کر بیٹھے تو جلتی دودھ پہلا
میر جو لے کے پاس جا بیٹھتیں اور ہنڈ کلیاں شروع ہو جاتیں۔

ایک دیور جانے کہاں کالے کوسوں رہتے تھے، بیوی کے بچے ہونے لگا تو
انہوں نے بڑیاں کو بجا بھیجا۔ چھوٹا سا نقبہ جہاں کوس بھر پر کوئی بڑھی ٹھڈی
دائی رہتی تھی، اسی کا سہارا تھا جو فی شدنی عین وقت پر برابر کے گاتوں میں سیت
ہو گئی وہ چٹم سے میر چلی گئی۔ ایسے وقت خدا نے بڑیاں کو موت دی کہ انہوں نے
باورچی خانے کی گھٹل چھری سے نال کوٹا، گرم پانی کر کے بچے کو نہلایا، اور جیسے
تیسے زچہ کو سنبھال لیا۔ دائی اپنا حق چھینے جا سفر بردل ہی دل میں عرصے تک چپا
کھاتی رہی۔ انہی کے ہاتھوں ایک اور بچی نے ریلوے ٹرین میں جنم لیا یہ وہ نانا تھا
جب بچے خدا کی دیں ہوا کرتے تھے۔ ہر سال نہیں تو دوسرے سال ہر گھر میں ایک نئی
دور کا آنا گویا فرض تھا، اسی لئے ہر گھر میں بڑیاں کا پھیرا لگتا ہی رہتا۔ سیکڑوں
بچے دائی اور نرس کے ہاتھ سے سیدھے بڑیاں کے ہاتھوں میں آتے تھے۔ ان
کے ہاتھ سے گھٹی پینے والے بچوں کی گھٹی ہی نہ تھی اور تو اور خدا ان کی دوا ایک بڑھی
عمورتوں کو قبر میں پہنچانے سے پہلے غسل دینے کا کام بھی کر چکی تھیں۔ غرض کوئی ایسا
نام نہ تھا جسے کوئی عورت کر سکے اور بڑیاں نہ کر سکیں۔ احسان ماننے والے جس
طرح داسے ورے بن پڑتا ان کا احسان امارت کی کوشش بھی کرتے۔ چلتے وقت
کسی نے نیا ریشمی بوڑا بنا دیا۔ کسی نے نئی رضائی دے دی۔ اس طرح ان کو پرانا
ٹرینک ریشمی کپڑوں سے پور ہٹنا پسندی تو کم ہی تھیں۔ مروج میں آتیں تو بھی نئی جھجکیوں
کو بانٹ دیتیں۔

ایسے ہی کسی کام سے گھر سے کوسوں دور تھیں کہ میاں کی بیماری کا آثار پہنچا۔
ہوائی جہاز ان دنوں تھے مگر صرف آسمان پر اڑتے نظر آتے تھے۔ ان میں سفر کرتے کسی
کو نہ سنا تھا۔ لے وے کے ریل گاڑیاں تھیں جو کھڑکڑ کرتی دن رات چلتی تھیں تو زمین
وہ میں لمبے سفر بھی طے جو ہی جاتے۔ بڑیاں گھر پہنچیں تو میاں کو زمین کے نیچے سوتے
بھی دیکھ چکی تھی۔ باہر ٹرپنی اندر سے مرد پچھے پچھے میں مصروف تھے، اندر پتوں
سے سروٹھا کے محل میں ہل ہل کر قرآن شریف پڑھ رہا تھیں۔ خود تو عمر سے یہ لوگ
کی طرح رہتے تھیں مگر سوکھی کا سفید روپٹہ اور سر کٹے سے ہاتھ دیکھ دیکھ کر دل
پر گھونسا پڑا اور وہیں دلیلیں بگڑیں۔ پھر سب ہوش میں آئیں تو سارا گھر پیلے کی
طرح سنبھال لیا۔ چھوٹی سے وہ پہلے بھی نہیں جلتی تھیں۔ اب تو وہ قابلِ رحم تھی۔
اس کے پاس ایک میاں تھا وہ بھی نہ رہا۔ ان کے بچے ماشاء اللہ سب حیات
تھے۔ پھل پھول رہے تھے۔ جس طرح مالی اپنی پھولتی پھلتی کیاری کو دیکھ کر خوش ہوا
کرتا ہے اسی طرح بڑیاں اپنے پوتوں اور نواسوں کی فوج کو دیکھ کر نہال ہوتیں۔
بچے بھی سب بڑیاں کو برابر یاد رکھتے۔ آخر ان کے گھروں میں بھی مذہبیاریاں
نقد نہیں اور بچے ہوتے تھے۔

بڑیاں پر دوسرا اثر احمد چھوٹی کی موت تھی جس نے ان کی کڑواہٹ دور کی۔ ایک
دہائی تیس ستیس سال کا ساتھ، پھر اس نے خدمت بھی تو نہیں کروائی اس کا
بھی امنیس فیم تھا بس بیٹھے بھٹائے چل کھڑی ہوتی جیسے میاں کے پاس جانے کو
ادھار کھاتے بیٹھی ہو۔ بڑیاں کو یوں لگا جیسے کوئی برسوں سے تنہا ہی رہتی لاشی
ہاتھ سے پھین کر بھاگ گیا ہو۔ اچانک دنیا کیسی خالی خالی لگنے لگی۔ اس زندگی

میں کیا خاک دکھا ہے جس میں میاں اور چوٹی نہ ہو۔ رہے ان کے بچے تو اصل میں یہ تھے تو اسی میل کے بیچ جو اچانک سوکھ گئی تھی۔ چوٹی کسی گھٹاؤنی سی جہدی میں مبتلا ہوئیں، بیماری طول کیسبخت کچھ دل پر میل آتا تو دریاں ہوتی مگر ان کے یوں چل دینے میں تو سوائے احساسِ محرومی کے کچھ نہ تھا۔ بڑیاں اس جھٹ کی طرح جیتھ جیتھیں جس کے نیچے سے اچانک ستون کیسبخت لیا گیا ہو۔ اس بڑی سی حویلی میں جہاں کبھی بند دروازے دل پر دھوکے دیتے تھے گھوٹے پھرنے کا کچھ مزانہ نہ۔ آج بھائیں بھائیں کرتے کھلے دروازے کھانے کو آتے تھے۔ صلہ بنانے میں کوئی سواد نہ تھا۔ جب کسی پر کوئی ٹوکنے والا نہ ہو۔ بچوں کے ساتھ چاؤ پونچھوں میں بھی تو جب ہی ٹکے تھا کہ چوٹی مغالے پر تھی اب تو وہ پانے کے اس رخ کی طرف تھیں جس کے سارے مقابل کھپ گئے ہوں ایسی جیت اور شاہی کس کام کی۔

پھر وہ دور آیا جو اب تک بہت سے دلوں میں ناسد بہن کو پزل رہا ہے جس نے تخت والوں کو تخت الٹنی میں پہنچا یا اور پورے نشیون کو بادشاہی دی۔ ۷۷ء میں سارا کنبدیزہ ریزہ خانہ کے جیتیم چھانڈا بے گھر بے دراس سرزمین میں پہنچا جسے پاکستان کہتے ہیں اور پورے ملک میں جس کو جہاں سرچھپانے کی جگہ ملی بیٹھ گیا۔ اہا افراتفری میں کیا کھو یا کیا یا حساب کتاب کرنے کی بھی کسی کو فرصت نہ تھی نفسی کا ایک دُند تھا، آیا اور چلا گیا مگر وہ بات پھر پیدا نہ ہو سکی، اکثرے دل پھر نہ جے، جے کی کوشش میں لوگوں نے چاہا اپنی جڑیں مضبوط کر لیں کھوٹا ہی ہے تو کیوں نہ ذرا گہرائی تک کھودیں۔ سب ایسی کھودنے اور جھنے کی تک مقد میں پڑ گئے اور کسی نے نہیں دیکھا کہ بڑیاں اس ہڈ سے درخت کی طرح جس کی ایک آدھ ہی جڑ

جم پانی ہو، آہستہ آہستہ سوکھ رہی ہیں۔ اس عادی دادہ گیر میں ان کا پرانا بزرگ
 ٹرنک تو صبح سلامت پہنچ گیا تھا مگر وہ خود آدمی ہی آ پانی تھیں۔ اسی کے صانع
 پر کچھ اثر ہو گیا تھا جس کا احساس ایک دم نہیں دھیرے دھیرے ہوا۔ کام کرنے
 کی وہ بے پناہ دھن اب نہیں رہی تھی کسی نے کہہ دیا تو کر لیا۔ ورنہ بس ٹھلے جاتیں
 جیسے پاؤں میں پتے لگ گئے ہوں یا کسی نے چابی دے کر بھڑو دیا مگر بڑیاں اب
 بس کرو جھک جاؤ گی، لو بے گھر کر رہی سبزی بنا دو، وہ سبزی بنا رہیں اور پھر ٹھلے
 کر دیتیں۔ چلتے چلتے خود ہی بڑ بڑاتی رہیں۔ کوئی غور سے سننا تو بڑ بڑاہٹ کا
 موضوع کوئی ایسی بات ہوتی جو انھیں بڑی لگی ہو چاہے وہ آج ہوئی ہو یا
 مہینوں برسوں پہلے۔

”بڑیاں کس سے باتیں کر رہی ہو؟ کوئی پوچھتا تو وہ بڑبڑاتیں۔“

”اے واہ کس سے باتیں کر رہی ہوں؟ خواہ مخواہ مجھے تنگ مت کیا کرو۔
 اور ٹھلے جاتیں۔ اسی دھیرے انھیں بھوک بہت لگتی۔ ہر وقت باورچی خانہ چلتی
 اب و آقا کام بھی نہیں کرتی تھیں کہ گھر کے بچوں سے بڑھ کر انھیں کھلایا جائے
 ”اے ہے بڑیاں تم نے تو بچوں کو بھی مات کیا ہے، ہم نے تو تم سے بھی
 پہلے ناشتہ کیا ہے۔“

”بھوک لگی ہے۔ وہ حاجت سے کہتیں۔ پھر جو کچھ بھی روٹی، باسی سالن
 اور پڑا پڑا دودھ نظر آتا ہی ڈالتیں۔ کھپ پی کر وہ پھر ٹھلنا اور بڑ بڑانا شروع کرتیں
 ۔ پھل قندی اتنی بڑھی کہ کروں اور دالان کا چکر لگا لگا کر انھوں نے گھر
 والوں کو گھسن چکر بنادیا۔ ہر وقت کی بھوک نے گھر والوں کو کھلایا اور بڑبڑاہٹ کا

یہ عالم ہوا کہ وہ چلتی ہوا سے لڑنے لگیں۔ پڑیاں بڑیاں تو بھنبھلاتیں، اسے راہ جا اپنا کا
 کر، کیوں دماغ چاٹ رہی ہے مارچوں چوں چوں چوں، اور کوئی کام نہیں ہے تجھے
 مرنی کڑکڑاتی تو پھٹکتی ہیں، ہاں ہاں، حکیم صاحبہ سن لیا انڈا دیا ہے تم نے، بس اب
 زیادہ مت، انراؤ، سارے زمانے کی مرغیاں انڈے سے دیتی ہیں ایک ختم ہی نرانی
 نہیں، جو بچے کسی لیتے تو تماشہ بنا لیتے، وہ اور بھنبھلاتیں، بچوں کو سنائیں تو وہ
 اور چھڑتے، غرض گھر میں یہ جنگ کمرہ چھڑی عورتوں کو بد مزہ کر دیتا وہ بچوں کو
 مارنے کی دھمکی کے ساتھ بڑیاں کو بھی باتیں سنائیں کہ خواہ خواہ بچوں میں بچی
 بن رہی ہیں۔ فوراً مشورہ بچوں کی طرح انہیں کسی کام میں بھنسا دیا جاتا جیسے وہ
 آٹا سیدھا کر کے پھر محاذ پر آن بیٹھتیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اپنی جن دلی خواہشات
 کو وہ ایک زمانے میں کام کر کر کے بھولی تھیں اب انھوں نے دوسری آواز
 راہیں ڈھونڈ لی تھیں۔ کام میں اب ان کا دل نہ لگتا تھا معلوم ہوتا تھا جیسے
 رستیاں نڈا رہی ہوں۔ آٹا جیسے وہ کسی زمانے میں بڑے پیار سے سچ سچ گنٹوں
 کلیاں مار کر گوندھا کرتی تھیں اب منٹوں میں گول کر رکھ آتیں۔ روٹیاں پکاتیں
 تو کبھی جلی کبھی کچھ، ہانڈی بھونتی تو چراندہ رہ جاتی۔ برتن دھوئیں تو مار چکے اور
 چکے کہ ایک ایک برتن دوبارہ دھونا پڑتا۔ گھر کی عورتیں بہتیرا جتا جتا اور
 سنات کر کہتیں مگر ایک کان سے سن کر دوسرے سے صف آڑا دیتیں۔

اب لوگوں کا معیار زندگی بھی اُنچا ہو رہا تھا۔ چھوٹے سے گھر میں چاہے
 گھر والوں کے بیٹھنے کی جگہ نہ ہو مگر مہمانوں کے لئے سنتے سے صوفے خرید
 ہوں۔ رات کو بچے ایک پلنگہ پر چارپاؤ نہیں مگر نیا م گھر سے خریدی کئی کھانے

کی میز اور کرسیوں کو جگہ ضرور ملے۔ بچے بھی اب گھروں کی بجائے اسپتال میں پیدا ہونے لگے تھے۔ شاہیوں میں اب ایسے "ایٹ ہوم" ہونے لگے تھے جس میں بڑی امتانوں کی ضرورت ذرا کم ہی پڑتی ہے۔ ایک تو چیز کی مانگ پہلے ہی کم ہو اور پھر اس کی کوالٹی بھی خراب ہو جائے تو اس کو کون دھارے گا۔ بڑیاں بھی بقول ایک انگریزی دانی پوتے کے اب "نیوسنس" ہو گئی تھیں۔ اچھے کھاتے چنے گھڑاؤ میں تو قطعاً ان کا ٹھکانہ نہ تھا ہاں پرانے دھرانے گھروں میں ٹوٹی چارپائی کی طرح کونے میں پڑی رہتیں مگر چند دن گزرتے تو کسی نہ کسی بہانے سے ان کی بلٹی دوسرے گھر روانہ کر دی جاتی۔ جہاں گھر میں کوئی بیماریا ہو یا صحت آنے تو سب سے پہلا کام یہ ہونا کہ بڑیاں کو رکشہ میں بٹھا کر کسی دوسرے نواسے یا پوتے کے ہاں چلتا کیا جاتا وہاں دو ایک دن ان کی آؤ بھگت ہوتی پھر بدی اخبار کی طرح ادھر ادھر لڑتی پھرتیں۔ ان کی بھوک اور بڑبڑاہٹیں جب زیادہ پریشان کرتیں تو کوئی بہانہ ڈھونڈ کر انھیں تیسرے گھر بھیج دیا جاتا۔ گھر کی لڑکیاں کسی دیکھی طرح ان کے ٹرنک کے کپڑے اڑانے کی فکر میں رہتیں۔ ان کی قسمت سے تنگ بچائے کی ہمت لوٹ رہی تھی اور پرانے زمانے کی سسی ساٹن اور شٹھی میں بند ہو جانے والے دوپٹے اب کہاں ملتے تھے۔ محبت کی بھوک بڑیاں کے جب لڑکیاں کسی لگاتیں تو وہ خوش ہو کر فوراً جوڑے کے جوڑے ان کی نذر کر دیتیں۔

اب بڑیاں بڑے بڑے خیر ہوتا اس کا حساب ذہنوں میں محفوظ رکھا جاتا تاکہ موقع موقع پر دوسرے رشتہ داروں کو ملایا جاسکے۔ ایک یہ بڑیاں انھیں جن کو ہر گھر میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا اب مانگ برابر کی چھوکیاں کہتی تھیں

کام کی نہ کاج کی سیر بھرانا ج کی : ”جب دیکھو بادری خانے میں کچھ نہ کچھ مٹول رہی ہیں۔ بچے بچے کو پتہ تھا کہ یہ ہماری سگی نانی دادی نہیں ہیں بے اولادی ہیں بے چاری ہم نہ رکھیں گے تو اور کون رکھے گا۔“

”اے ہے یہ رات کا قہم ہے چھپا دے نہیں تو وہ نکل لیں گی :“ ان کے بارے میں ایسی باتیں اب عام ہو گئی تھیں۔ بھوک کی خدّت اور تشکیں کی کمی نے جنون کو ایک اور راسخانی، شعلتی شعلتی آتیں اور ناک ہوا میں دے کر کشتیں ”اے بے سید کی خوشبو آرہی ہے“ بے نا کہاں ہیں مٹی ارے ایک ٹکڑا ہیں بھی دے نا : ”مٹی جسے خود سید سوٹھے برسوں ہو گئے تھے جل کر کستی“ سید نے کچھ اور پاگل ہو گئی ہوڑماں تم تو : ”گمزدہ اس وقت تک سید سید کی رٹا لگاتے رکھیں جب تک انھیں دوسرے کمرے میں امرودیا کیلے کی خوشبو نہ آجائے کسی نے گھر میں جا کر جب انھیں یہ خوشبو آتی تو گھر کا کوئی شریف پتھر یا خسیات کا ادھر بکھرا طالب علم انہیں یہ چیزیں لا دیتا کہ شاید اسی طرح ان کا دل بھر جائے مگر ان باتوں کا الٹا اثر ہوتا پھر تو ان کی ناک راہ ہی دیکھ لیتی : ”کبھی تو دے کی خوشبو چلی آرہی ہے“ کبھی متغی کبھی بریانی : ”اتنا حوصلہ کوئی کہاں سے لانا ہے“ ہی دی سے تو قویں میں شروع ہو جاتی : ”خالی پیٹ کب تک ان مرغین کھانوں کا ذکر اور خوشبو برداشت کرتے : ”کام دام اب وہ نہیں کرتی تھیں : ”اول اس لئے کہ ان کو سمجھائی کم دیتا تھا“ دوسرے لوگوں کے کہنے کے مطابق بادلوں میں جان ڈال لی تھی وراسی دیر میں وال کا ولیہ کر دیتیں : ”کچھ دن بعد ان کے جنون نے ایک اور نگ پکڑا : ”انھیں یہ خیال ہو گیا کہ لوگ انھیں چھوڑ کر سبھاگ

جائیں گے۔ سارا دن گھبرا گھبرا کر کہتیں: ”ارے کہاں جا رہے ہو! مجھے بھی ساتھ لے چلو؟“

ہر نئی بات کچھ دن تو مذاق رہتی پھر جی کا جھلا پان جاتی۔ اچھا بھلا ایک آدمی گھر میں بیٹھا ہے دوسرا اس کے سر ہو رہا ہے کہ بول تو کہاں جا رہا ہے! تو وہ آپ ہی مر کھنا بیل بن جائے گا۔ بوں بوں ان کی آنکھیں کمرود ہو رہی تھیں تو ان توں یہ دم بڑھتا جا رہا تھا۔ ذرا گھر میں خاموشی مونی اور وہ ہرائیں۔ اسے کہاں چلے گئے سب! مجھے چھوڑ گئے، ہائے میں اکیلی رہ گئی، کیا کریں، کہاں چلے گئے سب؟“

”مر گئے۔“ جل کر کوئی کہتا تو وہ کھل اٹھتیں: ”ہو! ارے میں سمجھی سب چلے گئے۔“

یہ مرض بڑھا تو وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر میاں بیویوں کے پلنگ ٹھونسنے لگیں۔ سوتے میں چونک کر کوئی چلا اٹھتا، کون؟ تو وہ بڑی ہی مصومیت سے کہتیں: ”سو رہے ہو؟ میں سمجھی چلے گئے!“

ایک دفعہ کسی شخص کو جبک جبک کر چلتے دیکھ کر کوئی بچہ ڈر کر چیخ اٹھا سارے گھر میں چور چور کا شور مچ گیا۔ محلے والے جاگ اٹھے اور آخر میں نکلا کون بڑھا۔ یہ باتیں برداشت سے باہر ہوئی جا رہی تھیں۔ ہر آئے گئے کو سنائی جاتیں تاکہ ان کے سہارے موقع پاتے ہی انہیں کسی اور گھر روانہ کیا جاتے۔ کہاں تو وہ سالوں رہتی تھیں تو لوگ اور رہنے کا مطالبہ کرتے تھے اور اب جینے میں جاگھر گھوم لگتیں۔ ریشمی کپڑے بٹ بٹا گئے تھے اور ان کی جگہ بے ہوشے کپڑے پھینچا

کو ختم ہو چکے تھے۔ بستر بھی بوسیدہ اور خراب تھا مگر اب ان کو کھانا بھی ملے گا کہ اس منگائی کے زمانے میں ان کے لئے جوڑے اور گھوڑے بھی ہوتے۔ گھر میں تقریب ہوتی تو بڑیاں کو چھپا دیا جاتا یا دوسرے گھر بھیج دیا جاتا۔ ہاں نہیں تو بڑیاں ہی پھریں گی سارے گھر میں اصل ڈراس بات کا تھا کہ کسی نے دیکھ کر پوچھ لیا کہ کون ہیں تو کچھ کہتے بن نہ پڑے گی اپنا گھنا کھو لو آپ ہی لاجوں مرد۔ اب ان کی حالت اس قابل نہ رہی تھی کہ انھیں کسی کے سامنے غریہ پیش کیا جائے اور جان بوجہ کر ہلکی کرانے کا فائدہ!! افیش ایل گھرانے ہاتھ جوڑتے کہ ہمارے ہاں باہر کے لوگوں کا آنا جانا ہے انہیں یہاں نہ بھیجو البتہ کھانے پینے کا خرچ دینے کو تیار ہیں۔ یہ بھی زبانی جمع خرچ تھا کون مانگا تھا اور کون دیتا تھا۔ جس گھر میں پڑ جاتیں آپ ہی روٹی دے دیتے کھانے کا خیمہ لینے کی بدنامی کون سستا۔

دن گزرتے رہے۔ گھر والوں کو پتہ بھی نہ چلتا۔ باہر والا کوئی بہت دن بعد دیکھتا تو کہتا بڑیاں بہت کمزور ہو گئی جوہ بڈیوں سے ہاتھ لگ گیا ہے۔ گھر والے بتاتے کہ کوئی خاص بیماری نہیں ہے بس جو کا ہو گیا ہے اس نے پیٹ سدا خراب رہنا ہے یا پیٹ میں کیڑوں کا بسیرا ہے کہ ہر وقت کھانے کی کشتی ہیں۔ انکھیں بھی اس رفتار سے روشنی کھو رہی تھیں کہ پاس رہنے والوں کو کچھ اندازہ نہیں تھا، یا پھر ان کی حرکتوں نے اس قابل ہی نہ رکھا تھا کہ کوئی ان کے بارے میں سجدگی سے سوچتا اور گھر کے ہزار روٹے جگرے ختمے کہ گھر میں پڑی ہوئی بڑی بی کے پیچھے لوگ خوار ہوتے پھرتے۔ اچھے بھلے آدمی کام کرتے

کرتے تھے چار بے غے۔ ایک صبح کے گھر سے نکلے ہوئے کہیں اندھیرے میں گھر ٹوٹنا نصیب ہوتا۔ کراچی کی زندگی تھی کہ سانس لینے کا موقع نہ دیتی تھی۔ مگر دکانیں، سڑکیں، ہر چیز محسوس تھی۔ جگہ اور وقت کی کمی کی بات کوئی کراچی والوں سے پوچھے، گھر کے سیکڑوں مزدوری کام برسوں ملتے رہتے۔ کوئی جیاد ہوتا تو یہ سوچ کر جان نکلتی کہ کون گھنٹوں جا کر دوا کے لئے قطار میں کھڑا ہو، عطاریاں اور نیم حکیموں کی چاندی چور سی تھی۔ بیماری کے اسپتالوں تک رسائی باڈیوں کے درباروں کی رسائی ہو گئی تھی۔ ایسے میں کون انھیں ہسپتال لے جانے کی صدمہ کا ذمہ لیتا اور لیتا بھی تو کس سے یہ ہفت خواں ہوتا۔

دن یوں ہی گزر جاتے اگر بات اور نہ بڑھتی، مگر کون چیز دنیا میں ہے جو ایک حالت میں ہے جسے تغیر نہیں۔ ہر آدمی ہر شے بہتر یا بدتر صورت میں بدلتی رہتی ہے۔ بڑھتا کی حالت کی بہتری کی کیا امید تھی بس دن بدن بگڑتی رہی تھی۔ جب تک وہ خود چل پھر لیتی تھیں۔ ان کی باتوں کو رو دھو کر برداشت کر لیا جاتا تھا مگر جب فوٹ یہاں تک پہنچی کہ غسل خانے لے جانا ہو تو ہاتھ پکڑ کر لے جاؤ تو بڑی مشکل پیش آتی۔ وہ چلائی رہتیں اور ابھی ذرا تو صبر کر دوں تو پتوں سے بھی گئی گزری ہو گئیں۔ وغیرہ آوازیں ان کے کانوں میں پڑتی رہتیں۔ اگر وہ صبر کرتی رہتیں تو اس صبر کی کوئی میعاد نہ تھی۔ چنانچہ وہ ٹھول کر اتریں اور جس جگہ کو غسل خانہ سمجھ لیتیں وہیں بیٹھ جاتیں۔ بعد میں بڑی ہائے برہمگی۔ کراچی کی بھگتیں ہر وقت ہاتھ نہیں آتیں اور اب تو جب سے گھروں میں فلش عمارت ہو گئے تھے انھیں گندے کام کرتے ہوئے اٹھانے لگی تھیں۔ ایسی حالت

میں جب گھر والوں کو ان کی بے جا حرکتیں سمیٹنا پڑتیں تو ان پر کوسے کاتے نہیں تو کیا پھول برستے۔ اب یہ یا تو ان باتوں سے بالا ہو چکی تھیں یا سُن کر انجان بننے میں عداوت ہو گئی تھی کہ ذرہ بھر پروا نہ کرتیں۔ بس تکیے سے سر کٹائے کر کے اُگے جھکائے، آنکھیں بند کئے، ہونٹ بچوں کی طرح بسورے خنودگی کر جانے کوئی سے عالم میں کھوئی رہنیں۔ دن رات ان کے لئے برابر ہو چکے تھے جس وقت اس ہوشی سے چونکنیں سب سے پہلے کھانا مانگتیں چاہے اس وقت رات کے دو بجے ہوں یا صبح کے چارہ۔ لوگوں نے اب نوٹس لینا چھوڑ دیا تھا کھانا اس وقت دیا جاتا جب کھانے کا وقت ہوتا، بس ان کی موجودگی کا احساس اس وقت ہوتا جب وہ ایسی ایسی حرکت کو بیٹھتیں۔ ان حرکتوں میں اضافہ ہوتا نہیں گھر کے باہر ایک ایسے کمرے میں ڈال دیا گیا جہاں وہ جو بھی چاہے اور جہاں جی چاہے کرتی رہیں۔ دوسری صبح محسوس ناک پر کپڑا باندھ کر کمرہ دھو جاتی۔ اس دھلائی اور خراب ہو جانے والے کپڑوں کے پیسے وہ الگ لیتی۔ بڑھیاں کے کمرے میں سے مرغیوں کے ڈربے ایسی کھرازا آتی ان کو کھانا دینے والا بھی سانس روک کر بمشکل چند منٹ وہاں ٹھہرتا۔

وقت کسی کے لئے رکتا تو نہیں۔ دن اور راتیں زمیں کے گھوڑوں کی طرح بھاگے جاتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے لڑکیوں کے چہرے پر حیا اور لڑکوں کے کٹوں پر بال پھوٹ آتے ہیں۔ شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگتی ہیں، پھر ان کے بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور وہ بھی اسی تیزی سے بڑھنے لگتے ہیں۔ بڑھیاں کے پوتے بھی آل اولاد والے ہو گئے تھے ایک پڑپوتے اور ایک پڑنواسی کی شادی ٹھہر گئی

تھی۔ جیسا کہ آج کل کا دستور ہے۔ بڑی محنت سے بڑے گھرانے چھوڑے گئے تھے۔ شادی کی تیاریاں بڑے زوروں پر تھیں۔ بڑے گھرانوں سے مکر لینے نے سارے گھر کا پیسہ نکال دیا تھا۔ پھر بھی بات بنتی نظر نہ آتی تھی۔ ایسے ہی ایک دن جب گھر میں لیا جھپ جوڑے ٹلکے جبار سے تھے، بڑیاں چھپکے سے چل بسیں صبح کو کوئی ناہشت لے کر گیا تو دیکھا ختم ہو چکی ہیں۔ ان میں تھا ہی کیا ایک سانس چل رہا تھا وہ کسی وقت خاموشی سے یوں بند ہو گیا جیسے کسی نے سویرے آٹ کر دیا ہو۔ فوراً انھیں اٹھا کر گھر میں لایا گیا مگر طرف سٹاٹا سا دھڑکیا۔ کسی طرف سے آہ و بکا کی آواز بلند نہیں ہوئی لڑکیوں نے چپکے چپکے دو چار آفسو بہائے تباہ کی موت پر نہیں بلکہ ان کے ساتھ اپنی زیادتیاں یا نالائقیوں یا دکر کے غلام والوں کو اطلاع دی گئی۔ بڑیاں کا خاندان بڑے درخت کی طرح پھیل کر کہیں کا کہیں جا پہنچا تھا۔ لوگ آنے جاتے تھے، چپ چاپ بیٹھے جاتے تھے ان کے سارے آخری کام بڑے سکون سے ہوئے اور وہ ایسی خاموشی سے وداع کر دی گئیں جیسے کسی بیوہ عورت کی رخصتی ہو۔ اس کے بعد کامر محلہ زیادہ شور مچا۔ ایک شادی میں چار اور دوسری میں پانچ دن تھے۔ دنیا والے کیا کہیں گے کہ قبر میں بڑی بی کا جسم بھی ٹھنڈا نہ ہوا کہ بیٹھے پوتے رنگا رلیاں مندا ہے۔ لاکھ کچھ ہو دیں سے دنیا رکھنی بھاری ہے، شادی کی تاریخیں ٹالنی پڑیں گی۔ مگر شادی کی تاریخیں بدن بھی مشکل تھا۔ کہاں کہاں سے لوگ آئے بیٹھے تھے، ایک بھائی بھائی جانے کو پا بدیر کا ب بیٹھا تھا۔ لڑکی کا دل لٹا چھٹی پڑا یا ہوا تھا۔ پھر جانے کب چھٹی ملے اور لڑکیوں کی شادی میں آج کل دیر داہ فوراً منسوب نہیں، کب دامن میں

آیا ہوا پچی پھر پھرا کر نکل جائے۔ ہاں نہیں تو جن گھروں میں شادیاں تھیں وہ ہرگز انہیں شان نہیں چاہتے تھے صرف کنبہ برادری کا ورثہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جائے۔ روز صبح سے شام تک بحث ہوتی مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچا جاتا۔ رقت آتنا کم تھا کہ مزید بحث کی گنجائش بھی نہ رہی، تاریخ بڑھانی ہے تو فوراً بڑھادو کھانے والوں کو بڑ رقت اطلاع تو دی جا سکے مگر بڑیاں کے ایک مسجداریٹے نے آخر اس مشکل کا حل ڈھونڈ لیا۔ دیکھو یہ موقع اچھا ہے، شادی کہہ کر دھوم دھڑکانہ کر دے کھانے کے بجائے معمولی سی چائے ہو جائے۔ بہانہ بھی کم جلتے جاتیں کہ بس شرعی رسم کر رہے ہیں۔ بہانہ ہمارے پاس ہے ہی کہ ہمارے ہاں ایک بزدل خاتون کا انتقال ہوا ہے ہم دھوم دھام سے نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو یہ موقع پھر کبھی نہ آئے گا۔

چنانچہ یہی ہوا۔ بڑیاں مرتے مرتے بھی ایک کام کر گئیں۔ جن تقریبوں میں ہزاروں خرچ کرنے کے بعد بھی اُلا بنے کا دھڑکا تھا انہیں سیکڑوں پر شاگیتیں اور کسی طرف سے کوئی اعتراض نہ ہوا۔ سچ ہے نیک آدمیوں کی موت بھی نیک ہوتی ہے۔

”سیپ“ کراچی

سراب

ایمہ گرین کلب کے وسیع لان میں کچھول شوہر ہوتا تھا۔

میں نے ہزار بار بڑی منت سے رخصت کو سمجھایا کہ میں گھر واری میں اتنی الجھ چکی ہوں کہ اس قسم کے ہنگامے اب میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے مگر وہ نہ مانے۔ کہنے لگے: ”تمہارے لئے ہی تو میں ٹکٹ خرید کر لایا ہوں ورنہ مجھے بچاس روپے خرچے کی کیا ضرورت تھی؟“

”بچاس روپے؟“ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ چائے کا نیا سیٹ ہاتھوں سے پھینکتے پھینکتے بچا۔ ”ارے ارے“ رخصت نے لپک کر بیالی سنبھالی: ”تم تو ذرا ذرا اسی بات پر گھبرا جاتی ہو۔“

”آپ کو بچاس روپے نا تھی برباد کرنے کی کیا مصیبت تھی؟“

”بھئی۔ وہ۔۔۔“ رخصت قد سے نادام ہو کر بولنے لگی: ”اپنے وسیع صاحب

ہیں نا۔۔۔ انہوں نے ہی شو کر دیا ہے۔ سن کا بے حد احاطہ تھا کہیں تمہیں بھی لیکر آؤں؟“

”اُن کا کیا ہے۔ چندہ جمع کرنے کو تو وہ ساری دنیا کو کھٹکھٹا لیں گے۔ اُن کی بلا سے بعد میں کوئی ناقص متاثر ہے۔“ میں ایک دم جھگڑنے کے موڈ میں آگئی، کوئی جھگ بھی ہو جھگلا! ایک نہ دو! اکٹھے پورے پچاس روپے۔ کوئی خدا کا خون بھی ہوتا ہے یا نہیں؟“

لیکن رفعت نے گھبرا کر منہ پھیر جانے میں ہی عاقبت سمجھی۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے شکست خوردہ سی آواز میں بولے: ”نینا کا ڈانس پروگرام ہے۔ ڈانس؟ اور وہ بھی نینا کا، میں نے سنک میں گرم پانی انڈیل کر چلی جلدی برجن ہاؤس نکالنے شروع کئے اور پونچھے بیٹھ گئی۔ بار بار سی خیال آتا رہا کہ گرمی میں دھنس کر میرے جیسی عورتیں وقت سے کتنی پہلے بڑھ چکی ہوتی ہیں۔ نہ کہیں آنے کا خیال نہ جانے کا۔ بس پیٹ کاٹھے اور خواہشات کا گلا گھونٹتے ہی گزرے چلی جاتی ہے، مگر زندگی تو نینا جیسی لڑکیوں کی ہوتی ہے جو کبھی بڑھ چکی نہیں ہوتیں۔ جیسا ایور گرین کلب، ویسی ہی ایور گرین نینا!“

چمکتی آنکھیں، دمکتے گال، لہراتے بال اور ٹھٹھکتی ہوئی چال۔ سکول کے دنوں میں بھی وہ ایسے ہی جھجھلاتی تھی جیسے خلیہ میں ہٹا کر آئی ہو۔

ہم دونوں ایک ساتھ چلیں کی متر تلیں طے کر کے جڑی موٹی تھیں۔ اُس نے تعلیم مکمل بھی نہیں کی تھی کہ اپنے پیارے ساتھ سو سٹوڈنٹ چلی گئی تھی۔ سمیع صاحب بڑے مصروف کامداری آدمی تھے۔ آدھی دنیا میں اُن کے دفتر کی شاخیں پھیلی تھیں۔ بنگلے پتریں تین کادیں کھڑی رہتیں۔ باوردی ڈرائیور ایک اشارے کے منتظر ہوتے۔ اندر ڈرائنگ روم میں ریکارڈ پلیئر پر بدلتا بدلتا مضمضروں میں انگریزی

دھیس بھتی رہتیں۔ قیمتی قالینوں پر سفید روشنی کے لڑھکتے، نینا کی مٹی خوش رنگ کی سادھی پہنے بڑے اہتمام سے کافی بنا یا کرتیں۔ اُن کے گلے میں بڑے ہوئے نت نئے ڈیزائن کے ڈائمنڈ کٹ نیگلےس انگلیوں کی روشنی لوٹ لیا کرتے۔ ذرا سی چمک ہوتی تو یوں لگتا جیسے تارہ ٹوٹا۔

اکوٹی اولاد تو لگینہ ہوتی ہے جسے تراش تراش سے میرا بنا لیا جاتا ہے۔ نینا کی تربیت صبح صاحب نے بڑے دھیان سے کی تھی۔ اُس کے لیے ایک چھوٹا چار چار اُستاد ہفتے میں مختلف اوقات میں آتے تھے۔ ایک پہلے ڈانس کے لئے۔ ایک توڑے سکھانے کے لئے۔ استاد جی اور تھے سراگ راگنیوں کے اور۔ پڑھنا لکھنا اُس کے لئے بہت ضروری نہیں تھا۔ بس وہ تو کافی فکر کرتی رہتی تھی۔ چال میں انگلیلیاں خود بخود اُگتی تھیں۔ جی بھر کر غلیں دیکھتی۔ کلاس میں خالی وقت ہوتا تو کمانیاں اُسٹا کر سب کو لپٹا یا کرتی۔ ہر سال یورپ کا چکر لگا کر واپس آتی تو داستانوں سے بھری ہوتی سکول سے واپسی پر جب کبھی وہ مجھے اپنی بڑی سی کار میں چھوڑنے آتی تو میں تمام راستے احساس کمتری کے مارے مرنے لاتی۔

دفعہ سے بیاہ کر کے میں اور بھی گھر سے غار میں جاگری۔ گھر کے کاموں کی ایک طویل فہرست اُلجھے دھاگوں کی طرح میرے سامنے رکھی رہتی۔ بار بار میرے دل میں یہ خواہش ابھرتی کہ کاش! ارفع بھی نینا کے بسا کی طرح کاروباری سیٹھ ہوتے۔ بنگلوں اور کاروں کے مالک تو خیر ہوتے ہی۔ مگر اُن کی طرح آدمی وہ جن کو کل کے ممبر ضرور ہوتے۔ میری مٹی کے لئے پڑھی لکھی آیا ہوتی۔ میرے پاس وقت بے وقت کہیں آنے جانے کے لئے ایک بڑی سی کار ہوتی جسے میں خود ڈرائیو

کرتی۔ باورچی خانے میں دیسی انگریزی کھانا پکانے کے لئے خانہ سال موجود رہتا۔ اردلی ہوتا بھرا ہوتا۔

لیکن۔۔۔ مجھے تو ایک وقت خانہ سال بھی بننا پڑتا اور آیا بھی۔ اردلی بن کر رفت کے کپڑوں پر برش کرنا بھی میرے ذمے، ادا ستری کرتی، جوتے پالش کر کے ایک قطار میں رکھنے، بستر بچانے اور راتوں کو منی کے ساتھ جاگ کر بیٹھنا، کہیں آنے جانے کے لئے ٹیکسی یا رکشا کا کرایہ یا کس کے لئے ٹکٹوں، سڑک پر کھڑے ہو کر انتظار کرنا اور جب بس نہ ملتی تو مایوس ہو کر ڈبڈبائی نظروں سے سر جھکانے میلوں پیدل بھی چلنا۔

کاش میں دنیا ہوتی تو اپنے پیار کے ساتھ مرے سے کہیں امریکہ جاتی، کبھی یورپ گھومنی، کبھی سویٹزرلینڈ کی حسین وادیوں میں سہرے خواب دیکھتی۔

رفت نے بڑی فراخ دلی سچے پاس روپے خرچ کر ڈالے تھے۔ بار بار میرے دل میں اُبال اٹھتا کہ جین جیج کو آسمان سے پھرتا ہوں۔ ابھی جینے بھر کے ڈھیروں اخراجات کا پہاڑ میرے سامنے کھڑا تھا۔ منی کے لئے دودھ کے ڈبے منگوانے تھے، بجلی کا بل ادا کرنا تھا، خود رفت کے کپڑوں کی سلائی کا بل چکنا تھا۔ جتنی تیزی سے منگائی بڑھ رہی ہے اس سے دگنی رفتار سے دوزی کی سلائی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ رفت کے سبھی پرانے سوٹ پھلتی ہو چکے تھے۔ اس لئے جموری میں نئے سوٹ سلوانے ضروری تھے۔ آخر اپنا بھرم بھی تو رکھنا ہوتا ہے۔

البتہ میرے جینز کی لائی جوتی سبھی ساڑھیاں ایک ایک کر کے میرے

ساتھ ہی بد رنگ ہو چکی تھیں۔ شاذیہ، رفعت کی آواز سنائی دی: ”بھئی تیار ہو جاؤ
مادر ہی ہوں، رفعت،“ میں نے مردہ آواز میں کہا اور ایک ایک کر کے کبھی
پرانی ساڑھیاں الماری میں سے کھینچ کر رنگ پر ڈھیر کر دیں۔ سب کی سب بچا
لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے جلدی جلدی منہ دھو کر ایک آسمانی ساڑھی لپیٹ لی جس کا پینڈ
چٹنوں میں چھپا لیا۔ پھر آئینے میں جھلک کر خود کو ڈھونڈا تو دھک سی رہ گئی۔ میں
کہاں کھو گئی تھی؟

میرے چہرے پر بن بلا سے دھانوں جیسا ہلکی لکیوں کا ناگوار جال بھیل رہا
تھوڑے رنگ پرانے فرنیچر کی طرح سر دی گرمی کی زیادتیاں سدھ کر اڑ چکی تھیں۔ بالوں
کی سبھاہی پردھوئیں کا غبار اچھلا تھا۔ چہرے کے تکیے نقوش پھیکے پڑ چکے تھے۔
”میں نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی۔ مجھے وہاں نہیں جانا چاہئے۔“ میرے
اندر سے کار اٹھنے لگی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر چلانا چاہا
تو رفعت نے بے اختیار گھسیٹ لیا: ”جلدی چلو“

”نیں کیسی لگ رہی ہوں، رفعت؟“

”بس ٹھیک ہے۔“

ان کے لہجے میں ایسی جھلک تھی جیسے کہہ رہے ہوں کہ اب تمہارے اچھے
لگنے کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے؟

ہم دونوں گھر سے باہر نکلے تو رفعت نے پڑوس میں جا کر گھر کی کنجیاں خالی
کے حوالے کرتے ہوئے منی کو ایک ہڈل کی صورت لپیٹ کر اُن کے سپرد کر دیا۔

دلوں میں چور لے ہم چپ چاپ پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ ٹکٹوں پر پہلے ہی بہت روپے ضائع ہو چکے تھے اور شو شروع ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔

راستہ طے کر کے جب ہم ایوڈ گرین کلب کے ہرے بھرے لان میں پہنچے تو سادے شہر کی رونق وہاں سمٹ آئی تھی۔ ہر طرف ہنستے مسکراتے چہرے تھے کوئی عینکیں نہ تھا۔ میری طرح کسی کی پیشانی پر کم مائیگی کے احساس کی شے نہ تھی بل کھاتی لڑکیاں تھیں، لمبے بالوں والے بے فکر جوان تھے، لپٹی ہوئی ادھیر ٹکڑے خور تھیں، اور بے جنگم، بے ٹول زندگی والے مرد، احساس کستری کا ایک جانا پنچا ناخول میرے گرد ادبچا اٹھتا گیا، جیسی تو میں نے اُس نرم گرم ہاتھوں کے ایک کونے میں چھپ کر چپ چاپ ساری شام گزار دی۔

پہلے چائے ہوئی۔ پھر جب ذرا جھٹپٹا ہوا اور شام گہری ہو چلی تو دل بہلانے والے بڑے فخر سے اپنے ہاتھوں میں بیگ سنبھالے نظر آنے لگے۔ نینا کی می بالکل نینا لگ رہی تھیں بلکہ اُس سے بھی دس برس چھوٹی ادبچا سایہ شامل بنا سے، باریک سرسراتی ساڑھی میں تنہا ہوا شاداب جسم ہنسی کرا کھلے گلاب جیسی دھلی دھلی رنگت لگے میں ڈائمنڈ کٹ ٹیکس، کبھی ایک میز پر کبھی دو سرور، کبھی تیسری پر کسی نئی کی طرح چلیوں میں ساڑھی سنبھال رہے سے ادھر منڈلا رہی تھیں۔

نینا کے پیاسدا کے بل ڈاگ تھے۔ یورپ اور امریکہ کی مسلسل سیاحتوں نے تو انہیں اور بھی باہر والا بنا دیا تھا۔ ڈھیلے پائنتوں کی پتلی، سوک کاوٹ آٹارے قیچے پر صحن واسکٹ پہنے، آستینیں ذرا سی اور کچھ چھانے بے حد

قینتی مائی اور مائی بہن لگائے پھیلے ہونٹوں میں پائپ دباوے اور جسنی سیٹج کے گرد خراتے پھر رہے تھے۔ کام کرنے والے اُن کے بھاری بوٹوں کے دھماکوں سے چونک کر جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگتے۔ بڑا رعب تھا اُن کا۔

میں اپنی کرسی پر بیٹھی ٹھنکی باندھے نینا کی ٹہنی اور پاؤں کو بڑے رشک سے دیکھتی رہی۔ درختوں کے جھنڈ میں دیکھتے ہی دیکھتے لکڑی کی سیٹج تیار ہو چکی تھی سیٹج کے راس میں ذرا گہری خندق کھود کر پام کے پودوں کی صورت سلسلہ دار بجلی کے جتنے لگائے گئے تھے بجلدی سیاہ پُردے گرے تھے۔ ذرا ہل جاتے تو پھر تری میں سے فرش پر پھپھے ہوئے نرم روئیں دار نالین کے گمرو نینا کے ڈرائیگنگ کی آرائش کا سارا سامان نظر آنے لگتا۔ بڑے بڑے سنگ تراشی کے مجسمے چمکتے ہوئے گھڑان اور ٹنگین قطاروں کی تصویریں پس منظر کے لیے حسیں دایروں کے کپنے ہوئے پُردے، فیر ملکی گڑیاں

تقریباً سبھی سامان نینا کی مٹی باہر کے ٹکڑوں سے لائی تھیں۔

جب پُردہ ذرا زیادہ سرک جاتا تو اند کی طرف سے دونا معلوم ہا تھا اُس کی دھڑکی پینچ کر دُورست کر دیتے پھر سیاہ پُردہ ایک حبیب سی سیاہ آہنی دیوار بن جاتی۔ جس پر داتیں بائیں دونا بھی رنگ کے پھنکارتے ہوئے ارد ہوں کی تصویر بنی تھی جو ایک معصوم سی بھولی بھالی ناچنے والی کو گھیرے میں لے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

اس تصویر پر نظر پڑتی تو سارے بدن میں کیکی سی دُورٹنے لگتی معلوم نہیں میرے روئیں روئیں میں ایک اُن جانا خوف کیوں بس گیا تھا؟

پھر اچانک ہلکا ہلکا سا سا دھجنا شروع ہو گیا۔ تمام تیاں ایک ایک کر کے جل

اُمٹھیں۔۔۔ لوگ اپنی اپنی جگہ بے تابی سے پردہ اٹھنے کے منتظر ہو کر بیٹھ گئے۔
 پل بھر میں نینا جھم جھم کرتی "جادو جگاتی سنبھ پڑا گئی۔"

وہ چمکتی آنکھوں اور دکتے کٹاؤں والی دس برس پہلے کی نینا تھی۔ ماتھے پر
 کم کم لگاتے گورے تلوؤں میں گلال اور ہتھیلیوں کی پشت پر خنائی جال سجائے۔
 پیروں میں گھونگرنڈن کی چوڑی پٹی باندھے! وہ ایک دلربا انداز میں مسکراتی جھک کر
 سلام کیا۔ پھر اس نے بل کھا کر فرش پر ایک پاؤں مارا طبلے پہ تھاپ پڑی اور
 اُس نے بارہاں پھیلا لیں۔

چمکے گرنے کی بس ایک پھلی سی تھی جو رہ کر کوند نے لگی۔ وہ اپنی باہوں میں
 سب کچھ سمیٹتی چلی گئی۔

تھا تھئی تھک تھک... ہاتھوں کے کنول بن رہے تھے، ہونٹوں کی کلیاں
 چمک رہی تھیں، پلکوں کے اُدھے تیر رہے تھے، کلائیوں کے گہرے دھک رہے
 تھے اور کولہوں پر سے ڈھلک کر پھسلتی ہوئی گئے بارہاں میں گوندھی چوٹی کی ناگھی
 لہرا رہی تھی۔

نرت تھا، مال تھا، مال کے بھنور تھے، اُدھی خچی گرت کے ہلکورے تھے، ایک
 جادو سا جاگ اُٹھا تھا۔

ایک نہیں دو تین دھس ہوئے۔ نینا سارے شہر کو لوٹ کر لے گئی
 پھر جب خوشتم ہوا تو وہ اچانک میرے پیچھے سے آکر میرے گلے میں محسوس ہوئی:
 "شادی!" اُس نے مجھے کھینچ کر کہا۔ "تم تو بچپانی بھی نہیں جانتیں۔" اُس نے میرے
 کھردرے ہاتھ بے اختیار اپنے نرم نرم ہاتھوں میں دبائے۔

میں نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کیچنے لئے۔

اُس نے میرے آڑے آڑے بال کینٹوں کے پیچھے سنوار کر کہا: "کتنی بدل گئی ہو۔"

"ہاں، ہینا۔" میں نے بے دل سے کہا: "دن ہی کچھ ایسے آگئے ہیں۔"
"بیمار ہو گیا؟"

"نہیں نہیں،" میں نے جھٹ بات بدلنے کو کہا: "تم سناؤ، کیا ہر تلو ہوتا ہے؟"
"ہونا کیا ہے؟" وہ ایک اداس سے منہ پھلا کر بولی: "بس، بور ہو جاتی ہوں سارا دن۔"
"کہیں باہر جانے کا پروگرام نہیں ہے کیا؟"

"ہے تو سہی؟"

"کب تک؟"

"شادی کے بعد" وہ اترا کر شرمائی۔

"آہا" میں نے ہنس کر کہا، "کون ہے وہ خوش قسمت؟"

"دکھاؤں؟"

"ہاں — ہاں۔"

اُس نے چٹک کر سٹیج پر گھڑے ہوئے سازندوں اور چلیچلیوں کو ہدایات دیتے ہوئے ایوڈ گرین کلب کے گھونگر یا لے بالوں والے میجر کی طرف اشارہ کیا: "وہ۔"
احمد ہیں۔

"مگر ہینا" میں نے تعجب سے کہا، "تمہاری مشق تو پہلے..."

"ارے چھوڑو، شادی" اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا: "وہ بھی کوئی"

منگنی تھی؟

”کیسے واحد کی پہنائی ہوئی انگوٹھی تو تم بڑے ارمانوں سے پہنے بھرتی تھیں۔“
 ”انگوٹھی کا کیا ہے؟“ اُس نے کمال بے نیازی سے منہ پڑایا۔ ”جب چاہو
 پہن لو۔ پھر وہ بڑے رومالک انداز میں انگلی میں پڑی ہوئی ایک نئی انگوٹھی
 گھماتے ہوئے بولی: ”تو ایک جذباتی دُور تھا، ختم ہو گیا۔“
 ”تم اسے جذباتی دُور کہتی ہو؟ حیرت ہے۔“

”ہاں، شاذی، دیکھو نا،“ اُس نے میرے دونوں شانے اپنے ہاتھوں
 میں تھام کر بڑے وثوق سے سمجھایا، ”تعلیم کا ابتدائی زمانہ ہوتا ہی ایسا نادر
 کا ہے کہ پہلی مرتبہ جو بھی لڑکا سامنے آتا ہے بس آنکھیں بند کر کے جھٹ سے
 اُس کے متعلق فیصلہ کر لیا جاتا ہے مگر پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسا
 موقع بھی آتا ہے کہ...“
 ”تم خوش ہو؟“

”جی۔۔۔۔۔“ اُس نے بڑے سرور میں آنکھیں بند کر کے مجھے بھیج
 کر گئے لگایا۔ اُس کے رویے رد میں میں ناچنے والیوں کی حاکم بنی تھی۔
 ”احمد کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ کلب کا کام تو بس پارٹ ٹائم ہی ہے۔
 ایڈورڈ روڈ پر بہت بڑا ذاتی بینک ہے۔ دو کاریں ہیں۔ ایک کوٹھی کراچی میں
 ہے، ایک کاٹج سمندر کے کنارے ہے، ایک ریسٹ آباد میں گھر ہے، ایک
 مری میں، ایک...“

”جنگلوں اور کاروں کے ساتھ ساتھ چاہتوں کا دفتر کھول ہی تھی

اور میرے اشک کا جام لبریز ہوتا چلا جا رہا تھا۔

کاش اگر میں نینا نہ ہوتی تو اُس کی بہن ہی ہوتی۔ یہ تسلی جیسی تھی میری بھی ماں ہوتیں اور یہ بگل ڈاگ جیسے غرائے ہوئے چوڑے کتے کے پاس میرے بھی پناہ ہوتے۔

پھر۔۔۔ میں بھی ایک سچے سچا تے بنگلے میں رہتی۔ میرے ارد گرد نوکروں اور ولیوں کا جھوم ہوتا۔ مجھے ہل کر کوئی کام نہ کرنا پڑتا۔ بس نرم نرم صوفیوں میں جھنس کر خواب دیکھا کرتی؛ اور پھر جب میں جاگتی تو میرا ایک قدم ایک کار میں ہوتا، اور دوسرا قدم۔۔۔ دوسری کار میں۔ میں بھی سال میں دو مرتبہ دنیا کے گرد چمکڑ لگا کرتی۔

مجھے اپنی کھردری ہتھیلیوں، اپنی سیلی گلی سارٹھی، اپنے گھسے ہوئے سینڈلوں، خود اپنے آپ پر ترس آنے لگا۔

پھر نینا کی شادی بڑی دھوم سے ہو گئی۔ اُس نے مجھے بھی بڑے اسرار سے بلایا مگر میں نہیں گئی۔ کس صورت سے جاتی؟

حینوں اُس کی شادی کے چرچے ہوتے رہے، مدتوں اُس کی خوبصورت تصویریں اخباروں کی زینت بنی رہیں۔ ایک رنگین مودی بھی تیار کی گئی تھی۔ ہزاروں ہی شاٹ لئے گئے تھے۔ ہر روز میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی شاڈ کے بعد وہ سنی مومن مٹانے کے لئے ہانگ کاٹک چلی گئی۔

اُس کا قصور میرے ذہن میں خوشبو کی طرح بستا تھا، دن جمعہ کے کام لگانے کے بعد جب میں جھک کر سونے کے لئے لیٹی تو نینا ایک پھول کی طرح مجھ پر

آن گرتی۔ میں بار بار سوچتی کہ شادی ہر زندگی کا ایک نازک موڑ ہوتا ہے مگر دنیا کے لئے یہ موڑ تو لاکھوں خوشیوں کا پیغام لے کر آیا ہے۔ یقیناً ہانگ لکک سے آگے یہ جا پان چلی گئی ہوگی۔ آڑو اور خبابیوں کے شگوفوں سے گھرا ہوا اُس کا لکڑی کا خوشبودت بنگلہ ہوگا۔ اُس کی صبح حسین ہوگی، دوپہر اُس سے بڑھ کر شگفتہ ہوگی اور شام رنگین....

وہاں روشنی ہوگی، خوشیاں ہوں گی اور ہنسنے....

میں انہی خیالوں میں ڈوب کر سو جاتی اور صبح کو جب سو کر اٹھتی تو میرا نگہ بھینکا ہوتا اندھا نکمیس بو جھل جت نئے کاموں اور اخراجات کی طویل فہرست میرا انتظار کر رہی ہوتی: دودھ کابل، اخبار کابل، بجلی کابل، دھوئی کی دھلائی، نئے کی دواؤں کابل، منی کے نئے بوتلوں کی فکر، بارہ چھ خاٹے کا کام، گھر کی صفائی، کپڑے دھونا، سرمہ مٹ کرنا، راضی لانا....

میں عہد کر لیتی کہ اپنی منی کا بیاہ سوچ سمجھ کر کسی اونچے سے گھر میں کر دوں گی جہاں روپے کی ریل پل میں یہ سب اخراجات بڑے معمولی نظر آئیں۔ دولت کی گرمی سے تو ہزاروں جھیلے موسم کی طرح گھٹلائے جاسکتے ہیں۔

نیم چار برس اس کشمکش میں گزر گئے۔

اب تو تنہا بھی ہوشیار ہو چلا تھا۔ میں نے سوچا بیک وقت دو بچوں کو سنبھالنا ناممکن ہے۔ اب منی کو اسکول میں داخل کر دیا ہی دینا چاہئے۔ کوئی کمان تک مڑنا بھرتا رہے۔ رفعت سے بات کی تو وہ یوں گھبرا گئے جیسے میں نے منی کے بیاہ کی بات چھیڑ دی۔ اُن کے ماتھے پر پھر مٹتے ہوئے پسینے کے قطرے صاف

کہہ رہے تھے کہ اتنی مقوی تنخواہ میں منی کی فیس کیسے نکل سکے گی؟
”مگر تعلیم تو بہت ضروری ہے، رخصت!“

ہم دونوں نے بڑی بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر وہ ایک
لبا سانس کھینچ کر کہنے لگے ”بہت ضروری ہے۔ واقعی بہت ضروری ہے۔
آج کل کے زمانے میں تو جب تک لڑکیاں لڑکوں کی طرح پڑھ لکھ کر روزی
کمانے کے قابل نہ ہو جائیں حالات سے نپٹنا ناممکن ہے۔“

بات ادھوری چھوڑ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ منی کو کسی بڑے سے سکول میں
نہ سہی کسی سستے سے پرائیویٹ سکول میں ہی لے جاؤں گی۔ آج کل قدم قدم
پر تو سکول کھلے ہیں۔

منی سکول کا نام سن کر خوشی سے تالیاں بجانے لگی۔ میں نے دوسرے دن
صبح ہی اٹھ کر اس کا منہ دھلایا۔ نیا فراگ پہنا یا اور بالوں میں سرخ ربہ باندھ
دیا۔ وہ بار بار میرا منہ چومتی تھی، پیاری پیاری باتیں کرتی تھی، مجھک مجھک کر
میری طرف دلا رہے دیکھتی تھی۔

اپنے گھر کی بڑی سڑک پار کر کے جب میں اسے ایک چھوٹی سی کوٹھی میں
کھلے ہوئے پرائیویٹ کنڈرگارٹن سکول میں پہنچی تو لان میں پی۔ ٹی چورہ ہی تھی۔
بار بار سیٹی بجاتی تھی، ہنسی ہنسی بچیوں کے پرے سفید یونیفارم پہنے ایک دائرے
میں جمع تھے۔ کبھی ہاتھ پکڑ پکڑ کر گھومتے تھے، کبھی بیٹھتے تھے، جھکتے تھے اور
اٹھتے تھے۔ بس زینا گروٹڈ میں کلیں بھر رہی تھی۔ وہی چہرہ ابدن عزت کا سا
انداز، بڑی بڑی آنکھوں میں اتنی چمک اتنی دیمک جیسے کسی کا شدید انتظار ہو۔

مجھے دیکھ کر وہ دُور ہی سے بھاگی آئی، "شا— ذی! اس نے مجھے
 پاؤں پھیلائیں؟" ادھر، "نہیں، اتم؟" میں اُس سے پٹ گئی، "یہاں کیسے؟"
 "دیکھ لو۔"

"شا ذی کے بعد بدلی نہیں ذرا بھی۔ کہاں ہوتی ہو؟"
 "نہی کے پاس۔"

"اور— احمد؟"

"چھوڑ دیا؟"

"چھوڑ دیا؟"

"ہاں اور کیا۔" وہ اس طرح بولی جیسے بڑی معمولی سی بات ہو۔
 "کیوں؟"

"وڑائی ہو ہو گئی۔"

"تو صلح کر لی ہوتی؟"

"تو بہ! اُس نے جھک کر منی کو پار کیا پھر بولی، "میرا بھی ایک بیٹا
 ہے۔ جیلو! یہیں کہیں ہو گا۔" اُس نے تلاش میں چاروں طرف نظریں
 دوڑائیں، "پتا کیسے ہیں؟" میں ابھی تک اُدھیر بن میں لگی تھی۔ کسی طرح تشفی
 نہ ہو رہی تھی۔ "وہ تو مر بھی گئے؟" نینا کو بھر کے لئے افسردہ سی ہو گئی، میں نے
 طلاق لی تو اُن کا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

"مگر۔" میں ابھی شکایت کے لئے الفاظ ہی تول رہی تھی کہ وہ جھٹ
 میرے لیے کو پہچان کر بولی، "ہاں! شا ذی! ہم نے بڑی خاموشی سے اُن کا

کفن دفن کر دیا۔ اب کہاں سارے شہر کو اکٹھا کرتے۔

”مگر، نیتا، احمد تو...“

”فراڈ تھا وہ تو، پکا فراڈ!“

”فراڈ؟“

”ہاں، اور کیا، نہ جھگے، نہ کاویں، نہ کاروبار، نہ بینک بلینس۔ شادی کے

بعد سیدھا گاؤں لے گیا مجھے۔ وہاں اُس کی بڑھی بیارماں منگی اور گنوا گنوا سی

ہئیں۔ تو بہ!“

میرے ذہن میں قسماقی ہوئی تمام روشنیاں ایک ایک کر کے گل جرنے لگیں۔

”ہانگ کانگ جانے کا تو محض پراپگنڈا تھا۔ وہاں کوئی سٹینڈرڈ بھی ہوتا

گاؤں میں؟ دفع کر دیم کس بات کا ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی: ”اب تو

شادی بھی چوری ہے۔“

”کس کی؟“ میں چونک کر بولی۔ ”تمہاری یا احمد؟“

”چہ۔ احمد کی تو ہو بھی سکتی۔ اپنے ہی جیسی لے بھی آیا۔“

”تو تمہاری چوری ہے؟“

”ہاں، شادی، اور کس کی؟“

میں دھک سی رہ گئی۔

”جواہرات کی بیوپار ہے؟“ وہ مجھے یقین دلانے کو آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

”یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ کیا لندن، کیا امریکہ، کیا حساب پان“

”کیا افریقہ...“

”میرے پاس کوئی ٹریڈنگ نہیں ہے اس لئے میں کچھ نہ کر سکی۔ یہ نوکری تو میں نے ذلت گزارنے کے لئے کر لی ہے۔ شادی ہوتے ہی ہم افریقہ چلے جائیں گے۔ وہاں بہت بڑا بزنس ہے۔ یہی بھی ہے کتنی بھینس کہ گھریلو بیکار مرنے سے اچھا تو یہی ہے کہ میں یہاں بچوں کو پانی کی گریڈا دیا کروں۔“

”بہت اچھا کیا، نینا۔“ میں نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

”شادی؟“ وہ مجھ پر جھبکا آئی۔ ”ابھی راحیل مجھے لینے آئے گا۔ مرنے پر خدا کی قسم۔ جان دیتا ہے۔ اُسے آرٹ سے بے حد لگاؤ ہے۔ میرے فن کی کبھی قدر کرتا ہے جب تک ہم افریقہ نہیں جائیں گے میں ایک ڈاننگ سکول کھول لوں گی۔“

پھر وہ ہنس کر ملی۔ ”منی کو میرے پاس بھیج دینا۔“

مجھے سکتے سا ہو گیا۔ نہ معلوم کیوں میری پتھرائی آنکھوں کے سامنے ایور گرین کلب کی سیٹی پڑنے ہوئے بھاری سیاہ پردوں پر چھنکارتے ہوئے نازک اثر دھوپوں میں گھری ہوئی۔ چنے والی کی تصویر پتھر گئی تھی۔

”نہیں نہیں“ میں نے گہرا کر سوچا۔ ”یہ کبھی نہ ہوگا۔“

پھر میں منی کو اُس کی کلاس میں بٹھا کر واپس چلی آئی۔

میں نے اپنے تصورات کے سبھی دریچے ایک ایک کر کے بند کر دیے۔ اب میں اپنے ذہن پر چھپائے اندھیرے میں سکون کی روشنی تلاش کرنے کے لئے بھٹکنے لگی۔

اب میں اپنے خالی وقت میں ننھے کو تھپک تھپک کر لمبیاں سُتا تو اندازاً پچھلے دنوں میں اُسے صبح کے وقت سکول پہنچانے جاتی، وہ پیر کو لینے جاتی۔ کسی کسی

دن اُس کی فیس جمع کروانے جاتی۔ میری مصروفیات میں احاذہ ہو چکا تھا مگر میں بہت مطمئن تھی۔

نیت شادی کے بعد بھی کافی عرصے کام کرتی رہی پھر اچانک وہ چھٹی لے کر کہیں چلی گئی۔ غالباً افریقہ کا پروگرام پورا ہو گیا تھا۔

ایک شام منی میرے گھٹنے سے لگی بیٹھی کا عدہ پڑھ رہی تھی اچانک پوچھنے لگی: ”ماں، طلاق کسے کہتے ہیں؟“

”طلاق؟“ منی کے منہ سے یہ لفظ سن کر میں کانپ گئی۔ میں نے بے تابی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”سب کہتے ہیں اُس نے میرا خدا اپنے منہ پر سے ہٹا کر رکھا۔ سب کہتے ہیں پی ٹی کو طلاق ہو گئی۔“

”ایسی باتیں نہیں کر سکتے، منی!“ میں بدحواس ہو کر بولی۔
 ”سب لڑکیاں کہتی ہیں، ماں، اچھا آدمی نہیں تھا۔ پی ٹی کو بہت مارنا تھا۔ زخم ڈال دیتا تھا۔“

میں نے باتوں میں بہلا کر منی کو ٹال دیا مگر مجھے تمام رات نیند نہ آئی۔ کوئی بولتے ہوئے صبح ہو گئی۔ دوسرے دن میں نینات ملنے سکول پہنچی مگر وہ نوکری چھوڑ کر کہیں جا چکی تھی۔

سال پہ سال گزرتے گئے۔ نینا بہت لڑکائے سکول جانے لگا۔ رفعت کی ترقی جو تھی تو سہ ماہی کا ہو گیا۔ رفعت اب بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔ ذمہ داریاں بڑھ رہی تھیں۔ خود میرا کمر بھی جکی جکی رہنے لگی۔ منی

اب بڑی جھگڑی تھی۔ اب وہ میرے بہت سے کام بھاگ بھاگ کر کر دیا کرتی تھی۔ اپنے باپ کے رومال دھو دیتی، کپڑوں پر، ستری کر دیتی، چھوٹی موٹی صفائی کرتی جاتے بنالیتی، ہنڈیا بھون دیتی۔ مجھے اب جیسے قرار آچلا تھا۔ ذہن میں جو خراشیں تھیں وہ مٹ چلی تھیں جو پچاسیر جمع ہی تھیں ایک ایک کر کے نکل چکی تھیں۔ سوچنے سمجھنے کے انداز بدل رہے تھے۔ پڑوس بہت بدل چکا تھا کئی پرانے مکان ڈھائے جا چکے تھے۔ اُن کی جگہ نئے مکان بن گئے تھے۔ کئے اور ہوا دار مکان، جدید طرز کے خوش نما شنگ، دو منزلہ عمارتیں، سینٹ کی دایروں سے سجے پھول دار بیلوں سے ڈھکے اونچے اونچے گھر۔۔۔

سامنے ہی ایک جوڑا ہوا کرتا تھا جس کے کنارے پڑی ہوئی تھیں بھری غلاحت میں مرغیاں دان چنگتی پھرتی تھیں۔ دونوں کی محنت سے یہاں ایک دو منزلہ کوٹھی نما مکان بن گیا۔ کوئی ٹھیکیدار صاحب تھے جو بھری اور چوڑے کی سپلائی کا کام کرتے تھے۔ اپنے نئے گھر میں اُسے تو چاروں طرف پہلے شیرینی بانٹی اور پھر میلاؤ شریف کے رقبے بھیجے۔ پڑھنے والی کا خاص اہتمام تھا۔ سنا تھا کہ آواز میں بلکا کا سوز ہے۔ فطرت کیا چڑھتی ہے دل نکل لیتی ہے۔

مجھے میلاؤ شریف کی محفل سے زیادہ پڑھنے والی کا اشتیاقی نصیب کرنے گیا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ چمکی چمکی سی نفاحتی ٹھیکیداروں کے گھوڑکی اینٹوں کے صحن میں دیگیں چڑھتی تھیں۔ برآمدے پر نیلے استر کی بیماری جھپٹیں گرمی تھیں۔ ہال کمرے میں چاندنیوں کا زرش تھا۔ کالرس کے پاس ہی سندھی تھی جس پر بچھندنے دار گاؤں گئے رکھے تھے۔ قریب ہی ایک تیرپائی پر سیپارے جمع تھے۔

مٹے کی بیدیاں ایک ایک کر کے آئیں، سپارہ اٹھا کر بڑی عقیدت سے
چوم کر آنکھوں سے لگتیں اور چاندنی پر بیٹھ کر تلاوت میں مصروف ہو جاتیں تاکہ
جتنے میں مغلا نی بی کی آمد ہو ایک کلاہم پاک ہی ختم ہو جائے۔

کمرے میں بتیاں جلی تھیں۔ روشنی کی جگر نگر ہو رہی تھی۔ دروازے پر
پھول دار پردے گرے تھے۔ باہر بہت سے بچے کھیل رہے تھے، ٹھیکیدار کی بہو
بار بار انھیں دودھ پکاتی۔ پھر کوٹے کناری کا آنچل سنبھال بیسپارہ اٹھا لیتی۔
”اگئیں، اگئیں! مغلا نی بی اگئیں۔“ بچوں نے شور مچایا۔

عمر میں بیسپارہ سے پھوڑ بھاگی گئیں۔ دودھ گلاب موتے کے ہارے آگے
بڑھیں۔ ایک نے لپک کر پردہ اٹھایا دوسری نے انھیں سند پر بٹھایا کھٹے میں
مار ڈالے، کلاتوں میں گھرے بانڈھے۔ الہی مصری کی تھالی آگے بڑھائی۔ مغلا
نی نے دودھ دانے منہ میں ڈالے، ٹھیکیدار کی بہو نے اٹھ کر اگر تیاں سلگائیں، گلاب
پاشن بلا کر ساری محفل کو معطر کر دیا۔

مغلا نی بی کا رنگ زرد تھا، کچھڑی بال تھے۔ بیمار نظر آ رہی تھیں بلبل کے
کرتے پہیل بنی تھی۔ گردن میں تعویذ کا کالا ڈورا بھانگ رہا تھا۔ سسپورٹھکا ہوا
بلبل ہی کا مسلا دسلا دودھ تھا۔ گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالا تھی، ہاتھ
میں سبز امام کی قبیح بانڈھے، آنکھوں نے بڑی عقیدت سے میلاد نامہ آنکھوں سے
لگایا۔ پھر حلق کی کھوہ میں سے نازک سی آواز لہر لہاتی تھی:۔

”دودھ پر دھو، دودھ پر دھو، دودھ پر دھو...“

وہ درویش ڈوبی درویشی تھیں۔ سب ہی بڑھ رہے تھے مگر مجھے اپنے خیالوں میں خبری نہ ہوئی کہ کب میلاد شروع ہوا، کب ختم ہوا۔ احساس تھا تو بس اتنا کہ سوز میں ڈوبی ہوئی ایک آواز، جھل جھل کرتی، محض پر بھائی جبار ہی ہے۔

دعا کا وقت آیا تو ساری محفل نے ہاتھ اٹھائے۔ مغلائی بی کی بچیاں بندھی تھیں۔ سسک سسک کر، رک رک کر، کانپتے ہونٹوں پر فخرے و محل روئے تھے۔ بے روزگانوں کیلئے روزگار کی دعا، ناواروں، بے سہاروں کے سہارے کی دعا، لاوارثوں اور یتیموں کی دستگیری کی دعا، مریضوں کی شفا کے لئے دعا نہ معلوم کتنی دعائیں انھیں اذہر تھیں۔ جب قرض داروں کی نجات کا ذکر آیا تو وہ بے قابو ہو گئیں، بچکیاں و بی و بی بیچوں میں بدل گئیں۔ روتے روتے مغلائی بی نے مذہب الہی ہو گئیں۔ انھوں نے دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور وہیں مسند پر بے جان سی گر گئیں۔

”نینا! میں نے اُسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے ٹھنڈے پانی کا کٹکھاس اُس کے ہونٹوں سے لگایا۔ شا — ذی! اُس نے پڑھ دیا، ہو کر کہا۔ اور ٹپ ٹپ اُس کے آنسو گالوں پر گر گئے۔

”یہ کیا حالت بنائی ہے؟“

”رضائے الہی! اُس نے آنسو بچھ کر خاص مغلائیموں کے ہنداز میں کہا۔ تمہاری تو شاہی ہو گئی تھی؟“

اُس نے رحم کی جلتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

”تم تو ڈانسنگ اسکول...؟“

وہ ایک کرب میں تڑپ کر رہ گئی۔ جیسے اس کو تیر سا چھ گید میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبایا۔ ”کہاں رہی اتنے دن؟“ ”ہاں، شادی“ ”بڑے دکھ میں بولی“ ”میری شادی ہو تو گئی تھی، مگر راجل اچھا آدمی نہیں تھا۔“

”اب کے بھر؟“

”اب کیا کہوں۔ وہ خود تو تلاش تھا مگر شادی اُس نے کا دبا رکھے خیال سے کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اُس کے لئے بہیز میں خزانے لے کر آئی۔ میرے ساتھ تو صرف میرا بھلوتا تھا۔“

”خزانے؟“

”ہاں، شادی! اُس کا منصوبہ یہ تھا کہ جب میں ڈھیروں روپے لاؤں گی تو وہ سیاحت کے لئے باہر جائے گا مگر جب میں خالی ہاتھ وہاں پہنچی تو وہ مجھ پر ظلم کرنے لگا۔ بڑی بے دروی سے مارا کرتا تھا۔ ہمارے میں نے طلاق لے لی۔“

”فدا سا ٹوک کر وہ بولی: ”پاپا مرے تو لا کھوں بلکہ کروڑوں کا قرض چھوڑ گئے“

”بچے کی قرتی بھی ہو گئی۔ ادائیگی پھر بھی نہ ہو سکی۔“ وہ جیسے سوتے میں بول رہی تھی۔ ”اب تو مٹی بیچارہ کی کوفت ہوئے بھی عرصہ ہو گیا۔“

”اور نینا؟“

”اُس نے اپنے پلو سے آنسو پونچھے، صلیق کھنکھار کر صاف کیا، ہونٹ کھٹ کر بڑی حسرت سے بولی: ”بہت خوش نصیب تھے پاپا اور مٹی۔ اپنی زندگی تو بہت اچھی گزار گئے۔ آرام سے مر بھی گئے۔“

”بار بار آنسو روک رہی تھی، پھر بھی اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ آواز
حلق میں گھٹ رہی تھی۔“

”حوصلہ رکھو، نینا، حوصلہ!“

”میرے پاس حوصلے کے علاوہ اور ہے بھی کیا۔ جی بھی تو میری شادی ہو
رہی ہے۔“
”شادی؟“

”ہاں“ اُس نے جبری بے نیازی سے سر ہلایا۔ حاجی رمضان علی نے
مجھے اپنے عزیزوں سے بڑھ کر پناہ دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بے سہارا حکومت کا
اس دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے، اور یہ ہے بھی ٹھیک۔ میرے پاس تو سر
چھپانے کی جگہ بھی نہ تھی۔ کسی نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ کہاں ہو؟“

”منی جوان ہو گئی ہے۔ اُس کے بہت سے پیام آ رہے ہیں۔ دفعہ روزانہ
بحث کرتے ہیں کہ منی کا بیاد بہت اُونچے گھر میں کریں گے جہاں دولت کی
ریل پیل ہو گی، معیار زندگی بہت بلند ہو گا۔۔۔۔“

”منی اپنی منی کا بیاد اپنے ہی جیسے گھر میں کروں گی، میں نے وہیں بیٹھے
بیٹھے فیصلہ کر لیا۔“

”اُن کی پہلی تین بیویاں ہیں۔“ نینا بڑی راز داری میں مجھ پر جھپک آئی۔ دس
بارہ بچے بھی ہیں۔ سب بہت خوش ہیں مل جل کر گزارہ کر لیں گے۔ نکاح ہوتے
ہی ہم جگہ کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ خدا بڑا کھد ساز ہے، شادی اُس نے
میرا ہاتھ بڑے پیار سے دبایا۔“

رفت سے روزانہ بحث کرنے کے بعد ہم نے منی کی سگنی کر دی۔ آفتاب بالکل رفت کی طرح ایک دفتر میں ملازم ہے چھوٹی سی خواہ ہے اور اخراجات کی ایک طویل فہرست۔ منی دن بھر کام کرے گی۔ پیٹ کاٹ کر اور اپنی معصوم خواہشات کا گھلا گھونٹ کر گزارہ کرے گی۔ برتن مانجھ مانجھ کر اُس کی پھیلا کر کھوری ہو جائیں گی۔ اُس کے چہرے کی رونق چربی و نوں میں ختم ہو جائے گی۔ میری طرح وہ بھی ہنگوں اور کاروں کے خواب دیکھ کر سو جاتا کرے گی اور صبح کو جب اُٹھے گی تو اُس کا تکیہ نیچا بھیگا ہوگا۔ مگر میں خوش ہوں... بہت خوش...

کل میں اُس کے ہیز کے لئے سارے حیاں خریدنے گئی تھی۔ بازار سے واپس آ رہی تھی تو کالے شاہ کے مزار کے گرد لوگوں کا دس قدمہجوم تھا کہ راستہ چننا دشوار تھا۔ لنگر تقسیم ہو رہا تھا شاید۔ جیسی تو سبک سگوں اور غیروں نے اُدھم مچا رکھا تھا۔

اسی جنگلے میں مجھے عینا نظر آگئی۔ اُس کے ساتھ میلے پرانے کپڑے پہنے تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ جو راہ گیروں کو سلام کرتے، اُن کے پیچھے ہاتھ پھیلا کر بھاگتے، اور پھر ہانپ کر واپس آ جاتے۔ لوگ گزرتے گزرتے کچھ پھینک جاتے تو وہ نوں ہاتھوں سے بڑا کر جبین جھپٹ کرتے، اُن کی جھولی میں ڈال دیتے۔

وہ فٹ پاتھ پر بوسیدہ سا برقعہ لپیٹے بیٹھی تھی۔ ایک سوکھا ہوا زرد ہاتھ ماتھے کے انداز میں پھیل ہوا تھا۔

میں نے قریب جا کر آہستہ سے پکارا: "نینا!"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"نینا!" میں نے دوبارہ کہا۔

اُسے کوئی جنبش نہ ہوئی۔

"نینا، نینا" میں نے اُسے گھونچتے ہوئے کہا، اُس کا بخار میں جلتا ہوا ہاتھ اپنی

ہتھیلیوں میں دبایا مگر وہ ساکت بیٹھی رہی جیسے موجود ہی نہ ہو۔

"سویرا" کا جواب۔

رسل جو

میر شام مال روڈ کے ایک بک اسٹال سے کتابیں خرید کر بیچ رہے ہیں۔
 تو کتابوں کا سات میر کا پیکٹ ایک دم سات من کا ہو گیا۔ اس وقت مال پر کھڑے
 ہوئے خوش پوش لوگوں کے بڑے سونوں پرنگا دھڑکی بھٹی اور مجھے احساس ہوا
 تھا کہ میں خود بھی ایک اوسط درجے کے سوٹ میں ملبوس ہوں اس لئے اپنے
 اور دوسروں کے سوٹوں کی لالچ اسی بات میں بھٹی کہ پیکٹ کسی مزدور کو تھا دیا
 جاتے۔ اور دگرنگا، دوڑائی مگر کوئی مزدور نہ تھا شخص نظر نہ آیا۔ آخر خود ہی پیکٹ
 اٹھا کر دائیں بائیں دیکھتا، کسی قدر جھینپتا ہوا چل پڑا، چند قدم کے فاصلے پر
 پیچھے سے ایک مسکین سی آواز آئی: ”ہم اٹھالے بولو صاب؟“

میں نے مڑ کر دیکھا: ”بولو صاب“ کہہ کے تنہی نکالنے والا یہ ایک انسی نا
 مزدور تھا جو شاید ابھی ابھی زمین کی تاریک تہوں سے نہیں بھڑٹا تھا۔ کینا کیس
 کے دھول میں اٹے ہوئے فلاکت زدہ چہرے پر جو نہیں سی مسکراہٹ کھیل رہی

مٹھی اس میں سادگی اور معصومیت کا ایسا اقتراح تھا جو کسی فرسودہ لوہے کے بشرے پر زندگی کی ہماہمی پہلی بار دیکھنے پر ابھر آتا ہے۔

وہ سامنے شہر جانے والی جو لوہے بس کھڑی ہے تا بس وہاں تک لے چلا اور یہ لوہے میں نے دس پیسے کا ایک سکہ نکال کر اس کی مٹھی میں تھما دیا۔ مزدور کا پسینہ نکلنے سے پہلے اس کی مزدوری چکا کر میں نے بہ زعم خود مزدور میں خود اعتمادی اور اعتبار کا لازمال جذبہ تخلیق کر دیا تھا۔

اس کا کیا جبروت تھا جو دھابہ اس نے بوسیدہ واسکٹ کی اندر جیب میں دس پیسے رکھتے ہوئے اس معمولی خاصے اور برائے نام بوجھ کا خیال کر کے شاید یہ بات کہی تھی لیکن مجھے اس میں اس کی نجابت اور شرافت کی ملک آتی۔ اس نے مسافروں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے بس کے اندر جا کر ایک سیٹ پر سیکٹ جما دیا۔ میں اُسی سیٹ پر بڑے اطمینان سے براجمان ہو گیا اور بس ڈولتی ناؤ کی طرح پچھلے کھاتی شہر کی طرف بڑھنے لگی۔

میں نے دیکھا، بس میں میرے قریب ہی کھڑا، مسکرا رہا تھا۔ مجھے حیرت تو ہوئی لیکن میں نے اپنے ساتھ والے آدمی کو کسی قدر دھکیل کر اس کے لئے جگہ بنا چاہی، مگر وہ جیسے اطمینان کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔

”تم اترے نہیں؟“ میں نے اس کی سادہ مگر پراسرار سی مسکراہٹ کا پس منظر بھانپنے کے لئے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

دھول کی تھوں کے نیچے اس کے پر مردہ رخساروں کے کھوں میں زندگی جنبش ہوئی اور اس کی شریانوں میں خون کی گردش نے لمحوں کے لئے تمام سی

سرخ چمک دوڑا دی "بس جی ہم بھی شہر جاتیں گا۔" اُس نے پھر تیسری نکال دی۔
 "کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے اُس کی فات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔
 "رسل جو" ایک بے مقصد سی احمقانہ ہنسی کے درمیان اُس نے جواب دیا۔
 بس کنڈیکٹر ایک کونے میں کھڑا گھٹ کے لئے ہانک لگا رہا تھا۔ وہ قریب
 سے گزرا تو چپکے سے میں نے شہر کے دو گھٹ لے لئے۔ اس خیال سے کہ جب
 رسل جو کو معلوم ہوگا تو وہ حیران ہوگا لیکن وہ حیران نہیں ہوا بلکہ اس انگشت
 پر عجیب مہنویت اور احسان مندی کے جذبات سے لبریز آنکھوں سے میری
 جانب دیکھنے لگا۔ جیسے میں نے اس کا سات پیسے کا ٹکٹ خریدا کہ اس پر بہت
 بڑے احسان کا بوجھ لا دیا ہو۔ اس بوجھ سے اس کی کمر تو نہیں مگراؤں گا دل
 کسی قدر ضرور جھک گیا۔

میں راجہ بانہار میں بس سے اتر پڑا۔ یہ اس لوکل بس کا آخری اسٹاپ تھا
 میں کتابوں کا بنڈل بغل میں داب کرناٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ چند قدم چلنے کے بعد
 معاً میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ ایک موہوم سے تجسس آئیز
 خوف نے میرے لاشعور کے پردوں پر سرسرا نا شروع کر دیا۔ بس پر چڑھتے اور
 اُترتے وقت جیب کترے جو ہاتھوں کی صفائی دکھاتے ہیں، اُن کے تذکرے
 اُس جگہ تھا۔ پھر چوداچکوں کو مسافروں کی جیبوں کو دوسرے جانچ کر اُن کا
 تعاقب کرنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ میں ٹھنکا اور میرا ایک ہاتھ خود بخود
 کوٹ کی اندرونی جیب میں بٹوے کو ٹٹلنے کے لئے سرک گیا۔ پھر اطمینان کی
 ایک ہلکی روشنی لہرنے معاً میرے چہرے کے نقوش کا احاطہ کر لیا۔ اس

اطمینان بخش لہر کے دوران میں سمجھا کرنے والے اس سائے کو دیکھنے کے لئے مڑا ہی تھا کہ وہ اچک کر اچانک میرے سامنے آگیا اور میلے میلے پیلے دانت نکالتے ہوئے میرے ہاتھ سے کتابوں کا بندل چھیننے لگا۔ مجھے اس کے روئیے پر کسی قدر شک گزرا اور صحنہ بھٹ بھی ہوئی۔ چھوڑ دو بھئی۔ کی تم مسافر کا سامان زبردستی اٹھاتے ہو؟

رسل جو میرے سوالوں کا جواب دیتے بغیر کتابوں کا بندل اپنے پوڑے شانوں پر جا چکا تھا۔ تم کس طریقہ پر جاتیں گا بو صاب؟ مجھے اُس کے لہجے میں غمزہ انگسار کی گھلاوٹ محسوس ہوئی۔

”میں تو جامع مسجد کی طرف جاؤں گا۔ لیکن بندۂ خدا تم کس سمت کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”ہم بھی جمہوریت کی طرف جاتی ہو یونی“

سوچا عجیب جنگلی اور دیوانے مزدور سے پالا پڑا ہے۔ ایسے دیوانے سے جو اپنے مطلب کے لئے تو ہوشیار ہے۔ اس نے سوچا ہے کہ چلو اپنے گھر کی طرف جاتے جاتے ساتھ شریعے اور اس شخص سے ہتھیانو۔ لیکن مجھے بھی پتی مگرہ کا پکا بنا پڑے گا۔ میں بھی اس زبردستی کے مزدور کو ایک انٹینی سینیٹو ایک عیسے بھی نہیں دوں گا۔

یوں تو یہ پکیٹ شہر کے جامع مسجد میں خود ہی اٹھا کر لے جاسکتا تھا کیونکہ یہاں مال روڈ کی طرح کسی ایسے خوش پوش نوجوان کے ملنے کی توقع نہ تھی جو ایک وقت میرے سامان اور ثانی پر استہزائیہ نگاہیں ڈال سکے

لیکن رسلِ مجوا ایسے لوگوں کی پیٹ کی آگ کے لئے ایندھن دیا کرنا بھی تو ہم ایسے سفید پوش انسانوں کا فرض ہے۔

”پیٹ کی آگ کے لئے دلی بھر کام کر کے کتنا ایندھن اکٹھا کر لیتے ہو؟“ میں نے قدسے مزاحیہ انداز میں اُس سے پوچھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ میرا مطلب سمجھ جائے گا، مگر اُس نے اپنی مخصوص عاجزانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری سمت دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا: ”ہم اُدھر صبح سے شام تک دھیانِ ڈاڑھی پر کوم کرتی ٹھیکیدار اچھٹا آدمی نہیں ہوتی۔ جبینہ میں دو چار دھیانِ ڈی کھا کھجا کاٹ لیتی۔۔۔۔۔“ اس کا جی ٹھیکیدار کو موٹی مٹی گالی دینے کو چاہا اور گالی کا ایک حرف اُس کی زبان پر اُکرا نکلا گیا۔

”کہاں کے رہنے والے ہو؟“ میں اس کی دلچسپ شخصیت کی تمہوں میں اُترنے کی کوشش کرنے لگا۔

”کثیر کا بوہ صاحب؟“ وہ تشکر آمیز نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا: ”سو پور میں ہمارا جدی پشتی مکان ہوتی۔ ہم بال بچہ کے ساتھ اب اُدھر پنجاب میں سر چھپاتی۔ اُدھر کا پھوجی لوکھ لڑائی میں ہمارا کھیت اور گھر بار جلا دی۔ گریب کے لئے بوہوینی اس جبینہ پر کوئی جگہ نہیں ہوتی؟“

اُس کے افلاس زدہ چہرہ پر مسکراہٹ کی جگہ یکایک نفرت ابھر آئی۔ نہ جانے یہ نفرت ظلم کے خلاف تھی یا اُس کی اپنی ذات کے خلاف۔

چلتے چلتے یکایک وہ رُک گیا۔ کچھ سوچتا ہوا سا۔ مجھے اس وقت دو ایک

اچھا خاصا فلسفی لگ رہا تھا جس نے گردش حالات کے تحت یا محض زندگی کے تلخ حقائق اور خیالات کی ریل پیل سے اکتا کر محنت مزدوری میں پناہ لی ہو۔
 ”محنت مزدوری کر کے کتنا کچھ روز کمایا کرتے ہو تم؟“ میں نے سہمہ دانہ لیجے
 میں اُس سے پوچھا۔

”دو ڈھ دو روپیہ فی“ کبھی کبھی بارش ہوتی یا موسم خراب ہوتی تو مچھری
 نہیں ملتی۔ اس روز گھر میں چولہا نہیں جلتی۔ بس پرانا دازمہ اور ستور پر گزرتی
 ہم دیکھتے۔“

مسل جو بڑے خلوص کے ساتھ اپنے گھریلو حالات بتا رہا تھا مگر
 ہمارے حیرت سے پنجاب میں آجسے تک کی داستان اُس نے چند ہی جملوں
 میں مجھے سُنا ڈالی۔ میرے دل پر اس کی سادہ اور معصوم باتوں کا اتنا اثر ہوا کہ
 میں دُور تک انہی تصورات و احساسات میں غلطاں چلتا رہا۔

جامع مسجد کے قریب باہی راجہ بازار کے بڑے چوک میں مجھے ایک پرانا
 شاعر دوست مل گیا۔ جس نے اپنی نئی غزل سُنانے کے لئے مجھے زبردستی
 روک لیا غزل اُس کے قول کے مطابق نہی تھی مگر اس میں وہی عشق و محبت اور
 وصل و فراق کی گھسی پٹی داستانیں و مہرائی گئی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی
 گلو خلاصی کے لئے اس کی دوسری نئی غزلیں سننے کے لئے طوقاؤ کرنا دوسرے
 دن کا وعدہ کر لیا۔ ذرا آگے بڑھ کر اچانک مجھے رسل جو کا خیال آیا۔ میں نے
 مڑ کر دیکھا۔ دوست تو مجھے نظر آ رہا تھا لیکن مزدور غائب تھا۔

اس احساس کے ساتھ ہی کہ اس بندل میں لائبریری کی چھ سات

سورہ کے کتابیں تھیں، میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے بدحواس سا ہو کر پیچھے کی طرف تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ دُور تک راجہ بازار کی پُردہ نقی شہراہ پہنچنا کاروباری انسانوں اور خریداروں کا ایک سیلابِ عظیم تھا۔ جس میں مجھے کہیں رُسلِ مجوکا کتابوں کے بندل میں چھپا ہوا سُرِ نظر نہ آیا۔ آخر وہی ہو کر ہا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ شام کا رنگ تھا ہوا سرد اندھیرا ایک دم انا دس کی حبیب رات میں بدل گیا۔ اُس کی برف آلود گھرائیوں میں اپنے آپ کو ڈوبتا ہوا اُردو ہوا محسوس کرنے لگا۔ دل ہی دل میں ہر کس و نا کس پر اعتبار کر لینے کی عادت پر افسوس بھی اُبھرا۔ رُسلِ مجوکا تو غائب ہو چکا تھا لیکن اس کا سادہ بڑیا اور محسوم سا چہرہ ابھی تک میری آنکھوں تلے گھوم رہا تھا۔ سچ ہے لوگوں کے ظاہر اور باطن میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ میں اپنی انسانی دوستی کی کرناک شکست کے متعلق سوچتا ہوا، انتہائی گہیدہ خاطر کی عالم میں گھر کی طرف چل دیا۔

میں ان قسمی کتابوں کے زیاں پر دل ہی دل میں بیچ و تاب کھاتا مشغولِ فکروں سے دانتیں باتیں دیکھتا اور ان مادّے بڑھنے لگا۔ اب اُسے کہاں رُحوں توں؟ کہاں جاتوں؟ کیا تھا نے میں دہشت کھوا دوں؟ پھر خیال آیا کہ جہاں اپنے دست سے مصافحہ کر کے چند لمحوں کے لئے کھڑا ہوا تھا اور اس نے ناز و غزل سنا سنا شروع کر دی تھی۔ شاید وہیں کہیں کسی خطّے کی ادب میں وہ چور و بجا بیٹھا ہو بھاگا بھاگا اُدھر گیا۔

زندگی اسی طرح رواں دواں تھی۔ کسی کے سورہ زیاں سے بے نیاز ہو کر۔

شام کے گئے اندھیرے میں رہتے ہوئے کاروباری لوگوں کے دیسے دیسے شور
پر یکھوں کی جھنجھٹا ہٹ کا گناہن مہم تھا۔ دکانیں بجلی کے تقوں سے بقتہ نور
بنی تھیں لیکن میرا دل نا امید ہی اور احساس زیاں سے گھبراندہ صیادوں میں
ڈوب رہا تھا۔ وہ رہ کر رسل جو کا معصوم اور مجھلا سا چہرہ نظروں تلے میری
بدنسی کی علامت بن کر گھوم رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ہی تو میرے اعتماد کو
کسی کی پراسر شخصیت سے ٹھیس پہنچی تھی اور میں پہلی بار نظریاتی شکست کی ایسا
تلخ کیفیت سے دوچار ہوا تھا جو کسی لحاظ سے بھی زہر مہرے جام کی تلخی سے
کم نہ تھی۔

رسل جو کہیں نظر نہ آیا تو میں مایوسیوں اور افسردگیوں کے اندھیروں میں
محسوس ہو کر گھر کے راستے پر چلایا۔ پھر گھر کے نزدیک پہنچ گیا۔ سامنے بجلی کی
روشنیوں میں جامع مسجد کے سپید پتھری گنبد اللہ منقش دند دیوار نظر آ رہے تھے۔
مسجد کا بلند وشنی مینار وحدت الوجود کا اظہار کر رہا تھا اور مؤذن اللہ کی ثنائی کا
اعلان کر رہا تھا۔

”اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔“

لیکن — میں نے سوچا۔ انسان بہت چوٹا ہے۔ انسان بہت نیچ
ہے۔ وہ اپنے گھر میں آسودگی کا چھاغ روشن کرنے کے لئے دوسروں کے دیسے
بجھا دیتا ہے۔ وہ تو اللہ ہی کا نائب اور اس کا وجود معنوی ہے۔ پھر اس نے
اپنی جڑائی اللہ عظمت کو کیوں دنیا کے ہذا میں نظام پر اٹھا دیا ہے؟
میں چند لوگوں کے لئے پلٹ کر کھڑا ہو گیا اور بازار کی طرف دائرہ اوڑھنے لگا

معا جیسے محسوس ہوا جیسے بازار کے اس شور و ہنگامے میں کوئی جیسے پکارتا ہے
آواز مانوس سی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو فریڈا مسرت سے میری باپچیں کھیل گئیں۔
”بو بوبی! تم عجیب آدمی ہوتی۔ ہم ادھر سارا شرک پر تم کو دیکھتی پر تم نظر نہ آتی
۔۔۔ تمہارا ٹھکانہ معلوم ہوتی بو بوبی تو سامان ہم گھر پہنچا دیتی۔“

میں چند لمحوں تک حیران کھڑا اسے سر سے پاؤں تک دیکھتا ہوا پھر میری
رسل جو کو خوشی سے سینے کے ساتھ چمٹا لیے کو چاہا۔ میں نے اس سے رو نہی
تجسس کی خاطر بوجھا ”تم یہاں مسجد میں کیا کر رہے تھے۔ کیا منہ اڑھنے چلے
گئے تھے؟“

”ناہیں بو بوبو صاحب! ہم نماز پڑھنے نہیں جاتی۔“ اس نے حسبِ عادت
پھر بیسی نکال دی۔ ہم تو ادھر سے مصریوں پر بیٹھا تھا ہارا انتظار کرتی تھی۔ ہم نے بولانا
بو بوبو کہ تم جلد مصیبت کے پاس رہتی۔“

میں رسل جو کو ساتھ لے کر مسجد کے سامنے والی گلی میں مڑ گیا۔ دروازے پر
دشک دیتے ہوئے میں نے سوچا کہ کل جب میں اپنے دوست شاعر سے ملوں گا
تو مریت اور لحاظ کو بلائے طاق رکھ کر اسے کہوں گا کہ وہ زندگی کے بارے میں
کھٹکھٹ کرے۔ اس کی لفظ قوتوں، اس کی کثافتوں اور اس کی صداقتوں کے بارے
میں۔ اپنی بے نیکی شاعری اور بے وقت کی راگنی کو چھوڑ کر اس کو ہستانی مزدوروں کے
مستحق کوئی عہد آفریں نظم لکھے۔ اس کی دیانت، اس کی مصمصیت بھٹا کشی اور
محنت کی عظمت کے سامنے اپنا سرنگوں کر دے۔ اس لازوال انسانیت کے بارے
میں کچھ لکھے جو لکینوں کے سائے میں بھی زندہ و تابندہ رہتی ہے اور ٹٹ لٹا کر

دہلی سے دور اگر لوٹ کھسوٹ کے شکار معاشرے میں غربت کے دہ گزرنے پر بھی فٹا نہیں ہوتی۔

ماں نے دھاندلہ کھول کر ایک نظر جیتھڑوں میں پٹے انسان پر ڈالی اور جاکر مصلے پر بیٹھ گئی۔ تسبیح کے مانوں کو روکتے ہوئے اس کا سپید بالوں والا سر نامعلوم انداز میں برابر ہٹا رہا۔

میں نے کتابوں کا ہینڈل رسل جو کے ہاتھ سے لے کر تپائی پر رکھ لیا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے گم سپاٹ چہرے پر بڑی معنی خیز قسم کی ایک مقدس سی چمک مسکراہٹ کا ادب دھار کر کچھ گھٹی اور اس نے فحی کے انداز میں گردن ہلادی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی ڈیڑھی ہوئی اور میں نے سہرا آنے اور شامل کر کے رقم اس کی بخشش ہوئی واسکٹ کی اوپری جیب میں ڈال دی۔ وہ یہ رقم اپنی جیب سے نکال کر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا اور میں خفگی میں پیچھے ہٹ گیا۔

”ہم یہ ناچیں میں گا۔“ اور منہ لایا۔

”عجیب انسان ہے۔“ میں بڑبڑایا۔ کیا یہ کم ہیں؟ لیکن میں اب ایک میا بھی اور نہیں دوں گا۔ میری متانت بھری آواز کی کڑیاں تھکناہ انداز سے جھلکیں۔ وہ حسبِ عادت مسکرا دیا۔

ماں اس دوران مصلیٰ الپٹ کراٹھ چکی تھی۔ رسل جو نے سوا روپایا کتابوں کے ہینڈل کے پاس تپائی پر رکھ دیا تو ماں نے جھنجھلا کر کہا: ”نہیں لیتا تو نہ لے تھیں کیا پتا میٹھے؟ ان مزدوروں کی تنگیوں میں ہزاروں روپیہ جمع ہوتا ہے۔“ تسبیح کے

وانوں کو جلدی جلدی گھماتے ہوئے ماں نے اکٹھا کیا۔

پھر بھی مجھے ریل جو کی حالت زار پر ترس آ گیا۔ اچھا تو تم ڈیرھ دو پالے بغیر نہیں ٹلو گے۔ میں بڑی مستعدی کے ساتھ حجب سے چوٹی نکالتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

لیکن وہ اپنی اسی مسکراہٹ کے ساتھ معاکرے سے باہر نکلے ہوئے بلا "ناہیں بوبو بی! یہ بات ناہیں ہوتی۔ جب تم گریب کے ساتھ اتنا صربانی سے پیش آتی۔ اتنا اچھا سو لو کہ کرتی۔ تو ہم بھی ایسا ناہیں کریں گا۔ ہم پونہ گز ناہیں لیں گے۔"

میں وہ ڈیرھ دو پالے کراس کے پیچھے تقریباً دوڑ پڑا لیکن وہ بڑی پھوٹی کے ساتھ رات کی سیاہیوں کو اُجھاتا ہوا، لگی کے موڑ پر غائب ہو گیا۔ میرے سر کبھی اُدا نہ ہو سکے والا قرض چھوڑ کر۔

”فنون“ لاہور

مس عاصمہ حبیب

جس دن لمبے بالوں والی نامکمل سی عاصمہ حبیب کالج میں داخل ہونے آئی تھی۔ تو ایسے لگا جیسے کالج کے لمبے برآمدوں میں کوئی نسخی سی چڑیا چھدک آئی ہے۔ وہ اتنی چھوٹی اور دبلی تھی کہ اُس کے انسان ہونے پر مشکل یقین آتا تھا۔ پر خبر نہیں کیا بات تھی پہلے دن ہی سارا کالج اس سے مرعوب ہوا جاتا تھا۔ انتہائی خوب صورت ہنس مکھ والی حقیر حقیر سی عاصمہ حبیب کو دیکھ کر خوشی اور مہر وادی کے جذبات بیک وقت اُبھرے پڑتے تھے۔ لگتا تھا خدا نے اپنا سارا کام بس گروں کے اوپر ہی اوپر کیا ہے۔ اس کا خوبصورت چہرہ اس کے حقیر بدن پر ڈیکوریشن میں لگتا تھا جیسے مٹی کے گونے چھوٹے گنجان میں تازہ اور خوبصورت پتھروں کا لگہ رستہ۔ نہ بدن پر کوئی بوٹی نہ کمر میں کوئی ٹھیک انیسوائٹ کے سارے آٹا میٹھے میٹھے اور چھٹے چھٹے۔ پر خبر نہیں کالج بھر کے لوگوں کو اس بے کس سی عاصمہ حبیب میں کیا نظر آتا کہ سارا دن مکھڑوں کی طرح اس پر بھنٹاتے اور بھرے بھرے بدنوں والی لڑکیاں یہ سب کچھ لکھتے

اور عورت سے دیکھتیں۔ یہ تو دوسرے تیسرے روز ہی پتا چل گیا کہ یہ نفی سی چڑیا بڑی ذہین ہے۔ ہر بات کا ایسا فر فر جواب کہ پروفیسر نیاں بغلیں جھانکنے لگتیں۔ بعض لڑکیاں تو اسے کوئی ماندائی مخلوق سمجھ کر گھٹتوں تاکتیں۔ لیکن آہستہ آہستہ جب اس کے سارے لپٹن ان کے سامنے آئے تو لڑکیاں اس سے شدید نفرت کرنے لگیں بعض اسے قابلِ دم سمجھ کر نظر انداز کر دیتیں، لیکن بہر حال جو کچھ بھی بھتا عاصمہ حبیب کالی ہوا ایک ایسا نقطہ مرکزی بن کر رہ گئی تھی جس کے گرد کالج کا ہر وجود گھومتا تھا۔ وہ میری روم میٹ تھی اور آج بھی اسی طرح یاد ہے اس نے کبھی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیا تھا، ہر ایک سے اتنے مجاز دار نکلا سے بولتی کہ دوسرا کچھ کچھ جاتا تھا۔ کوئی لڑکی بیمار ہوتی تو عاصمہ حبیب سب سے پہلے پہنچتی جس دن نمازِ فاطمہ کی ماں کی موت کی خبر آئی تھی عاصمہ ناز کے ساتھ گرات اس کے شہر گئی تھی اور سوڑ ویہ بھی اس کی چھوٹی بہن کو دے آئی تھی۔ جسے جنم دے کر اس کی ماں فوت ہوئی تھی اور وہ بچک ڈسے میں اکیلی پڑی بد رہی تھی۔ دس بیس تو کتنی ہی لڑکیاں روزانہ قرض لے لیتی تھیں لیکن عاصمہ نے کہیں اُن کا نام بھی یاد نہ رکھا۔ ٹک شاپ پر بھی کتنی ہی لڑکیاں اس کے نام پر کھانے لگتیں۔ اور اگر میں کبھی ان باتوں کی طرف اس کی توجہ مبذول کراتی تو ہمیشہ ہنس کر یہ کہہ دیتی: پھوٹو دیا اور بہت سی باتیں توجہ کے قابل ہیں۔ کھانے دو انہیں۔ خوشی بہت ہنگی چیز ہے بدست۔ اور اگر انہیں اس طرح خوشی ملتی ہے تو بخدا میں بہت خوش ہوں؟ وہ ہمیشہ ایسی باتوں سے مجھے لاجواب کر دیتی تھی۔ ہر دیکھنے والے کو عاصمہ حبیب سے شدید نفرت کے ساتھ شدید عبت

ہو جایا کرتی تھی۔ امد میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ مجھے اُس کے بارے میں جو جوباتیں معلوم ہوتیں امد میں نے خود جو کچھ دیکھا میرے دل میں اس کے لئے بے حساب نفرت تھی مگر معلوم نہیں کیا بات تھی میں سوچتی اگر مجھے عاصمہ حبیب کے کمرے سے نکال دیا گیا تو میں بے سانس ہو کر رہ جاؤں گی۔ میں ایک لمحہ بھی نہ جی سکوں گی۔ اپنے اند کے ان جذبات کا تو مجھے اس روز پتا چلا جس روز عاصمہ نے رات کو مجھے چاقو مار کر زخمی کر دیا تھا، لیکن جب لوگوں نے مجھے دوسرے کمرے میں شفٹ کرنے کے لئے میلا سامان اٹھوایا تو میں نے چیخ کر اُن کو یہ ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ عاصمہ رات کو ہمیشہ صرف اند دینے پہنے رنگ دھڑنگ سیا کرتی تھی۔ روز روز کا یہ معمول میری برداشت سے باہر ہو گیا، کیونکہ اسے اس حالت میں دیکھ کر میں ذہنی طور پر اس قصد پریشان ہو جاتی تھی کہ ڈھنگ سے پڑھائی نہ ہو پائی تھی۔ اگلی صبح میرا رُوحہ تھا۔ عاصمہ اس حالت میں میرے ساتھ کسی پرانے کپڑے لپیٹ کر لے گئی۔ میرا ذہن چکرانے لگا کیونکہ اس سے پہلے وہ کم از کم میرے قریب آ کر یوں بے تحاشی سے نہ بیٹھتی تھی۔ بات ناقابل برداشت تھی۔ میں نے سختی سے کہہ دیا کہ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھ سے پڑھائی نہیں ہوتی۔ میں سوچ بگو نہیں سکتی تھی، عاصمہ اس بات کو اتنا محسوس کر لے گی وہ تیزی سے اُٹھی، اُٹھی سے چا تو نکالا اند چٹخنے چڑھا کر کہہ، ٹوٹ پڑی بھرت امد غم سے میوہا حلق خشک ہو گیا وہ تو شکر ٹہرا بات خورم کا پچھلا دروازہ کھلا تھا۔ لڑکیاں عاصمہ کی چیخ و بکار پر ماندہ دوڑائیں (وہ صفحے کے قوت ہمیشہ روز روز ہر صبح جیتی تھی) اند اس طرز میری جان بچ گئی۔ میری وہ انگلیاں

شدید زخمی ہو گئیں۔ بات وارڈن تک نہ پہنچ سکی۔ کیونکہ عاصمہ نے دوسرے ہی لمحے دو دو کر کچھ اس افسانے سے مجھے سے معافی مانگ لی کہ اُنہیں اپنے آپ کو بھروسہ کچھ لگی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ حاضر حسیب کے متعلق روزِ فدا سی ایسی باتیں سننے میں آئیں کہ میرا ذہن تو اڑھ بگڑنے لگا گیا۔ اُس کا دن رات ہسٹلوں اور کھیتوں میں گزرتا اور صبح کا لہجہ میں آکر لڑکے ایک دوسرے کو بتاتے۔ یار اپنا آپ دینے میں بڑی سخی ہے۔ رات تو جی بھر دیا عاصمہ نے۔ کالج کا ہر فرد بشریہ بائیں سُستا اور میں کڑوا کر مٹھ کر مڑنے کو آجاتی پھلک ماندی وہ مات کو ہسٹل کی دیوار بچاند کر آتی اور ساری رات کراہتی رہتی صبح چلے پر ہٹنگ خراب اُس کی آنکھوں میں آہری رہتی۔ رات کو کبھی کبھی وہ اتنے زور سے کراہتی کہ لڑکیاں گھٹٹوں کتابیں سامنے رکھے بیٹا دیکھتی رہتی ہیں اور ایک دن جب لڑکیاں چل کر وارڈن کے پاس یہ ساری بات پہنچانے گئیں تو وارڈن نے آگ بگولا ہونے کی بجائے جھجے جھجے میں کہا ہر ایک کا اپنے اپنا کیریئر ہوتا ہے تمہیں اس کی کراہٹوں یا آواز گویوں پر ہاتھ ڈالنے کی کس نے اجازت دی ہے۔ تم جاسکتی ہو اور لڑکیاں بڑبڑاتی لڑکھڑاتی واپس آگئیں۔ ہسٹل اور کالج کا کوئی قانون اور ضابطہ اسے قابو میں نہ کر سکتا تھا۔ لڑکیاں صاف صاف کہتی تھیں کہ وارڈن عاصمہ حسیب کی آواز گویوں پر پردہ پوشی کر کے اُسے بر باد یوں کے کنارے پر پہنچا رہی ہے اور جب یہی جھنگ وارڈن کے کانوں تک پہنچی تو اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ یہ لڑکی بہت جلد مرنے والی ہے اور ہم اسے زیادہ دیر تک زندہ رکھ کر خوار نہیں کرنا چاہتے۔ اگر کوئی لڑکی اس پر فقرہ کس دیتی تو وہ بھرے کالج میں آنکھ مار کر کہہ دیتی۔ یادوں کے اُٹھو اُڑوں

گی۔ سمجھیں۔ اور لڑکیاں ساری بات سمجھ کر جلدی سے کھسک جاتیں۔
 عاصمہ کے خلاف شکایات کا ایک انبار پرنسپل تک پہنچ چکا تھا اور وہ بھی سرنوٹش
 کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھی۔ لیکن اسی دنوں پر موشن ٹیٹ میں
 عاصمہ حبیب نے ساری کلاس کو شکست دے کر ساری پرنسپل کو ہچککا دیا۔
 عاصمہ کا پرچہ حیرت انگیز حد تک عمدہ تھا۔ اور اس طرح عاصمہ کے خلاف شکایات
 کا دفتر ایک بار پھر مقلد کر دیا گیا۔ اور عاصمہ کی سرگرمیاں پھر تیز ہو گئیں۔ اب
 ایک نیا جنون شروع ہوا تھا۔ وہ ہر روز شام سوئنگ کاسیٹوں کا غنچہ پر ڈالے
 نیشنل ہوٹل کے سوئنگ پول میں نہانے جاتی اور ساتے میں کسی بھی گاڑی والے
 سے کہتی۔ اے۔ ڈیر ہیں نیشنل ہوٹل تک چھوڑ دو۔ ٹیکسی نہیں ملی رہی۔ اور ٹیکس
 کر کار میں بیٹھ جاتی۔ کاہنالا کوئی پسند آجاتا تو دوستی کر لی جاتی، نہیں تو اترتے تو
 وہ ٹیکس کا دھکا کریوں بے نیازی سے گاڑی سے اتر جاتی جیسے کرایہ ادا کر دیا ہو۔
 سچ جی ہوں عاصمہ حبیب کو کوئی بچلا سکتا ہے۔ اور آج جب میری بڑی بیٹی چلتی
 مجھے آکر بتایا کہ پرنسپل مس خان نے کالج کے مٹی پر پڑھل کا نام دہمہ حبیب ہال رکھ دیا
 ہے تو میں صدمہ رہی ہوں عاصمہ حبیب نے کونسا بڑا کام کیا ہے، وہ تو کالج کا
 ڈبوں میں مرفر دست تھی۔ پھر یہ اچانک مس خان نے کیا کر ڈالا ہے لیکن سوچتی
 ہوں اس مٹی پھیر مٹی نے ضرور کوئی بڑا کام کیا ہو گا۔ مجھے ملے تو اسے بیس سال
 ہو گئے ہیں، خبر نہیں عاصمہ حبیب نے ان بیس سالوں میں زمانے بھر کیا کیا ستم
 توڑے ہوں گے۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ عاصمہ حبیب نے ایک شام بڑی پریشانی
 میں مجھے بتایا تھا کہ کل چائینز ہوٹل میں مس خان نے مجھے سعید چاؤلہ کے ساتھ

حال میں دیکھا کہ اس کا ایک ہاتھ میری کمر میں تھا اور دوسرا ہاتھ میری ران پر تھا۔ عاصم حبیب نے یہ ساری بات اتنے ہلکے ہلکے ہو کر بتادی کہ چند لمحوں تک میری قوت گویائی ختم ہو کر رہ گئی۔ لیکن یہ ساری بات مجھے بتا کر یوں ہلکی ہو کر چلی جاتی مگر یہ سدا نے بیٹھ گئی جیسے یہ سارا جرم میں نے کیا ہے اور دوسرے دن کا وہ طوفان بھی مجھے یاد ہے کہ میں خان نے ہال میں تمام ڈاکوں اور ڈکریوں کے سامنے آگ بگولا ہو کر عاصم حبیب کو ڈانٹا تھا۔ اور عاصم نے میں خان کو جو جواب دیا وہ کالٹی کی تاریخ کا سب سے پہلا اور شاید آخری حادثہ تھا جس نے خان کی ڈانٹ کے جواب میں عاصم حبیب بڑے سکون سے اٹھی تھی اور بڑی گستاخی سے کہا تھا۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں اپنے ذاتی معاملات میں آپ کو تو کیا خدا کو بھی دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ کو مجھے روکنے کا کوئی حق نہیں اور یہ کہہ کر عاصم حبیب خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی اور میں نے دیکھا میں خان اس وقت کچھ اس انداز سے مسکراتی تھیں جس کو کبھی بھی کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ مسکرا کر اور دل ریز کمزور سا ہمارا لے کر بیٹھ گئی تھیں۔ ہال میں موجود ہر ذی روح نے سانس روک لی تھی۔ لگتا تھا جیسے ساری کائنات میں سب کچھ مر گیا ہے۔ اور کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اور ایک دن میں خان نے مجھے دفتر میں بلوا کر عاصم حبیب کے والدین کے نام ایک خط لکھوایا۔ جس میں اس کی ساری کامستانیوں کی مختصر روداد تھی۔ یہ سب کچھ لکھتے وقت میرے ہاتھ لپکا رہے تھے اور میں سچ رہی تھی میں خان کا یہ خط عاصم کے والدین پر کیسے بھاری اترے گا۔ اور وہ جواب میں شاید عاصم حبیب کو اس تعلیم سے بھی محروم کر دیا

جس میں اس کا مستقبل اب بھی چاند کی طرح روشنی نظر آ رہا ہے۔ میں خانیہ خط مجھ سے لکھا کہ شاید عامر حبیب کو بھی مطلع کرنا چاہتی تھیں۔ وہ میری روم میٹ تھی اور میں خانیہ کا خیال تھا۔ میں اس خط کا ذکر ضرور عامر حبیب سے کروں گی۔ میں نے تو ذکر کیا یا نہ کیا بہر حال مجھے یاد ہے پانچویں روز عامر حبیب کے باپ کا آگیا تھا جسے میں خانیہ نے مجھے اور عامر حبیب کو چڑھ کر سنایا عامر کے باپ نے لکھا تھا "عامر اپنے قول و فعل کی خود مالک ہے اور اگر وہ یہی کچھ چاہتی ہے جو وہ کر رہی ہے تو ہم اُسے روکنا نہیں چاہتے اور نہ ہی آپ کو اُسے روکنے کی اجازت دیتے ہیں۔" اس سے آگے کی سطور مجھے یاد نہیں بس اتنا یاد ہے اس وقت میں خانیہ زور سے مسلسل اپنی کینٹھ پر نیسل بجا رہی تھیں۔ اور میں سوچ رہی تھی۔ عامر حبیب اُس ملک کا سب سے اہم اور سب سے دلچسپ نفسیاتی کیس ہے۔ میں خانیہ کے کہنے پر دوسرے دن عامر حبیب کا نفسیاتی کیس سوشل ورک فورٹھ ایر کی دو لڑکیوں شوکت اور ثریا اجمل کے سپرد کر دیا گیا۔ شوکت اور ثریا اجمل اب سائے کی طرح عامر کے ارد گرد اس انداز سے منہ لاتی رہیں کہ اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ ثریا اجمل نے تو اپنی تحقیق میں عامر حبیب کی سات پشتمی کھانگا ڈالیں لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ثریا اجمل اپنی رپورٹ کی تیاری میں اتنی اچانک عامر کے قریب آ گئی کہ کوئی یقین نہ کر سکتا تھا وہ عامر حبیب کا ہاتھ تھا۔ اسی کی روشنیوں پر اتنی تیزی اور اتنی خوبصورتی سے کود آتی تھی کہ خود عامر کو بھی یہ قلعی احساس نہ ہو سکا کہ اس کے ساتھ نیشنل ہوٹل کے سوئنگ پول میں نہانے والی ثریا اجمل دراصل اس کے اندر کی خواہی کر رہی ہے اور رات کو چائیر ہوٹل

میں اس کے ساتھ کھانا کھانے والی ثریا اجل وہ سب کچھ دیکھنا چاہتی ہے جو عاصمہ ہوشل اور کالجی میں نہیں دکھا سکتی تھی۔ یہاں سعید چاولہ، عابدیہ انجم اور اس طرح کے دوسرے دوستوں کے ساتھ وہ جو کچھ کر سکتی تھی۔ وہ وہاں تو نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ عاصمہ حبیب کو اندر باہر سے نگار دیکھنے کے لئے ثریا اجل اس کی خلوت اور جلوت میں سایہ بن کر گھس گئی تھی۔ عاصمہ بھی ایک دوست پا کر خوش تھی۔ ادھی تو وہ باتیں تھیں جو اسے عزیز بنائے ہوئے تھیں۔ میں سمجھتی تھی عاصمہ ثریا اجل کے ساتھ رہ کر اپنی روم میٹ کے آداب اور دھکے سب کچھ بھول جائے گی۔ اور اگر وہ ایسا کر لیتی تو میں اسے ایک عام سی لڑکی سمجھ کر بھول بھی جاتی۔ لیکن اس نے کبھی بھی میری توقعات کے مطابق کوئی بھی کام تو نہیں کیا تھا۔ میں چاہتی تھی وہ مجھے ثریا اجل کے سامنے نظر انداز کر دے اور قطعاً سبلا دے کہ میرا اور اس کا ساتھ ایک ہی کمرے میں بہت دیر سے ہے اور یہ کہ ہم دو اصل ایک دوسرے کی بہت عزت کرتی ہیں اور وہ تمام آداب نجاتی ہیں جو دو انسان ساتھ رہنے کی وجہ سے نبھاتے ہیں۔ میں یہی سب کچھ چاہ کر عاصمہ حبیب کو اپنے دل و دماغ کے اندر عام کر دینا چاہتی تھی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس موقع پر بھی میرے اندر اسی مقام پر کھڑی رہی جو بہت اونچا تھا۔ اور جسے گرانے کے لئے میں ہر لمحہ کوشاں رہی۔ وہ ہر لمحہ ثریا اجل کے ساتھ رہتے ہوئے بھی میرے ساتھ تھی۔ میرے ساتھ احترام اور محبت کا وہی اظہار۔ میری ہلکی سی تکلیف پر جاگ جاگ کر میری خدمت، میری ضروریات کی پُرکمال۔ میرے جذبات کا احترام۔ اور پھر لڑائی کا بھی وہی شدید انداز جس

کی اتنا ہمیشہ کسی ملک چوٹ پر ہوتی۔ عاصم حبیب مجھے پورا ہی رخصی روٹوں پر نظر آتی جہاں میں اُسے قطعاً نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں سمجھتی تھی ثریا اہل اسے یقیناً اپنی راہوں پر لے جائے گی جہاں وہ مجھے الگ کھڑی نظر نہ آئے گی۔ وہ مجھے لوگوں کے ہجوم میں انہی کے انداز میں بالکل عام سی لگے گی۔ اور اس طرح میں اپنے اندر عظمت کے اس مینار کو گرانے میں کامیاب ہو جاؤں گی جس کے ہر انیٹ روڑے پر عاصم حبیب تھم جائے کھڑی تھئی۔ میں سمجھتی تھی ہم دونوں کے درمیان خرابیاں اہل کی یہ اچانک آمد میرے اندر نفرت کی وہ طاقت ضرور پیدا کر دے گی جس سے میں عاصم کو دھکا دے سکوں گی اور اس طرح میرے سینے پر پڑی وہ ہل کھسک جائے گی جس نے میری ساری طالب علمانہ زندگی تکیہ کر رکھی تھی۔ سب یہ ساری باتیں کتنی ہلکی اور بے معنی لگتی ہیں۔ بیس سال کے ڈیڑھ ساڑھے دو تھوڑے عاصم حبیب کو پاؤں پکڑ کر میرے اندر سے فیر کر اتنی دیر بھینک دیا کہ وہ اس مرحلے میں مجھے کبھی یاد نہیں آئی۔ لیکن سوچتی ہوں آج وہ اتنی بے حساب یاد آئی ہے کہ مجھے لگتا ہے میں اب اس سالوں کے ہر لمحے میں اسے یاد کرتی رہی ہوں۔ صرف اسے۔ اور آج بھی اپنی شکست پر رو رہی ہوں۔ عاصم حبیب کبھی بھی میری دوست نہیں تھی۔ پھر میں نے زندگی کے ہر لمحے میں اسے کیوں یاد رکھا ہے۔ ثریا اہل تو چند دنوں کے لئے اس کے قریب آئی اور وہ سب کچھ پرچہ کر چکی تھی جو عاصم حبیب نے مجھے کبھی بھی نہ بتایا تھا۔ میں ننگی عاصم حبیب کے باہر کے خدو خال دیکھتی رہی اور الجھتی رہی۔ اور ثریا اہل تو اس کے اندر کرا آئی تھی۔ اس کے اندر اسب کچھ دیکھ آئی تھی۔ عاصم حبیب مجھے کتنی دیر دھکا

میں رکھے رہی تھی مجھے ہمیشہ دوست کتنی رہی۔ پھر یہ کیسی دوستی تھی۔ بہر حال شہیدان
نے عاصمہ کیس کی بڑی طویل اور بڑی دلچسپ رپورٹ پیش کی تھی اور اس میں وہ
باتیں بھی تھیں جو خود عاصمہ نے ثریا اہل کو بتائی تھیں۔ ثریا اہل کی رپورٹ کے
بعد پتہ چلا تھا کہ عاصمہ حبیب کی ماں کسی سیکرٹریس کی داشتہ تھی لیکن شہیدان
کے بعد وہ کراچی آباد ہو گئیں اور وہاں خیرات کی زندگی گزارنے کے لئے ایک محل
میں خانہ داری کا مضمون پڑھانے لگیں کیونکہ وہ کھانے پکانے میں بہت ماہر تھیں۔
بعد میں انہوں نے ایک معمولی ہوٹل کے مالک ایک شخص خدا بخش حبیب سے
شادی کر لی۔ یہیں کچھ عرصے بعد عاصمہ حبیب پیدا ہوئی۔ زندگی بڑی پرسکون اور
محبت سے بھری بھری گزر رہی تھی۔ لیکن عاصمہ ابھی تین سال کی بھی نہیں ہوئی
تھی کہ خدا بخش حبیب کو ممتاز بیگم کے ماضی کا پتہ چل گیا اور پھر باقی عرصہ کچھ یوں
گزر کہ خدا بخش حبیب انکارہ بن کر جے ممتاز بیگم کی محبت سینے اور خیرات کا
کوئی چھینٹا اس آگ کر بھجوا دیا۔ البتہ یہ تھا کہ خدا بخش ممتاز بیگم کو الگ بھی نہ
کرتے تھے گویا شدید نفرت کے ساتھ شدید محبت بھی تھی۔ عاصمہ اسی حالات
میں جوان ہوئی لیکن عاصمہ کی خیر جوانی بھی خدا بخش پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ عاصمہ
حبیب تو وہ تھی۔ جو وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ وہ ماں کو بٹے دیکھ کر باپ کو اتنی
خلیقا لایاں دیتیں کہ خدا بخش حبیب بچوں کی طرح چیخ مچھ کر اپنا گلا پھاڑتا۔
نخا سا وہ پرسکون گھر اب حشر کا میدان تھا جہاں ہر لمحہ دھینگا مٹتی۔ لایاں
ہوتیں۔ لیکن یہ دھینگا مٹتی صرف باپ بیٹی کے درمیان ہوتی۔ وہ دونوں بچوں کی
طرح ایک دوسرے کو نوچتے کھوٹتے کپڑے پھاڑتے اور ممتاز بیگم منہ پھوٹتے

کا پتھر رکھے زار و قطار روتی یا پھر ساری رات جاگ جاگ کر دونوں کی ذمہ داری اور
 جسمانی صحت و سلامتی کی دعا مانگتی۔ ایک دن عاصمہ نے بتایا تھا کہ اس نے
 اپنی کچھ سیلیوں کو کھانے پر مدعو کیا تھا لیکن جب وہ لوگ میز پر بیٹھے کھانا کھا
 رہے تھے تو میں اس وقت بابا آئے اور مجھے بلا وچکس کر منہ پر چانتا مار دیا
 غصے اور غم سے میرا وہ حال تھا کہ میں نے اندھا دھند لاٹوں اور کھوکھوں سے بابا
 کو مارنا شروع کر دیا۔ یہ مجھے خود بھی پتا نہیں اس وقت میرے اندر کہاں سے
 اتنی طاقت اٹھتی تھی۔ بابا نے بھی اُس دن مجھے بہت مارا تھا اور میرے سامنے
 کے دو دانت توڑ دیئے تھے اور پھر اُس دن کے بعد میرا ہاتھ کھل گیا۔ اب ہم بدو
 ایک دوسرے کو پٹیا کرتے تھے لیکن ان حالات میں اگر میں کبھی کسی سیلی کی جگہ پر
 پہنچ جاتی تھی تو بابا باؤلا ہو جاتا تھا وہ مات کو اٹھ اٹھ کر ویرانہ دار و دیوار سے
 نام کی چھنیں لگاتا میری ماں کے پاؤں پر کر میلاتا پوچھتا اور پھر دن کو میری ماں
 کو اتار دیتا کہ وہ سوئچ کر نیلی ہو جاتی۔ مجھ پر اُٹھ کر ٹپٹپاتا۔ جس دن عاصمہ حبیب
 گھر سے روٹ کر ہسپتال آئی تھی تو میں ماؤ تک باپ کو اپنا گھر نہ دیا تھا اور مجھے
 یاد ہے وہ باؤلی شکل کا خدا بخش حبیب جب عاصمہ کو کھوجتا ہوا ہسپتال آیا تھا اُو
 عاصمہ سے ملی تھی تو وہ پاگوں کی طرح پیچ پیچ کر عاصمہ حبیب کو پیار کر دیا تھا۔
 اُسے چھ سو روپے نقد دیئے اور اس نے اسی رات اپنے دوستوں کو کاک ٹیل پہنچا دی
 دے کر خرچ کر ڈالے تھے اور بچوں کی طرح خوش ہو کر گھر چلا گیا لیکن دوسرے دن
 جب وہ ہسپتال میں عاصمہ کو ملنے آیا تو اس نے ساری روکیوں کے سامنے اُسے
 اتنی گندی گندی گالیاں دیں کہ عاصمہ نے اسے دھکا دے کر ہسپتال کا گیٹ بند

کر دیا تھا اور وہ چھینا ہوا واپس چلا گیا تھا۔ باقی کا سارا وقت کچھ یوں گزرا کہ کبھی کبھی عاصمہ کے لئے مستحاثی کے ڈبے کپڑوں کے ڈھیر اور پھلوں کی ٹوکریاں لانا اور کبھی کبھی اُسے ساری لڑکیوں کے سامنے تھپڑ مار کر لگایاں دیتا ہوا چلا جاتا۔ اور اسی لئے عاصمہ نے اپنے اوقات کا زیادہ حصہ باہر گزارنا شروع کر دیا تھا۔ اور اگر کبھی کبھی وہ ہوسٹل میں موجود ہوتی بھی اور اس کا باپ اُسے منے بجاتا تو وہ کھلوا دیتی۔ ہوسٹل میں موجود نہیں۔ عاصمہ ہوسٹل کا انتہا پھسپ کر دار بن گئی تھی اگر عاصمہ حبیب اس ہوسٹل اور کالج سے چلی گئی تو اس کالج کے سارے سٹوڈنٹس سھوک ہڑتال کر دیں گے اور پڑھائی کو کھپ کر کے گھروں میں بیٹھ جائیں گے۔ تو ایک دن واقعی عاصمہ حبیب چلی گئی میرے کمرے سے میرے کالج سے اور میرے ہوسٹل سے۔ اور میں سوچتی تھی کہ کالج میں ہڑتال ہو جائے گی سٹوڈنٹس مرن برت رکھیں گے اور عاصمہ حبیب واپس آنے پر مجبور ہو جائے گی۔ واقعی یہ سب کچھ ہوا جس دن عاصمہ حبیب اچانک سفید پتھوں والی سفید کاری ڈگی میں اپنا سارا بھر کر چلی گئی تو لڑکیوں اور لڑکوں نے ہاتھ باندھ باندھ کر عاصمہ حبیب کو روکا اور رو کر اپنی آنکھیں پوچھیں اور ہوسٹل کے کھانوں کے میچے آٹ دینے لیکیں سب سے حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جب صبح کو وارڈن نے میں عاصمہ حبیب کے چلے جانے کی اطلاع دی تو میں خان نے وارڈن کو فوراً محفل کر کے سٹوڈنٹ کے ساتھ انتخابی ہمدردی کا اظہار کیا۔ دوسرے دن جب میں خان نے مجھے دفتر میں بلایا تو مجھے محسوس ہوا میرے اندر باہر اتنے آسوجھ ہو گئے ہیں کہ اگر میں خان نے ایک دفعہ بھی عاصمہ حبیب کا نام لیا تو میں گھپل جاؤں گی۔ باگل ہو جاؤں گی اور مجھے کوئی

بات بھی نہ ہو پائے گی میں خالی بھی کبھی سینہ دوسرے پر نہ تھیں۔ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں اُن کے رخسار انگارے ہو رہے تھے۔ وہ مجھ سے شاید عامر کے اچانک جانے کی وجہ پوچھنا چاہتی تھیں۔ لیکن اُن سے کچھ بھی نہ بولا گیا، وہ تھوڑی دیر تک میری طرف دیکھتی رہیں۔ اور میں سب کچھ سمجھنے ہوئے بھی کوئی جواب نہ دے سکی اور پھر اچانک ہی اُنہوں نے کہہ دیا۔ تم جاسکتی ہو۔ ذہن۔ لیکن اب سوچنا ہوں، میں خان کے لئے تو میرے پاس اس وقت بھی کوئی جواب نہیں تھا اور نہ آج کوئی جواب ہے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ عامر نے یورپ میں رسالوں سے عورتوں کی بہت ساری ننگی تصویریں کاٹ کاٹ کر اپنا کمرے کی چاروں دیواروں پر چسکا لگی تھیں۔ وہ رات کو ان تصویروں پر مدام تھ پھرتی پھرتی سو جاتی۔ میں اکثر دن کو دفتر پر احتیاط سے آتا رہتی تھی اور رات کو اس کے آنے سے نہوٹ پھرتے اسی طرح چکاتی تھی۔ اس طرح یہ بات وارڈن جیسے چھی رہی، لیکن میں نے روز روز کی اس تکلیف سے تنگ نہ آ کر تصویریں اُتارنا چھوڑ دیں۔ ویسے بھی اُن دنوں وارڈن کچھ بیمار تھی۔ اور اس کا راز نہ متوقع نہیں تھا۔ لیکن اُس رات اچانک وارڈن راز نہ پرانگی کرے کی ساری دیواریں ہلکنے لگیں دیکھ کر وارڈن کو غصہ آ گیا۔ لیکن وارڈن نے حسب معمول عامر حبیب کو کچھ کہنے کی بجائے تصویریں پھاڑ پھاڑ کر کمبندوں کی طرح اُڑانا شروع کر دیں۔ بجلی بند تھی، عامر کو غصہ آ گیا۔ وہی مہلک غصہ جس کا شکار اکثر میں ہوتی تھی۔ عامر نے جلتی ہوئی تنگ سا نرسروم تہی اُٹھا کر وارڈن کے سینے میں گھسیٹ دیا مجھے یاد ہے اس کی ایک چھاتی بڑی طرح جل گئی تھی۔ وارڈن نے اُسے عدالت میں گھسیٹنے کی دھمکی دی تھی۔ سوچتی ہوں عامر نے دال حویلی

نہیں تھی۔ پھر وہ کیوں چلی گئی۔ لیکن اس کی بے غرائی تو اس خط سے پتہ چل گئی جو دوسرے دن اس نے وارڈن کے نام کسی نامعلوم جگہ سے بھیجا تھا۔ اُس نے لکھا تھا غصہ میرے ہاتھوں نے آپ کے ساتھ جو کتاخی کر ڈالی ہے۔ وہ چپکے سے نہ بیٹھتی ہے نہ سڑنے دیتی ہے۔ اے لاش میں بٹ لکھ عدالت میں کوئی سزا دلوا کر اس اذیت سے نجات دلادیں۔ میں نے بہت بڑا کر کیا ہے میں بٹ۔ اور یہ زندگی میں پہلی بار مجھے احسا ہوا ہے کہ میں نے واقعی بہت بڑی حرکت کی ہے جو کس طرح بھی قابلِ معافی نہیں۔ میں نے وہ خط میں خان کو دے دیدے میں خان اُس خط کو لئے لئے لڑکھرائی پھر پوچھا اور مجھے لگتا تھا عامر حبیب کا نسخا سا وجود میں خان کی ہر سوجھ اور ہر احساس پتلا کر رہ گیا ہے۔ عامر حبیب کا یہ خط اس سلسلے کی وہ آخری بیڑی تھی جس نے سرخان کی پوری شخصیت کو جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور آج جب بیس سال بعد عامر حبیب کا ہر بات اور ہر لمحہ مجھے یاد آ رہا ہے تو میں وہ بات بھی کیوں نہ لکھ دوں جو صرف عامر اور میرے درمیان ہوتی تھی۔ وہ بات جو آج سے کچھ سال پہلے مجھے بالکل بکواس لگی تھی۔ لیکن جو آج مجھے حیرت زدہ اور دکھی کئے جا رہی ہے جس شام اچانک عامر نے پرنسٹن چھوڑنے کا پرہ گرام بنالیا تھا۔ مجھے اُس دن پہلی بار احساس ہوا تھا کہ عامر کا عامر حبیب سے مجھے کتنی شدید محبت تھی۔ وہ محبت جو بے غرض اور سادگی ہوتی ہے۔ یا خبر نہیں وہ محبت میرا جذباتی پن تھا۔ لیکن مجھے لگتا ہے میرے دل میں عامر کے لئے اب بھی وہ محبت ہے جس نے مجھے اُس کے جانے والے دن خود کشی پر مجبور کر دیا تھا۔ حالانکہ اس کے وجود سے مجھے ہزاروں پریشانیوں اور تکلیفیں تھیں جس دن شام کو سفید گاڑی میں اپنا سامان لیے آئی اور مجھے جاتے ہوئے خدا حافظ کہا تو اُس لمحے

مجھے محسوس ہوا تھا میری روح اچانک میرے اندر سے نکل کر بیس کہیں فرشتہ برگر گئی ہے۔ میں نے اُسے دکھا کر اس کے سامنے نیلی سیاہی کی پوری بھری ہوائی شیشی اپنے حلق میں اُنڈیل لی تھی لیکن عاصم نے یہ سب کچھ دیکھ کر ہلکے سے میرا گل تھپتھپایا اور سکرانی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ اور اس وقت مجھے عاصم سے اتنی شدید نفرت ہو گئی تھی کہ میں نے بیس سال تک ایک لمحے کے لئے بھی اُسے یاد نہیں کیا تھا۔ لیکن آج جب میری بیٹی نے مجھے اگر بتایا ہے کہ میں خاں نے اُن کے کالج کے مٹھی پر پڑا اور کلامِ مہمانِ ہاں رکھ دیا ہے اور ڈھیر اہل کی رپورٹ کو اپنے تاثرات کے ساتھ کتاب کی صورت میں بھیج دیا ہے۔ تو سچی باتوں دراصل عاصم حبیب ہیں کتنی یاد ہے۔ اور آج مجھے بس خاں نے عاصم حبیب پر لکھی ہوئی وہ کتاب بھجوائی ہے۔ کتاب کا صرف آخری باب پڑھوں گی۔ اس سے پہلے کا تو عاصم حبیب کا ایک ایک لمحہ میرے قلم میں ہے۔ میں خاں نے کتاب کے آخری باب میں لکھا ہے۔ عاصم حبیب آج کل لوگوں کی کسی جہاز ساز کمپنی میں مینیجر ہے۔ اور بی بی سی اپنے کسی پمڈ گرام میں عاصم حبیب کی انگریزی نظموں کا ایک سلسلہ ہر روز کسی فرضی نام سے نشر کرتی ہے۔ میں خاں نے مجھے اپنے خط میں لکھا ہے کہ وہ دواہ کی رخصت پڑھ کر دیکھ جا رہی ہے اور اس دواہ کا ہر لمحہ صرف عاصم حبیب کے پاس گزارے گی۔ میں خاں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی ہے لیکن سچی بات عاصم حبیب نے اتنے بڑے دُخ کے سامنے اپنے اس حقیر وجود کو کیسے سنبھال سکوں گی۔ عاصم حبیب اب بھی میرے اندر بڑی ادنیائوں پر کھڑی ہے۔ لیکن میں سے مجھے نفرت ہے۔

سہی، ایل کاوش

اُس بازار سے

میرے ہاتھ میں بندھی ہوئی راکھی کو دیکھ کر حفیظ قندھاری نے کہا: "ٹو پانگل چلا
عورت ماں ہوتی ہے۔ نہ بہن نہ بیٹی۔ اس کا مرد سے صرف ایک ہی رشتہ ہوتا ہے۔
جنس رشتہ، مرد جس جس کا پیکر ہے اس نے اسے پیٹ کی جھوک سے زیادہ جنسی
جھوک پر نشان کرتی ہے۔ ساج کے بندھنوں کی وجہ سے وہ کچھ عورتوں کا لحاظ منورہ
کرتا ہے لیکن جس طرح فاقے کے عالم میں وہ کبھی کبھی روٹی چھین کر یا چڑا کر کھا جاتا ہے
اسی طرح جنسی تشکیں کے لئے رشتوں کی بے حرمانی کر سکتا ہے!"

سید یزدانی جالندھری نے میرے ہاتھ سے مسٹائی کا ڈبہ چھین کر کھولا اور اسے
حفیظ کے سامنے بڑھا کر کہا۔

”وہ مسٹائی کھاؤ۔“

سید یزدانی نے اس گلا حفیظ کے مونہ میں رکھ کر اس کا مونہ بند کر دیا
چاہا۔ حفیظ اسے کھاتے ہوئے میری طرف گھورتا رہا۔

ان دونوں لاہور کی ایک مشہور ایکٹرس میرے راکھی باندھا کرتی تھی۔ میں ہندو وہ مسلمان ہم دونوں ایک دوسرے کو بھائی نہیں مانتے تھے۔ حفیظ اس رشتے کے مخالف تھے۔ سینڈیز ترمذی کو اس بات سے توافق تھا کہ عورت جس ہی سکتی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ ایک ایکٹرس جس ہو سکتی ہے۔

سید بردانی جالندھری کا خیال تھا کہ یہ بحث سراسر فضول ہے۔ سب رشتے بننے اور بھانے کی بات ہے۔ آج کے آدمی کی مشکل یہ ہے کہ وہ کتنا کچھ ہے اور کتنا کچھ ہے اور اصل کسی اور ہی بات پر گر ڈالتا ہے۔ حفیظ قندھاری نے کہا،

”یہ کلیہ عورت اور مرد کے رشتے پر کھرا نہیں اُترتا۔“ اتنا کہہ کر اُس نے عورت کی بیالوجی بیان کر ڈالی۔ اور پھر عورت کی فضیلت کو سمجھاتے ہوئے فرائیڈ کی قبر کو دفن شروع کی۔ اور کام موثر، کا حال دیتے ہوئے رشی دانساؤں کی چٹا کریدنے لگا۔

حفیظ قندھاری زندگی میں ٹھیکہ اور بحث میں نوکیلا تھا۔ بحث میں کسی ہار نہیں اور زندگی میں کبھی جیتا نہیں۔ اُردو زبان وہ لکھنوی انداز میں بولتا تھا چشتو دہائی پشٹانوں کی طرح فارسی ایرانیموں کی مانند اور پنجابی تو اس کی مادری زبان تھی۔ نام تھا عبدالحفیظ کہلاتا تھا حفیظ قندھاری۔

تین مسلمان ایک ہندو، ہم چاروں دوست اکٹھے رہتے تھے۔ لاہور میں چوچی دھواڑے کے باہر گھائی اترتے ہی ہمارا مکان تھا۔ مکان کا کرایہ ہندو بھائی جیانی پھل اور تندر ترمذی دیتے تھے۔ گھائی کے اس طرف منزل ہوٹل تھا۔ وہاں ہم لوگ کھانا کھاتے تھے ہوٹل کا بل حفیظ کے ذمہ تھا اور وہاں میں تو ہندو تھا۔

ان دونوں منزل ہوٹل اور عرب ہوٹل اُردو ادیبوں کے دو ٹھکانے تھے۔ اُردو

سب کا دفتر بھی منزل ہوٹل میں تھا۔ اُردو کے بڑے بڑے استاد شمس العلماء
تاجور نجیب آبادی سر لانا صلاح الدین احمد، احسان دانش، اختر شیرانی پوران میں
حضرت قمر جلال آبادی، عاشور دشت کاغی، ساحر دھیانوی سب وہاں اکٹھے ہوتے۔
اُردو ادب پر بحثیں ہوتیں۔ زندگی کے روز اور شامی کے نکات پر کئے جاتے یا
لوگ تنقید میں استادوں کی ٹوپیاں اچھال دیتے۔ اور کبھی کبھی لونڈوں کے سر پر ٹریاں
باندھ دیتے۔ حفیظ قندھاری ان مجلسوں کے اچھے مانے جاتے تھے۔

حفیظ قندھاری نے زندگی میں ہمیشہ کام کی تلاش کی، مگر کبھی نام یہ نہیں بیٹھا
کے والد قندھار (دخا فغانستان) میں ڈاکٹر تھے جب ہم لوگوں کے مالی حالات خراب
ہوتے تو حفیظ قندھاری چلے جاتے اور اپنے والد سے روپیہ لے آتے۔ اس روپیہ
کے آتے ہی ہم سب دوست ایک ساتھ مال دلوں جاتے تھے۔ گھر میں رنگ و روغن
ہوتا۔ فرنیچر بدلتا۔ یاروں کے سوٹ بدلنے لگتے۔ حفیظ قندھاری منزل ہوٹل کے باہر کسی
کچا کر بیٹھ جاتے اور دھو جانے پہچانے آدمی کو ہوٹل میں کھینچ کر کھانے کی میز پر بٹھا دیتے
عرب ہوٹل سے کباب منگوا لیتے تو گینگ بیری انارکلی سے میسٹری، کیک، یا رولز
خوب سیر ہو کر کھاتے۔ حفیظ کے خلوص کی تعریف کرتے۔ اس کی بحث اور تنقید کا ٹھکانا
لیتے اور ”زندہ باد“ کا نعرہ لگا کر چلے جاتے۔

ایک بار کا ذکر ہے حفیظ قندھاری نئے نئے قندھار سے مال دار ہو کر آئے تھے،
دھڑن چورہی نہیں۔ یا رباشی کے مزے آرہے تھے۔ ایک شام کو ہم رگ منزل ہوٹل
میں اکٹھے ہوئے تو حفیظ قندھاری نہیں تھے۔ کہاں گئے تھے کچھ پتہ نہیں گیا۔ بجے
نک انتظار کیا۔ پھر کھانا کھایا۔ لیکن کھانا بے مزہ رہا۔ حفیظ کی باتوں کی چٹنی دھڑن

پرنہ ہونو کھانا کیسا۔! بس کسی طرح پیٹ بھر لیا اور جا کر سو گئے۔

رات کو دو بجے حفیظ قندھاری نے دودھ مارے پروٹنگ دی۔ میں نے دودھ لڑھکھلا کر وہ جھرمٹے نظر آئے۔

”کہاں تھے تم؟“ میں نے پوچھا۔

”قیامت کی گود میں“ حفیظ نے لڑکھڑاتے قدموں سے وہیلز کے اندر داخل ہو کر کہا۔

”قیامت کی گود میں؟ میں حیران ہوا۔

”یاد تھو میں تو گود ہی تھی۔ لیکن حقیقت میں۔ میرے سامنے یہی تھی؟“

”یہ خراب اسی نے چلائی ہے کیا؟“

”نہیں میں نے چلائی ہے۔“

”قیامت کو؟“

”نہیں، جس کے پاس وہ رہتی ہے اُس کو۔“

”کس کے پاس رہتی ہے؟“

”ہیرا منڈی گتے تھے تم؟“

”ہاں ہیرا منڈی میں ہی رہتی ہے وہ۔“

”لاہور کی طوائف ہے؟“

”نہیں ریاست سوات کے کسی گاؤں کی گورن ہے۔ جبری معصوم بھائی ہے۔“

سوائے خشتو کے دوسری زبان نہیں جانتی۔ لگن نہایت سیکھ لے اور فلم کے پردے پر

آجائے تو سب ہیرا منڈی مات ہو جائیں؟

”تم اسے ایکٹریس بنانا چاہتے ہو؟“

یزدان نے کروٹ بدل کر تیز آواز میں کہا۔

”سوئے بھی دو گے؟“ پھر وہ بیک کراٹھے اور تہی بھجا کر ستر میں گھس گئے۔

حفیظ قندھاری نے چھپساتے ہوئے کہا۔

”لو! کی لانا نامزود ہے۔ خوب صورت جوان۔ ایمان کی نظر پڑ جاتے تو پسینا آ جاتا۔“

جس کے پاس ہے اس کا نام ہے اللہ دیا۔ اس کے مکان پر لوگ آتے ہیں،

بیٹھتے ہیں لیکن صرف شراب پیتے ہیں۔ اور پھر عالی ماتہ چلے جاتے ہیں۔ پیسے میں

ترہیز ہیں نے لقمہ دیا۔

حفیظ نے کہا: اللہ دیا تو یہی کہتا ہے حضور میں خود اس سے نکاح کرنے

والا ہوں۔ ہم کفر ہیں لیکن ہماری بھی عزت ہوتی ہے۔ ہماری بہنیں اور بیٹیاں تو

پہننے پر بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن یہودی میں پردے میں رہتی ہیں۔ ستارے بھی بغیر نہیں

چھو سکتے۔ وہ تو صرف آنکھ پھولی کھیلنے ہیں۔ تمہاری نظر میں انور کو ٹھیراتی ہیں۔

لوگوں کے ماتہ بھی چھو چکے ہوں گے۔“

”ناممکن؟“ حفیظ قندھاری بدک کر پورا بچکان ہو گیا۔

”میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ابھی تک وہ پاک دامن ہے۔ سوات کی کنواں

کلی ہے انور!“

میں نہیں پڑا۔ لاہور سے پشاور تین میل دور ہے۔ پشاور سے سو میل دور

مردان ہے وہاں سے شرمیل آ کے ریاست سوات کا دار الحکومت منگروہ ہے۔

اور اس سے آگے انور کس گاؤں سے آئی ہے اتنے لمبے سفر میں کلی کیا بھول بھی

مرجھا جائے۔۔۔۔۔ مرد کے ہاتھ پکھڑیوں کو فوج کرہوس کی پھونکوں سے ڈرا دیتے ہیں ادویوں بھی بقول تمہارے عورت اور مرد کا رشتہ صرف ایک ہی ہے۔ اس لئے اب سو جاؤ رات گری ہو گئی ہے۔“

حفیظ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے جی جلاوی۔ میں نے لحاف میں منہ چھپا لیا۔ کان بھی لپیٹ لئے حفیظ نے لحاف اتار پھینکا وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نیند لا گئی تھی۔ اور لاکھوں کی مسروری کا احساس بھی غائب ہو چکا تھا۔

دوسرے دن ہم ہیرا منڈی میں تھے۔ ہمارے سامنے سوات ریاست کا دل کش شباب تھا۔ گداز بدلی آئینے نقش نگارے رنگ میں گلاب کی سُرخ گھٹی تھی۔ لو کی کیا تھی اک سر ہا پہلو۔ اس کے لبوں میں ہشامیت اور انداز میں فسائیت تھی۔ ہاں اُردو بولتے تو تذکیر و تائیت کے فرق کو مشاویجی۔ اس پر بھی آدمی کا دل آواز کے آثار چھو پر لہریا لیتا رہتا۔ اٹھ دیا پاس بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ ہم آنکھیں سینک رہے تھے۔ حفیظ نے ایک سو روپے کا نوٹ نکالا اور کہا۔

”فدا ناشتے کا بندوبست کرنا۔“

”اٹھو یا نوٹ لے کر کھلے کوڑے سے باہر نکل گیا۔ دروازے کا پردہ ہٹا رہا گیا۔ میں نے پشتوں پر چھپا۔

”تہ پختہ تھے؟“ (تم پیشانی پر؟)

”آہا“ (ہاں ہی) اور نے جواب دیا۔

”تے سنگھا پختہ تھے؟“ (تم کیسی پیشانی پر؟)

اب اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خرمندی کا دھندلا

پھیل گیا۔ گالوں کی سُرخی غائب ہو گئی۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی سڑے میں کچھ شراب کی خالی بوتلیں، کچھ خالی گلاس اور سگریٹوں سے اٹے ہوئے ایش ٹرے دکھائی دے رہی تھیں۔
 اند کی نظریں ان سب چیزوں پر سے گزرتی گزرتی چہرے پر مار گزرتی گئیں۔ وہ دیر سے ہولی۔

”واہ ماں قسمت دینی؟“ اُردی میری قسمت ہے؟“

حفیظ اند کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

میں نے حفیظ سے کہا۔

”مشرق والوں کی یہ خامیت ہے کہ وہ ہر بُرائی کو قسمت کے ماتھے مندرجہ تھیں۔“

حفیظ نے جواب میں مجھے گھور کر دیکھا مگر بولا نہیں۔ اندر خالی بوتلیں میٹ کر

اند چلی گئی۔ حفیظ کی نظریں بھی اس کے پیچھے بھیجے چلنے لگیں۔ دل تو پہلے ہی تعاقب

کر رہا تھا، روح کا پتہ نہیں۔

میں نے حفیظ کو مخاطب کیا۔

”یہ جتنی خالی بوتلیں اٹھا کر لے گئی ہے اتنے ہی آدمی رات کو اس گھر میں آتے

ہوں گے۔“

”تو متعجب ہے؟“ حفیظ کے جڑے کلن گئے۔

”قونے آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے؟“ میں نے کہا۔

اتنے میں اند دیا حلال کئے ہوئے چار پارچ مرچے اور بہت سا سا مان اٹھا کہ

لے آیا اور اند کو پکار کر کہا: ”ان کو پکا دے؟“ اور پھر وہ آگیشی کے سامنے چلا گیا۔

تاپنے لگا۔ باہر آگن میں دھوپ نہیں تھی۔ آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔

ماحول کھلا گیا تھا۔

”ہیں دکا سے پتے میں انگلیشی دروازے کے آگے رکھ لیا انا کہہ کر حنیف نے انور سے پشتوں میں کچھ کہنا شروع کیا۔

اللہ دیا مہم بھاڑے دیکھنے لگا۔ پھر جھٹکا کر بولا ”ایتھے آ کے سیدھی سی پی بولی ورن گئی کیتا کرو یا بوساحب! اے دغا راؤ ڈا نہیں چلے گی۔ انا کہہ کر اس نے فلور کے نیچے سے کمانی وار چا تو نکالا۔ اور مرغوں کے ٹکڑے کرنے لگا۔ اس کے تیرے ایک ایسے دلال کے سے تھے جسے دو پارٹیوں کے آپس میں مل جانے کا دھڑکا رہتا ہو جس میں اس کی اپنی دلالی ڈوبتی نظر آئے۔

مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے اللہ دیا کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر کہا۔ ”وہ پشتوں میں صرف یہ کہہ رہا ہے کہ آج دنا پٹھانی انداز میں کھانا کھلاؤ۔! اے کابل یاد آرہا ہے رنگورا میں اس نے ایک دعوت کھائی تھی۔ اس کا فائدہ آج تک اس کی زبان نہیں بھولی۔

انور ”آہر جی۔ کہہ کر ڈمپنگ انگلیش پر رکھنے لگی۔ میں پیاز چھیننے لگا۔ بظاہر سب کام میں مصروف تھے۔ سب خاموش تھے۔ لیکن ہر ایک کے دل میں طرح طرح کے سوال سر اٹھا رہے تھے۔

پھر جانے حنیف کو کیا سوچی، اس نے اپنا کیمرا اٹھایا اور دلش گن تیار کرنے لگا۔ اللہ دیا نے دیکھ کر پوچھا ”کیا پھر ٹورگے؟“

”ہاں، ایک اخبار کے لئے انور کا فوٹو لوں گا، اور نیچے لکھوں گا۔“ بے نام فلم کی سپر وٹس۔ ”نیا چہرہ۔“ اودھ کھلی گئی۔ ”پھر پنجاب کی ساری فلم انڈسٹری اس کی تھی

میں ماری ماری پھرے گی۔“

اشد ریائے افسردہ کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر کہا: یہ گانا نہیں جانتی،
ناجنا نہیں جانتی۔ زبان نہیں جانتی یہ کیا ایسی کی تھی میری دُن بنے گی؟
”..... اور ساتھ میں تمہاری بھی؟ میں نے لقمہ دیا۔

اشد دیا پہلے حفیظ کو تکتا رہا۔ پھر انور کو گھورتے لگا۔ اس کے بعد بولا: ہر تو
سکتا ہے لیکن تم اخبار والوں سے ڈر گتا ہے۔ بڑے بگڑی ہوئے ہیں خبر کچھ ہوتی
ہے چھاپتے کچھا دو ہیں؟

میں نے کہا: کچھ ایمان دار بھی ہوتے ہیں میاں؟

”لوہی کے معاملے میں سب بے ایمان ہیں۔ بابو صاحب! اور آپ شاید

بھولتے ہیں۔ یہ میری بیوی ہے۔“

”تو پردے میں بٹھاؤ!“ میں نے تنک کر کہا۔

”ابھی نکاح نہیں کیا ہے۔ پر کچھ رہا ہوں کسال! اور پھر ہے یا نکاح؟ وہیں بیٹھو
بن جائے گی تو اس کی زندگی مسفرہ جائے گی؟“

حفیظ نے دلال کے دل میں لالچ بھردیا تھا۔ اب وہ جبرے کاروبار کے خواب
دیکھنے لگا تھا۔ حفیظ نے انور کو چھوئے بغیر اس کے تین چار فوٹو کیسٹے اور بات
کراگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

ایکٹرس بننے کے بعد اگر تم شادی کرو گے تو تمہاری تصویریں بھی چھپیں
گی، پروڈیوسر پارٹیوں میں بلائیں گے؟

”ایکٹرس شادی کہاں کرتی ہے صاحب! وہ تو ایک قانونی بھڑواہل

لیتی ہے۔ ”اٹھ دیا کے اٹھ کا انسان بول پڑا اور ہم لوگ پھر دے نہیں کچھ نہیں۔ عزت کی روٹی کھاتے ہیں۔ اپنے پیشے کے بار نہیں جھانکتے اب متا ز شانتی کو دیکھ لو، ایکٹرس بن گئی... لیکن...“

حفیظ نے بات کاٹ کر کہا: ”وہ بھی تو ولی سے شادی کرنے والی ہے۔“

میں بولا: ”ولی بھی شاید ابھی اسے پرکھ رہا ہے۔“

اٹھ دیا نے کہا: ”نظامی کی وجہ سے شادی نہیں ہو سکتی۔“

”نہیں یاد رہ آج کل گیتا کو ٹریننگ دے رہا ہے۔ حفیظ راز بتانے لگا۔

”گیتا کی ٹریننگ کے لئے اس نے ڈانسنگ کمپنی کھول رکھی ہے۔ متا ز شانتی کے

نام پر روپیہ بٹور رہا ہے۔ گیتا جب تیار ہو جائے گی اور متا ز شانتی ولی کی بیوی بن

جائے گی۔ تو گیتا کی کسائی نظامی کے بڑھاپے کا سہارا بن جائے گی۔“ پھر حفیظ نے

پہلو بدل کر یہ تجویز رکھی کہ متا ز شانتی کی ڈانسنگ کمپنی میں انور کو شامل کرا سے

دیتے ہیں۔ وہاں تاج بھی سیکھ جائے گی زبان بھی اور ایکٹرس بھی بن جائے گی۔

چیمہ کتنا طے گا؟ ”اٹھ دیا نے پوچھا۔

”تین سو روپے تو متا ز شانتی سے کہہ کر میں دلوادوں گا۔“ حفیظ نے ہڈیا کی۔

”تین سو؟“ اٹھ دیا حفیظ کے سہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے چاقو منہ

کمر کے نیچے میں رکھ لیا۔

میں نے کہا: ”حفیظ کی بات کو متا ز شانتی ٹال سکتی ہے۔ نہ نظامی ٹال

سکتا ہے۔“

”تو معاملہ پکا کر دیجئے۔“

اگلے دن ہم لوگ اللہ دیا کو لے کر متنازعہ شانتی کے یہاں پہنچے، نظامی نے ہمیں سو روپے کے نوٹ لگ کر اللہ دیا کے ہاتھ میں رکھ دیئے، اور کہا: ”ہم لوگ حیدر پشاور جہاز سے ہیں انور، ہمارے ساتھ ہمارے گی۔“

”وہ بے چاری اکیلی کیسے ہمارے گی؟ میں بھی ساتھ چلوں گا؟“ اللہ دیا نے اڑچھٹا ٹولی۔

”ہم پر اعتبار نہیں ہے؟“ نظامی نے پوچھا۔

”اعتبار کی بات نہیں ہے۔ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔“

نظامی نے حفیظ کی طرف دیکھا۔ حفیظ نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ نظامی نے اللہ دیا کی بات مان لی۔ تم میں چلو، لیکن تمہارا کرایہ....؟“

حفیظ نے کہا: ”کیپٹی دے گی۔“

متنازعہ شانتی بولی ”کیپٹی دے گی۔“

معاہدے ہو گیا، میرا سب شروٹ ہو گئی۔ حفیظ قندھاری نے دوسرے دن بینک سے پانچ سو روپے نکلوائے۔ وہ روپے حفیظ نے کہاں خرچ کئے کسی دست کو پتہ نہ چلا۔

شام کو میں نے منزل ہوٹل میں حفیظ سے پوچھا: ”تم بھی پشاور جاؤ گے؟“

”نہیں ابھی نہیں۔“

”میں نے پھر کہا، اللہ دیا کا عشق سچا معلوم ہوتا ہے۔ پشاور تک انور کا کہنا نہیں جانے دیتا۔“

”عشق کس کا سچا ہے یہ بات ابھی تم لوگ نہیں جانی سکتے۔“

”لیکن تم تو عشق کے قائل ہی نہیں، صرن یکس کے قائل ہو؟“
 ”میں اسے سیری بنانا چاہتا ہوں۔ رشتہ وہی ہے لیکن دنیا کی نظروں میں
 ذرا قانونی ہو جاتا ہے۔“

”الٹا دیا بھی وہی بنانا چاہتا ہے۔“ میں نے پوٹ کی حقیقت نے اس بات
 پر دودھ بھری نظروں سے سیری طرف دیکھا۔
 مستاز شہتی کی ڈانگ پارٹی تو رہ چکی تھی۔ اند حقیقت قندھاری آپس بھرتے
 رہ گئے۔

عید سے دو دن پہلے انور نے حقیقت کے نام خط بھیجا۔ پشتو میں گل ایک جگہ
 لکھا تھا: اختر رافیلے تے رائے۔ (عید آگئی۔ تم نہ آئے)
 خط ملنے ہی حقیقت پشاور روانہ ہو گیا۔

ہم لوگوں نے سمجھ لیا کہ اب حقیقت پشاور واپس نہیں آئے گا۔ وہ انور کو لے کر
 قندھار یا کہیں دُور مچاگ جائے گا۔ مچھاہار لوگ ابھی تباہ آورائیاں ہی کر رہے تھے
 کہ ایک دن صبح کی اذان کے ساتھ ہی ہمارے دروازے پر اُٹھ دیا نے آکر بانگ دو
 وہ آکھٹا تھا۔ اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ قربانی دے کر نر خرو
 ہو کر آیا ہو۔

میں نے اسے چائے پیش کی۔ تربذی نے ٹوٹا۔
 ”انور کب آرہی ہے؟“

یزدانی نے پوچھا: حقیقت کہاں ہے؟

اُٹھ دیا نے کسی بات کا جواب نہ دیا۔ چائے کی چپکی لے کر بولا:

یاد صاحب آزاد قضا کا پہنچی شہر میں آکر اڑان بھولی گیا تھا۔ آپ جاننے میں
 بہرہ تو بہن میں ہی چوڑی بھرتی ہے پھرے میں کتنے دن جے گی۔ میں نے اسے آزاد
 کر دیا۔ قندھاری صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا۔ جسے پیار کرے اسے قید کریں
 رکھے۔ اہل میں تمہارے عشق میں خود غرضی کا زہر ملا ہے۔ ”یاد صاحب! حفیظ صاحب
 کھرے آدمی ہیں انہوں نے میرے اندر جو آدمی سو رہا تھا اس کو جگا دیا میں سوچ
 میں پڑ گیا۔ شریف لوگوں کے لئے بیٹی کو وداع کرنا آسان کام ہے۔ لیکن میں نے
 اپنی بیوی وداع کر دی حفیظ صاحب سے کہا: ”آپ تو اس علاقے کی زبان جانتے
 ہیں جہاں کا یہ پنہاں ہے۔ اسی علاقے میں جا کر چھوڑ آئیے“ وہ مان گئے اور میں لوٹ
 آیا۔ ”اتنا کہہ کر اس نے حفیظ قندھاری کا خط دیا اور سلام کر کے چلا گیا۔
 خط میں لکھا تھا: ”میں مردان جبار ہوں۔ سوات سے لوٹ کر آ گیا تو خط
 کھوں گا۔ ورنہ خدا حافظ“

”اٹھ دیا کے جانے کے بعد ہم لوگ خوب بنے حفیظ نے اٹھ دیا کی بنگ کاٹ
 ڈالی تھی۔ اب اس کا ہی چاہیے تو سوات جائے، قندھار جائے یا پشاور کے کسی
 ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔ حفیظ کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔
 چار دن کے بعد حفیظ بھی لوٹ آیا۔ اسے دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔
 ”تم تو سوات گئے تھے“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں مردان سے لوٹ آیا“

”انہد کہاں ہے؟“

”منزل ہوٹل میں“

”یہاں کیوں نہیں لائے اسے؟“

”اٹھ دیا کو خبر ہوگئی تو ڈرامہ ہو جائے گا؟“

”اب ارادہ کیا ہے؟“

”ارادہ وہی ہے نکاح کدں گا؟“

”اتنے دن مردان میں نکاح کے بغیر کیا کرتے رہے؟“

”انہ تو پانچوں وقت نماز پڑھتی رہی، وظیفہ کرتی رہی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔“

وظیفے کے بعد وہ اٹھ دیا مانگتی کہ خدا مجھے سکون دے اس ایک نیک انسان کی۔“

”اور تم پہنچ نیک آدمی بن گئے۔“

”نہیں میں تو جیسا تھا ویسا ہی ہوں، میں نے انہ سے کہا چلو تمہیں گاؤں

چھوڑ آؤں۔ وہ نہیں مانی، اس نے کہا میرے قبیلے کے لوگ کسی دھوکے میں نہیں

قتل کروالیں گے۔ مجھے زندہ چھوڑنے والے نہیں۔ میں تو اسی لئے جا رہی ہوں کہ

اب اس زندگی کو ختم کر دینا چاہئے۔ نکاح کے لئے وہ راضی نہیں ہوتی تھی۔ کہتی

تھی تم میرے لائق نہیں ہو۔ اور پھر ہنس دیتی۔ آخر میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکا۔

ساتھ لے آیا۔“

تھوڑی دیر بعد ہم سب منزل ہوٹل پہنچ گئے۔ انہ وہاں موجود تھی۔ اتنے

میں نہ جانے اٹھ دیا کو بھی کیسے معلوم ہو گیا۔ وہ سیدھا منزل ہوٹل آدھنکا۔ اور

آتے ہی بولا۔ سلام بابو صاحب! میں جانتا تھا ایک بار گھوڑے سے بھاگتا ہوں

دوبارہ گھوڑے میں نہیں جاتا۔ اس نے تمہارے سپرد کر دیا تھا۔ اب مال میرا ہے۔

میں لئے جاتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر اس نے انور سے کہا: ”چلو گھر چلیں۔“

انور بولی: ”میں نہیں جاؤں گی۔“

”میں تیری ناک کاٹ ڈالوں گا۔“ دلال نے آخری دھمکی دی۔ اور ہاتھ پکڑنے

کے لئے آگے بڑھا۔ انور نے ہاتھ جھٹک دیا۔

”پریدا“ (دفعہ) اس نے پشتوں میں ڈانٹا۔

”سرام زادی؟“ اللہ دیا غصے میں آنکھیں نکال کر آگے بڑھا۔ حفیظ نے

اسے روکا۔ یزدانی نے ٹوکا۔ ترمذی اور میں کھڑے ہو گئے۔ اللہ دیا ٹھنڈا چڑ گیا۔

اس نے یزدانی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”مختصر میں کتنا متفان۔ اخبار رولے خبر کچھ مہوتی ہے۔ چھاپتے کچھ اوٹیں۔

لیکن ہم بھی کنجری ہیں۔“

اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ یزدانی نے حفیظ سے پوچھا۔

”یہ کیا کرے گا؟“

”کیا کرے گا؟ کر ہی کیا سکتا ہے؟“

ترمذی نے جواب دیا۔ ”ہیرا منڈی کے غنڈوں کو لا سکتا ہے۔“

”ہم پولیس کو بلا سکتے ہیں۔“ حفیظ نے فوراً کہا۔

یزدانی بولا پہلے اس لڑکی کو یہاں سے کہیں اور بھجوا دینا چاہئے۔“

حفیظ نے میری طرف دیکھا: تمہاری ایکٹرس ہیں کے گھر؟“

”وہ تو باہر گئی ہے۔ لاہور میں نہیں ہے۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

حفیظ نے فون اٹھایا اور میلو کے بعد حفیظ فارسی بولنے لگا تھڑی۔

بعد ”بے صاحب!“ کہہ کر حفیظ نے فون رکھ دیا اسانہ کو برقع پہنا کر تانگو میں بٹھا کر چلا گیا۔ میں نے پوچھا ”کس لئے جائے گا اسے؟“ ترمذی نے جواب دیا ”آقا نذر احمد کے گھر“

یزدانی بولا ”وہ سفیرِ افغانستای کا خاص آدمی ہے!“
 ”خاص آدمی کیا نائب سفیرِ مقیم لاہور کہو؟“ ترمذی نے اس کا تعارف کرایا۔
 میں نے کہا ”یہ کہانی تو سوشل سے ایک دم سیاسی ہوتی جا رہی ہے“
 ”ہو جانے دو۔۔۔ حفیظ چوکھا آدمی ہے۔ وہ نمٹ لے گا۔“

اسی شام کو منزل ہوٹل کے سامنے تین چار تانگے آکر ٹک گئے۔ میری مٹی کے بد معاش، غنڈے اور پہلوان اتر کر زندنا تے ہوئے ہوٹل کے اندر گھس گئے۔
 ہوٹل کے مالک ظفر زبیری اور امیر پہلوان کالڑ کا فضل الہی حفیظ کے ساتھ بیٹھے ٹپ لڑا رہے تھے۔

آتے ہی ایک غنڈے نے حفیظ کو گھسیٹ لیا۔ حفیظ دھماکے سے آواز دھمک کر فرش پر اُگرا۔ اشدو یا چلا یا! کہاں ہے انور؟

”حفیظ اٹھ کر کھڑا ہوا اور تانویں بولا ”تم انور کے کیا لگتے ہو؟“
 ایک پہلوان نے آگے بڑھ کر کہا ”جانی بچا نا چاہتے ہو تو انور کو ہمارے حوالے کرو“
 فضل الہی پہلوان پہلے تو بکا بکا دیکھتے رہے پھر یکایک بھرک اٹھے۔ اور
 سب سے مضبوط پہلوان کے ایک سگٹا مارا۔ وہ ٹکا بازی کہا کر مین پر آکر اپنے فضل الہی
 نے میز اٹھائی تو وہ جیت زمیں پر جا پڑا۔ باقی پہلوان کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔
 فضل الہی نے سب کو گھور کر کہا ”کس کو چاہئے انور؟“

حفیظ قندھاری نے اللہ دیا کو دکھا کر کہا: یہ ہے وہ بھڑوا۔ اللہ دیا۔
اس کو چاہتے انور۔“

فضل الہی کو سب جانتے تھے۔ اس کے باپ امیر پہلوان کے اکھاڑے کی
مشق بھانک کر یہ سب جوان ہوئے تھے اور پہلوان بنے تھے۔ وہ سب اللہ دیا کی
طرف دیکھنے لگے۔

اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ عاشق نام کے ایک پہلوان نے کہا:
”پاؤ جی۔ (بھائی صاحب) ہمیں کیا معلوم تھا کہ آپ کے پاس ہے ہم
کبھی آتے ہی نہیں۔“

ایک کچھ پہلوان بولا۔ ہم اس کا فیصلہ استام امیر پہلوان کے سامنے کریں
گئے۔ اتنا کہہ کر وہ سب کو لے کر چلا گیا۔

ان کے جانے کے بعد فضل الہی کو خطرے کا احساس ہونے لگا۔
اس نے حفیظ سے کہا۔ یارا تاجاں تو مار ڈالیں گے۔ وہ ہمیشہ پھری کرے
باندھے رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ اب میری کمزور چلے گی۔“

حفیظ قندھاری نے کہا: گھبراؤ نہیں، میں پہلوان صاحب سے خود بات
کر لوں گا۔

دوسرے دن امیر پہلوان کے حجرے میں بیٹھ کر حفیظ نے اللہ دیا کے سامنے
کہا: چاچا جی! یہ معاملہ بڑا سیریس ہے۔ انور غیر علاقے کی لڑکی ہے۔ یہ اس کو
اڑا کر لے آیا ہے اب حکومت افغانستان نے انگریزی سرکار سے پوچھا ہے کہ یہ
لڑکی لاہور میں کیسے پہنچ گئی۔ اور اس وقت افغانستان کے بغیر کے قبضے میں ہے۔

اللہ دیا نے کہا: اس کا باپ خود نکاح پڑھا کر اسے میرے پاس بھیج دیا گیا ہے۔

وہ میری بیوی ہے۔“

امیر پہلوان سیدھے سارے جہدگ آدمی تھے۔ یہ سب گو رکھ دھندھا جس کر
انہیں میں پڑ گئے۔ نکاح، حکومت افغانستان، انگریزی سرکار، فضل اللہی نے جنینہ کی
حمایت کی تو وہ بولے: میان میرا لڑکا تمہاری حمایت کر رہا ہے۔ اس لئے میں تو
اس کا فیصلہ کروں گا نہیں کسی اندک بچے بنا دیتا ہوں اور آقا نور احمد چچا آدمی
ہے۔ اس کو بھی ملا لیتا ہوں۔ اس بدلے کو سیاسی کہیں بنا رہے ہو۔ اگر وہ اللہ دیا
کی بیوی ہے اور اس کے پاس رہنا چاہتی ہے تو کوئی حکومت اسے روک نہیں
سکتی۔ اور اگر نہیں رہنا چاہتی تو کوئی قانون رکھ نہیں سکتا۔“

یزدانی صاحب نے کہا: مولانا سلطان محمود کے پاس مسئلے کو بھیج دیجئے؟
سب نے کہا: ہاں وہ نیک آدمی ہیں اور بے لوث ہیں۔ دوسرے دن آقا نور
گلے میں مستول لشکری حفیظ قندھاری کے ساتھ انور کو لے کر مولانا سلطان محمود
کے مکان پر آ پہنچے۔ ایک طرف کھڑے بیٹھے۔ اللہ دیا ان کے آگے تھا ہم دوسری طرف
بیٹھے۔ حفیظ قندھاری ہمارے سامنے تھا۔ بیچ میں انور بیٹھ گئی۔ مولانا نے پوچھا۔
”لڑکی تیرا نام کیا ہے؟“

”انور۔!“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ انہوں نے اللہ دیا سے سوال کیا۔

”جی، اللہ دیا۔“

”کام کیا کرتے ہو؟“ مولانا نے پوچھا۔

”کام۔؟ جی ہم جھاٹ ہوتے ہیں“ اللہ ربانے جواب دیا۔
 ”میں نے پوچھا ہے کام کیا کرتے ہو؟“ آواز میں قدرے کڑھکی تھی۔ اللہ دیا
 نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”جی پہلے میری بہنیں مجھ کو کئی نفیس‘ اب تو حج کرائی ہیں“
 ”سنا تھا چچا گید مولانا نے پہلو بدل کر بیٹھتے ہوئے کہا“ تو کیا چاہتا ہے؟“
 اللہ دیا بولا“ یہ میری بیوی ہے‘ مجھے ملنی چاہئے“
 ”کیوں بی بی یہ تیرا خاوند ہے؟“ مولانا نے انور سے پوچھا۔
 انور نے جسے زور سے انکار میں سر ہلا کر کہا“ یہ جھوٹ بھتی‘ ہمارا شادی نہیں ہو
 پھر سنا چچا گیا۔ حقیقت نے خوش ہو کھینچی طرف دیکھا۔
 مولانا نے پھر پوچھا“ تو اللہ دیا کے پاس رہنا چاہتی ہے؟“
 انور نے پھر سر ہلا کر کہا“ ہم نہیں رہتا“
 مولانا تنقوڑی دی رہا سب چہروں کو دیکھتے رہے۔ پھر بولے“ اچھا تو کس کے
 پاس رہنا چاہتی ہے؟“

انور نے جھٹ جواب دیا“ حقیقت کے پاس“
 ”حقیقت کون؟“ مولانا نے آفا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
 ”تندھاری نے مسکرا کر کہا“ جی میرا نام حقیقت ہے“
 مولانا نے حقیقت سے پوچھا“ یہ تیری کون ہے۔؟“
 حقیقت“ جی یہ میری.... جی میری....“ کہہ کر لا جواب سا ہو گیا۔ اللہ دیا
 ہنس پڑا۔ حقیقت نے انور کی طرف دیکھا۔

مولانا نے کہا: بھئی میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ یہ تیرے پاس کس رشتے سے رہنا چاہیے؟
حفیظ رشتہ کیا بتاتا۔ وہ آج تک تو ایک ہی رشتے کا قائل تھا۔

مولانا نے انور کو مخاطب کر کے کہا: یہ تیرا کوئی لگتا ہے؟

انور نے ایک سانس لیا، پہلو بدلا، اور بولی: یہ حفیظ میرا بھائی لگتا ہے۔

”بھائی!“ میں یزدانی اور ترندی چمک اُٹھے۔

”آہوجی۔۔۔ وازماں دور سے“

مولانا نے کہا: یہ کیا بولتی ہے؟

میں نے پشتو کا ترجمہ کر کے کہا: کتنی ہے۔ ہاں جی! یہ میرا بھائی ہے؟

مولانا نے کہا: تو تو اپنے بھائی کے ساتھ جاسکتی ہے۔ اس کے پاس رہ سکتی

ہے۔ کوئی قانون تجھے نہیں روک سکتا۔ بہن بھائی سے زیادہ پاک مقدس رشتہ کوئی نہیں ہے۔

حفیظ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے انور کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا: رازا کو رتالا ڈھو،

خود سے (مراؤ نہیں گھر چلیں) اور وہ دونوں باہر اندھیری گلی میں نکل گئے۔

حفیظ قندھاری کہاں گیا؟ انور کہاں ہے؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔ آٹھ دن تک

ہم لوگ سوچتے رہے کہ حفیظ قندھاری صرف ایک رشتے کو ماننے والا آدمی نہیں کہہ کر

مقدمہ جیت کر اور لڑکی لے کر چلا گیا۔ ترندی نے کہا: حفیظ پڑھا لکھا آدمی ہے اور

انگریزی کی اس کمات کو خوب جانتا ہے۔ ”جنگ اور محبت میں سب کچھ جانتا ہے۔“

یزدانی کہتے: ”لیکن وہ ہندوستانی ہے مسلمان ہے۔“ قول نبھانا جانتا ہے۔

اور میں بالکل ہی الجھن میں پڑ گیا۔ حفیظ قندھاری کے کردار سے ایک طرح کی نفرت ہوئی۔

ایک دن صبح موئندہ اندھیرے گھر کے نیچے ایک ٹرک آکر رکا۔ حفیظ قندھاری

ایک بُدبخت پوش لڑکی کے ساتھ اور پرکاش لڑکی اندر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تنہا ہی نے کہا نیچے لڑکی میں سامان دیکھا ہے میرے ساتھ چلو، سامان اُتار کر اوپر لائیں؟

”سامان کیسا؟“

”جینز ہے“ حنیف نے کہا۔

”جینز؟“

”کہاں سے لائے؟“

”بازار سے خرید کر لایا ہوں۔ آج شام کو نکاح ہے۔ چار بجے برات آئے گی منزل ہوٹل میں دعوت کا انتظام کر دیا ہے“

برات آئے گی کہ جائے گی؟ میں نے سوال کیا۔

حنیف نے کہا: ”آئے گی ہمارے گھر اور میری بہن کی شادی ہوگی اس گھر میں“

”متنہادی بہن؟“ میں نے پوچھا۔

”انور۔ میری بہن“ حنیف نے سنجیدگی سے کہا۔

یزدانی نے میری طرف دیکھا۔ میں فروزش پر سر کچا کر بیٹھ گیا۔

”خود ہی نے کہا؟ لڑکا کون ہے میاں؟“

”ابراہیم پہلوان“

”وہ جو ریلوے میں نوکر ہے؟ فضل الہی کا منہ نہ ہولا بھائی خوب صورت جوان؟ وہی“

جواہر میر پہلوان کے گھر میں ہی رہتا ہے؟

”ہاں۔“ آتا کہہ کر حنیف نیچے چلا گیا، اور جینز کا سامان اُتارنے لگا۔

”شع“ دہلی